فہرست

عنوانات	صفحہ

صفحہ	عنوانات
77	☆ 7۔تدوینِ حدیث پر عدمِ اعتماد:
79	☆ حافظہ اور کتابت کا تقابل:
83	☆ منکرینِ حدیث اور علماءِ حق کی توہین
84	☆ ناقدینِ حدیث کے بنیادی گروہ
86	☆ انکارِ حدیث کے نقصانات
86	☆ 1۔دنیا پرستی:
87	☆ 2۔دین بیزاری:
88	☆ 3۔لادینیت:
89	☆ 4۔تقلیدِ استشراق:
89	☆ 5۔دنیا کی رسوائی:
90	☆ 6۔انکارِ حدیث سے انکارِ قرآن تک:
91	☆ منکرینِ حدیث سے سوالات
91	☆ سوال نمبر1:
91	☆ سوال نمبر2:
91	☆ سوال نمبر3:
92	☆ سوال نمبر4:
93	☆ سوال نمبر5:
93	☆ سوال نمبر6:
94	☆ سوال نمبر7:
95	☆ سوال نمبر8:
96	☆ سوال نمبر9:

عنوانات	صفحہ

فتنۂ انکارِ حدیث

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات صفحہ

بابِ دوم: ''فہمِ قرآنی اور نورِ نبوت'' (تشریحاتِ قرآنی، حدیث کی اصلاح، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی اہمیت)

بابِ سوم: ''تدوینِ حدیث''

بابِ چہارم: ''حدیثوں کی کتابت اور ان کی اشاعت'' (عہدِ رسالت میں، عہدِ صحابہ میں)

بابِ پنجم: ''راویانِ حدیث کے حالات'' (اسماء الرجال کے ذریعے احادیث کا تحفظ، دیگر طریقۂ کار اور احتیاطیں)

عنوانات	صفحہ

عنوانات صفحہ

عنوانات	صفحہ

❖❖❖❖❖

پیشِ لفظ

برِصغیر میں ''انکارِ حدیث کا فتنہ'' چند صدیوں سے زوروں پر ہے، اس کی بعض صورتیں ایسے صریح انکارِ حدیث پر مبنی ہیں جس کو تسلیم کرنے والے کا مسلمان رہنا بھی ایک سوالیہ نشان ہے، جبکہ استخفافِ حدیث (حدیث کو بالکل اہمیت نہ دینا) بھی اکثر وبیشتر پایا جاتا ہے۔

انکارحدیث کا مرض بھی مختلف ہے اور اس کی علامات بھی مختلف صورتوں میں سامنے آتی ہیں، اس فتنہ کے بنیادی اسباب میں دین سے لاعلمی، غیر مسلم تہذیب سے مرعوبیت اور سیاسی وفکری محکومی، سرِ فہرست ہیں۔

یہ پڑھے لکھے تجدّد پسند حضرات کا فتنہ ہے، جو علومِ اسلامیہ کی قدر سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے، نہ تو اسلام اور اس کے اوامر ونواہی (احکامات) سے جذباتی عقیدت رکھتے ہیں، نہ ہی ان کا ایمانی جذبہ کوئی قابلِ رشک جذبہ ہوتا ہے۔

اس موضوع کی حسّاسیت کی بنا پر ''تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان'' نے ضروری سمجھا کہ ''فتنۂ انکارِ حدیث'' پر مولانا ایوب دہلوی علیہ الرحمۃ کی کتاب کو نصاب میں شامل کیا جائے، جو اس موضوع پر عمدہ تصنیف ہے، مگر بعض احباب کے مشورے سے ہم نے اس کتاب کے ساتھ ایک مزید کتاب ''انوارِ حدیث'' (جو کہ سید محمد ہاشم فاضل شمسی علیہ الرحمہ کی تصنیف ہے) کو شامل کیا، جو اپنے اہم مضامین وآسان طرز کی بناء پر نمایاں حیثیت رکھتی ہے، ساتھ ہی ایک تعارفی مقدمہ، فتنۂ انکارِ حدیث کی تاریخ، حجیتِ حدیث، انکارِ حدیث کے درجات وحکم، انکارِ حدیث کے ذرائع اور اسباب، انکارِ حدیث کے نقصانات اور برِصغیر میں تاریخِ انکارِ حدیث، منکرینِ حدیث کا تعارف، منکرینِ حدیث سے چبھتے ہوئے سوالات کو بھی شامل کیا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے، ہم سب کو سیدھی راہ کی ہدایت عطا فرمائے۔ آمین!

انتساب

میں اس کاوش کو تمام محدثین کی طرف منسوب کرتا ہوں، جو کہ حدیث کے مقام سے واقف تھے اور انہوں نے حدیث کی حفاظت کے لئے ایسی جدوجہد کی جو عام بشری طاقت سے بالاتر ہے۔

❖❖❖❖❖

اظہارِ تشکر

حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ، جو انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا، اس لئے میں تہہ دل سے مشائخ، اساتذہ، والدین، تایا، اور اہل خانہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ جن کی بدولت میں آج اس قابل ہوا۔

خصوصاً ان احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتاب لکھنے کی ابتدا سے انتہا تک، پھر اس کو منظرِ عام تک پہنچانے میں میری مدد کی، خصوصاً مولانا محمد انس رضا قادری کہ جنہوں نے کتاب لکھنے کا مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ علمی مواد کی معاونت بھی کی، اور مفتی نذیر احمد نقشبندی کہ جنہوں نے کتاب کے آخر میں ''انوارِ حدیث'' کو شامل کرنے کا مشورہ دیا۔

علامہ ڈاکٹر عمران شامی صاحب و دار العلوم میمن کی انتظامیہ کا بھی میں بے حد مشکور ہوں کہ میمن اسلامک ریسرچ سینٹر کے زیرِ اہتمام اس کتاب کی ٹائپنگ، تصحیح اور ترتیب ہوئی۔ آخر میں مفتی احسن اویسی صاحب کا شکریہ کہ جنہوں نے مکتبہ ''فرید بک سٹال'' سے کتاب چھاپنے کے لئے معاونت کی۔

اللہ تعالیٰ میری اور تمام احباب کی کاوش کو قبول فرمائے۔

امین بجاہ النبی الامین فللہ الحمد أولًا وآخرًا

❖❖❖❖❖

مقدمہ

مغرب کی فکری، سیاسی، عسکری، اقتصادی بالا دستی ہی ''فتنۂ انکارِ حدیث'' کا بنیادی محرک رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہزار سال اسلامی حکومت رہنے کے باوجود انکارِ حدیث کی ابتدا، اُس دور میں ہوئی، جو مغرب کی غلامی کا دور ہے۔

انکارِ حدیث دیگر فروعی مسائل کی طرح ایک معمولی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اساسیاتِ دین (دین کی بنیادوں) سے متعلق ہے، انکارِ حدیث کے جراثیم اگر کسی میں پختہ ہوجائیں یا وہ استخفافِ حدیث کا ارتکاب شروع کردے تو اس سے منصبِ رسالت پر حرف آتا ہے، جبکہ رسالت پر غیر مشروط ایمان، اسلام کا بنیادی وضروری تقاضا ہے۔

ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور حدیث پر کمزور ایمان رکھنے والے مسلمان کے عقائد و نظریات اور طرزِ زندگی میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔

حدیثِ نبوی کا انکار اکثر ایسے لوگ بھی کرتے ہیں جو صرف نام کے مسلمان ہوتے ہیں، عملاً اسلام کے کسی شعار سے یا کسی دینی فریضہ کی ادائیگی سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی، گویا آسان انداز میں ''نفس پرستی'' ان کی طبیعتوں میں جڑ پکڑ چکی ہوتی ہے، اس اعتبار سے انکارِ حدیث ''بدعملی'' کی راہ ہموار کرتا ہے۔

مقامِ افسوس ہے کہ انکارِ حدیث کے یہ زہریلے اثرات ہمارے جدید تعلیمی نظام کے پڑھے لکھے، اکثر لوگوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور وہ اپنی معمول کی گفتگو میں اس کا اظہار کسی نہ کسی طرح کرتے رہتے ہیں، مزید مقامِ حیرت یہ ہے کہ مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے بھی اب اس کے جراثیم سے محفوظ نہیں ہیں، بنیادی وجہ کم علمی کو ''علمیت'' سمجھنا ہے۔

❖❖❖❖❖

فتنۂ انکارِ حدیث کی تاریخ

پہلی صدی ہجری تک قرآن مجید کے ساتھ ساتھ احادیثِ نبوی ﷺ کو متفقہ طور پر حجتِ شرعی تسلیم کیا جاتا رہا، انکارِ حدیث کے فتنہ کا آغاز سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں ہوا۔

خوارج:

انکارِ حدیث کے فتنہ کی بنیاد سب سے پہلے خوارج نے رکھی؛ کیونکہ ان کے عقائد کی بنیاد ہی اس پر تھی کہ جو بات قرآن سے ملے گی، اسے اختیار کریں گے، ورنہ اختیار نہیں کریں گے۔

چنانچہ اسی انکارِ حدیث کا نتیجہ تھا کہ خارجیوں نے ''رجم کے شرعی حد'' (رجم، شادی شدہ انسان کے زنا کرنے پر دی جانے والے ایک شرعی سزا ہے جو کہ قرآن وسنت سے ثابت ہے) ہونے سے انکار ہی اس بنا پر کیا کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر نہیں ہے اور احادیث کو خوارج مانتے نہیں تھے، (آج جاوید غامدی اور اس کے جیسے دیگر نام نہاد مفکرین بھی رجم کا انکار کرتے ہیں) بعض علماء نے خوارج کی تکفیر ہی اس رجم کے انکار کی وجہ سے کی ہے؛ کیونکہ یہ اجماع سے ثابت ہے۔

خوارج کی طرف سے انکارِ حدیث کی وجہ ان کے انتہا پسندانہ نظریات تھے، جو سنتِ رسول ﷺ کی موجودگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتے تھے۔

معتزلہ:

پھر معتزلہ نے یونانی فلسفوں سے متاثر ہو کر عقل کو فیصلہ کن حیثیت دی اور اسلام کے احکامات کو عقلی تقاضوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی مگر اس راستے میں رسولِ اکرم ﷺ کی سنت حائل تھی، چنانچہ انہوں نے حدیث کی حجیت سے انکار کر دیا۔

لیکن ان دونوں فتنوں نے حدیث کا مطلقاً انکار نہیں کیا، بلکہ قبولِ حدیث کے لیے چند کڑی شرائط عائد کردیں، یوں ضمناً کئی احادیث کا انکار ہوگیا۔

استشراقی یلغار:

دوسری صدی ہجری کے بعد صدیوں تک اسلامی دنیا میں کہیں بھی انکارِ حدیث کی کوئی تحریک نہیں اُٹھی اور یہ فتنہ مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ تیرہویں صدی ہجری (اُنیسویں صدی عیسوی) میں انکارِ حدیث کا فتنہ دوبارہ اُٹھا، جو درحقیقت، مستشرقین کی جانب سے اسلام کی جڑوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر اچھالے جانے والے اعتراضات کی ترجمانی تھی۔

احادیث کا انکار کرکے اسلام کی ازسرِ نو تجدید کا خواب تھا، ایسا نیا اسلام جو عین مغربی نظریات کے مطابق ہو۔

اس وقت اس فتنہ نے عرب وعجم دونوں کو اپنی لپیٹ میں لیا اور مصر اور برِصغیر کو اپنا مرکز بنایا اور دو بندے اس کے ابتدائی محرک بنے، شیخ محمد عبدہ مصری (مصر) اور سرسید احمد خان (برصغیر)۔

انکارِ حدیث میں مستشرقین کی ہی اصل کوششیں شامل ہیں اور اکثر منکرینِ حدیث انہی کے افکار کے خوشہ چین (فیض حاصل کرنے والے) ہیں۔

❖❖❖❖❖

برِصغیر میں تاریخِ انکارِ حدیث

برِصغیر کے مسلمانوں پر مغربی اقوام کے سیاسی ونظریاتی تسلط کے بعد مسلمانوں کا ایک ''ایسا طبقہ'' وجود میں آیا جو مغربی افکار سے بے حد مرعوب (متأثر) تھا، وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں ترقی، مغرب کی تقلید سے ہی حاصل ہوسکتی ہے، لیکن اسلام کے بہت سے احکام اس کے راستہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، اس لئے اس طبقے نے اسلام میں تحریف کا سلسلہ شروع کیا تا کہ اسے مغربی افکار کے مطابق بنایا جاسکے۔

اسلام میں یہ تحریف اور نئے اسلام کی ترویج، قرآن میں معنوی تحریف اور حدیث کا انکار کیے بغیر ممکن نہیں تھی، چنانچہ قرآن کی متجدّدانہ تعبیر کی ابتداء عالم عرب میں ''محمد عبدہ'' نے کی، برِصغیر میں سرسید احمد خان نے، اور اب تو دینی روایت سے جڑے ہوئے مدارس کے نئے فارغ التحصیل میں سے اکثر، اس جدّت پسندی کے فتنے میں مبتلا ہیں (دانستہ یا نادانستہ)، ہر مغربی نظریے کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنا ہی ان کے شب وروز کی علمی جستجو اور دینی کام بن چکا ہے۔

سرسید احمد خان:

تیرہویں صدی ہجری میں ''انکارِ حدیث کی سرداری'' کا تاج، انگریز سے ''سر'' کا خطاب پانے والے جناب سرسید احمد خان نے پہنا۔

سن 1817ء میں پیدائش اور سن 1898ء میں وفات ہوئی، مغرب میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اس لئے مغربی افکار ونظریات سے شدید متأثر تھے اور مسلمانوں کی بھلائی اسی میں سمجھتے تھے کہ وہ مغربی علوم سے آراستہ ہوں اور اس تہذیب کو مکمل اختیار کرلیں۔

سرسید، اہلِ مغرب اور مستشرقین کے اہداف کی تکمیل میں ''محمد عبدہ'' سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے قرآنی بیانات کو جدید مغربی تصورات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے برسوں کے متفق علیہ تفسیری اصولوں کو بالکل نظر انداز کردیا، اپنے نئے اصول گھڑے،

ان کا نقطۂ نظر خالص مادی Materialistic ہے، اس قدر غلو ہے کہ، عربی زبان ولغت کے مسلّمہ اصول وقواعد اور اجماع وتواتر کے خلاف بڑی ڈھٹائی سے قلم کا خنجر، مقدّس وحی پر چلاتے ہیں، اپنی تفسیر القرآن میں روایت سے بغاوت کی انتہاؤں کو پہنچے ہوئے ہیں۔

سر سید کے نظریے کے مطابق اسلام کا حقیقی مصداق صرف قرآن مجید ہے، تمام مجموعۂ احادیث میں سے کوئی حدیث مثلِ قرآن (قطعی الثبوت) نہیں، چنانچہ قابلِ قبول نہیں، سر سیّد کی سوانح پر لکھی جانے والی کتاب حیاتِ جاوید میں درج ہے:

> ''چنانچہ سر سید نے اسلام کے متوارث ذوق اور نہج سے اتر کر، خود قرآن پر غور کیا اور اسلام کے نام پر، ایک ''فرنگیانہ اسلام'' کی عمارت تیار کرنا شروع کی، جس میں نہ ملائکہ کے وجود کی گنجائش ہے، نہ ہی جنت ودوزخ کا کہیں نشان ہے اور نہ جنات اور ابلیس کے وجود کا اعتراف ہے اور معجزات وکرامات تو ان کے نزدیک مجنونانہ باتیں ہیں۔''(1)

مثلاً: حج کے موقع پر کھانے پینے کی ضرورت سے زیادہ قربانی آپ کے خیال میں ایک لغو فعل تھا، سید صاحب تعددِ ازدواج کے بھی قائل نہ تھے، وہ قرآن کریم میں کسی طرح کے نسخ کے بھی قائل نہ تھے، وہ بینکوں کے سود اور تجارتی سود کو جائز قرار دیتے تھے، نیز وہ وصیت کے لئے کسی شرط کے بھی قائل نہ تھے۔ (آج کے متجددمفتیان بھی اسی روش پر چل پڑے ہیں اور اسلام کی جڑیں خود ہی کھوکھلی کر رہے ہیں)

سر سید کے بعد اس فہرست میں اور بھی متعدد بڑے نام شامل کیے جا سکتے ہیں کہ جن میں مولوی چراغ علی، سید امیر علی کنگی (بار ایٹ لاء)، عنایت اللہ مشرقی، اسلم جیراجپوری، تمنا عمادی (جو بعد میں تائب ہو گئے تھے) غلام احمد پرویز، عبد اللہ چکڑالوی، نیاز فتح پوری، محمد علی لاہوری، ڈاکٹر عبد الودود، ڈاکٹر فضل الرحمان اور دورِ جدید میں جناب جاوید احمد غامدی کا نامِ نامی لیا جا سکتا ہے۔

1- حیاتِ جاوید بحوالہ پاکستان کا معمار اول، ص 57

مرزا غلام احمد قادیانی مرتد:

مرزا غلام احمد قادیانی 1835ء میں پیداء ہوا اور 1908ء میں یہ خبیث باتھ روم میں مرا۔ اس خبیث کے متعلق بھی یہ کہنا بے جا نہیں کہ اس نے سرسید احمد خان کے مدرسۂ فکر سے شہ حاصل کی۔ مولوی چراغ علی سے مرزا کی خط و کتابت تھی اور جہاد سے متعلق دونوں ہم خیال تھے۔

اسی طرح حضرت عیسی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق اس نے سرسید کے خیالات کی پیروی کی، نئی نبوت کی گنجائش بھی اہلِ تجدد نے فراہم کر دی تھی۔

قادیانیت کے ظہور میں نو آبادیاتی نظام اور انگریزوں کا کردار غیر معمولی ہے، مرزا کا عقیدہ تھا کہ اسلام کے دو حصے ہیں:

''ایک کا تعلق خدا سے ہے اور دوسرے کا امن و امان قائم کرنے والی حکومت سے۔''

امن و امان قائم کرنے والی حکومت چونکہ اس وقت حکومتِ برطانیہ تھی؛ لہٰذا حکومت برطانیہ سے سرکشی، درحقیقت اسلام سے سرکشی ہے، اس مردود (مرزا قادیانی) میں انگریز پرستی کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ، وہ اس معاملے میں اپنے مخالفین کو احمق و نادان بلکہ حرامی اور بدکار قرار دیتے تھے۔

مرزا قادیانی نے بھی انکارِ حدیث کے اس فتنہ کا بھرپور ساتھ دیا، لیکن اس نے چونکہ نبوت کا دعوی کیا تھا، اس لیے اس نے اپنے آپ کو حدیث میں حَکَم (فیصلہ کرنے والا) مانا کہ، وہی حدیث درست ہو گی جسے میں (مرزا قادیانی) صحیح کہوں، چنانچہ لکھتا ہے:

''جو شخص حَکَم (فیصلہ کرنے والا) ہو کر آیا ہو، اس کو اختیار ہے حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پا کر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر رد کر دے۔''(1)

نیز لکھتا ہے:

1- روحانی خزائن جلد 17 ص 51، حاشیہ تحفہ گولڑویہ ص 10

''میرے اس دعوے (جھوٹے دعوائے نبوت) کی بنیاد حدیث نہیں بلکہ قرآن اور وحی ہے جو میرے اوپر نازل ہوئی۔ ہاں تاکیدی طور پر ہم حدیثیں بھی پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق ہیں اور میری وحی کے مُعارض (خلاف) نہیں اور دوسری حدیثوں کو ہم ردی کی طرح پھینک دیتے ہیں''۔[1] (العیاذ باللہ تعالیٰ)

عبداللہ چکڑالوی:

عبداللہ چکڑالوی 1844ء میں پیدا ہوا، 1915ء میں فوت ہوا۔ یہ برِصغیر میں وہ پہلا شخص ہے، جس نے کھل کر حدیث کا انکار کیا اور فرقہ ''اہلِ قرآن'' کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کا نام غلام نبی تھا اور ضلع گورداسپور کے موضع چکڑالہ میں پیدا ہوا، اس نسبت سے ''چکڑالوی'' کہلایا، مگر حدیث کی نفرت کی وجہ سے اس نے اپنا نام غلام نبی سے بدل کر عبداللہ رکھ لیا۔ تعلیم ڈپٹی نذیر احمد سے حاصل کی؛ کیونکہ ڈپٹی نذیر احمد بھی ترکِ تقلید کی طرف مائل تھے، تو یہ اثر عبداللہ کے اندر بھی آیا اور پھر یہی اثر بڑھتے بڑھتے انکارِ حدیث تک پہنچ گیا۔

چکڑالوی کا تبلیغی مرکز لاہور تھا، لنگڑا ہونے کے باعث لکڑی کے ایک تخت پوش (أریکۃ) پر ٹیک لگائے علومِ حدیث کی مخالفت کرتا رہتا تھا، سرسیّد کی طرح علومِ دینیہ اور عربیہ سے تو جاہل تھا ہی، فکری اعتبار سے بھی مفلس تھے۔ ایک عرصہ تک بخاری شریف کا درس جاری رکھا، مگر طبعی اضطراب نے بخاری اور قرآن کا توازن شروع کردیا، بعض احادیث کو خلافِ آیات اللہ قرار دے کر سب کے سامنے اعلان کردیا کہ:

''جب قرآن ایک مکمل ہدایت ہے تو حدیث کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

(یہ سن کر) چینیاں والی مسجد کے مقتدی کچھ عرصہ تک تو برداشت کرتے رہے، پھر ایک دن مسجد سے نکال دیا۔ جب عبداللہ چکڑالوی کو مسجد سے نکال دیا گیا تو ایک متشدد مقتدی محمد غبش عرف چٹو پھدالی ان کو سیانوالی بازار اپنے مکان میں لے گیا، جہاں گھر کے احاطہ میں ایک مسجد بنا کر، ''اہلِ قرآن'' کے مسائل کی تشہیر شروع کردی۔

1- ضمیمہ نزول مسیح ص30

ان کے چچازاد بھائی قاضی قمر الدین نے کھل کر مقابلہ کیا، نیز عبداللہ چکڑالوی کے لڑکے قاضی ابراہیم نے بھی اپنے والد صاحب کا مسلک ماننے سے انکار کر دیا، دوسرے صاحبزادے قاضی عیسیٰ اگرچہ کچھ دنوں تک والد کے ساتھ رہے، مگر پھر ان کو بھی توبہ کی توفیق ہوئی۔

عبداللہ چکڑالوی نے قرآن کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کا نام ''ترجمۃ القرآن بتصریفِ آیات القرآن'' ہے، اس تفسیر میں کھل کر جگہ جگہ پر اس نے انکارِ حدیث کیا، مثلاً: ایک جگہ پر لکھتا ہے:

''کسی جگہ سے یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی کہ قرآن کریم کے ساتھ کوئی شے آپ ﷺ پر نازل ہوئی تھی، اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں قرآن کریم کے سِوا اور چیز سے دینِ اسلام میں حکم کرے گا تو وہ مطابقِ آیاتِ مذکورہ بالا کافر، ظالم اور فاسق ہو جائے گا۔''(1)

چکڑالوی، احادیثِ طیبہ کو ماننے کو ''شرک'' کہتا تھا، ملاحظہ ہو:

''پس کتاب اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے مراد یہ ہے کہ، جس طرح کتاب اللہ کے احکام کو مانا جاتا ہے، اسی طرح کسی اور کتاب یا شخص کے قول یا فعل کو دینِ اسلام میں مانا جائے، خواہ فرضاً جملہ رسل وانبیاء کا قول یا فعل ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح شرک موجبِ عذاب ہے، اسی طرح مطابق اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اور اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ اور وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا کے، شرک فی الحکم یعنی مسائلِ دین میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کا حکم ماننا بھی، اعمال کو باطل کرنے والا، باعث ابدی و دائمی عذاب ہے، افسوس شرک فی الحکم میں آج اکثر لوگ مبتلا ہیں''۔(2)

1- ترجمۃ القرآن بتصریف آیات الفرقان

2- ترجمۃ القرآن بتصریف آیات الفرقان

اسی طرح اس نے ایک دوسری کتاب ''برھان القرآن علی صلوٰۃ القرآن''، لکھی، جو چارسو(400)صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بھی خوب حدیث کا انکار کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے:

''اور اس کہنے پر قرآن مجید سے دلائل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اللہ کا حکم ماننا فرض ہے اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کا، العجب ثم العجب اور اس مشرکانہ خیال کو دین کا اصلِ اصول جانتے ہیں''۔ (1)

مزید لکھتا ہے:

''فی الحقیقت حدیث میں اس قدر لغویات، ہزلیات اور دورازکار اور بے سروپا باتیں مندرج ہیں کہ وہ اس کی شکل کو نہایت ہی بدنما بناتی ہیں''۔ (2)

(نعوذ باللہ)

عبداللہ چکڑالوی کی عبرت ناک موت:

ایک مرتبہ لوگوں نے موقعہ دیکھ کر عبداللہ چکڑالوی کو سنگسار کر دیا، اتنے پتھروں سے مارا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا، جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ مرنے کے قریب ہے تو نیم مردہ حالت میں اس کو ملتان سے اس کے آبائی گاؤں چکڑالہ لے گئے، پھر چند ہی دنوں کے بعد زمین کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

مولوی چراغ علی:

مولوی چراغ علی 1844ء میں پیدا ہوا، 1895ء میں فوت ہوا، اصلی نام ''نواب اعظم یار جنگ'' ہے۔

مولوی چراغ علی خان کے مطابق، قرآن میں کوئی مخصوص ضابطۂ حیات یا سماجی وسیاسی قوانین نہیں ہیں، حضور ﷺ نے کوئی سماجی وقانونی ضابطہ مرتب کیا، نہ ایسا کرنے کا حکم دیا، چنانچہ دین کا تعلق محض ایک فرد کی زندگی کے اخلاقی پہلو سے ہے۔(یہ لبرل سوچ

1- برھان الفرقان علی صلوۃ القرآن، ص109

2- برھان الفرقان علی صلوۃ القرآن، ص109

ہے، جو آج کے زمانے کے اکثر حضرات نے زبان و دل سے مان لی ہے اور باقی ہر شخص نے اپنے عمل سے مان لی ہے)۔

اس کے برعکس مسلمانوں کو ایسے نظام قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی جو ان کے گردوپیش ہونے والی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں سے وقت کے تقاضوں کے مطابق ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔

کلاسیکی اسلامی قانون بنیادی طور پر شریعت نہیں بلکہ وہ رواجی قانون ہے، جس کے اندر ایامِ جاہلیت کے عربی اداروں کے باقی ماندہ اجزاء وعناصر، یا وہ احادیث شامل ہیں جو اکثر جعلی ہیں اور غلط طور پر پیغمبرِ اسلام ﷺ کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔

فقہاء اسلامی قانون کے سلسلہ میں، مقصودِ قرآنی کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں، انہوں نے قرآن کی روح کو شرعی عمل سے دبا دیا اور وہ ابتدائی مشرقی روایتی رسمیں جاری کر دیں جنہیں قرآن درحقیقت مذموم قرار دے چکا تھا۔

تصانیف: (1) تہذیب الاخلاق (2) تحقیق الجہاد مع ضمیمہ جات (3) حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام اور صلیب (4) احسانِ عام (5) شرح دیوانِ حضرتِ غوثِ اعظم، (مترجم) (6) حضرتِ سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام یعنی حضرت سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام کے واقعات کی توضیح اور آیاتِ قرآنی وافسانی تورات کی سائنٹیفک تشریح (7) اعظم الکتاب فی ارتقاء الاسلام۔

سید امیر علی:

سید امیر علی 1849ء میں پیدا ہوا، 1928ء میں یہ فوت ہوا۔ سید امیر علی، سر سید احمد خان کی پیروی کرتا تھا، اس کی مشہور تصنیف The Spirit of Islam (جس کا ترجمہ ''روحِ اسلام'' کے نام سے محمد ہادی حسین نے کیا ہے) نے صرف مغرب ہی میں قبولیت عامہ حاصل نہیں کی، بلکہ برِصغیر اور مصر کے مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں پر بھی گہرے اثرات ڈالے۔

سید امیر علی نے اپنی اسلامی تعبیرات میں استشراقی اور مغربی تصورات سے ہم آہنگی کی جا بجا جسارت کی ہے۔ فرشتوں اور شیطان کا خارجی وجود اور حشرِ جسمانی کا انکار کیا، ان چیزوں سے متعلق قرآنی بیانات کو بلا جھجک ''شاعرانہ اسلوبِ بیان'' کہا، نیز جنت و دوزخ کی حقیقت سے بھی انکار کر دیا، بلکہ اسے فقط تصورات اور خیالات کی دنیا تک محدود قرار دیا۔

نیاز فتح پوری:

نیاز فتح پوری 28 دسمبر 1884ء فتح پور (بھارت) میں پیدا ہوا، 24 مئی 1966ء کو فوت ہوا۔ اس نے تعلیم کے بعد مختلف رسائل میں بطورِ ایڈیٹر کام کیا پھر لکھنؤ سے اپنا رسالہ ''نگار'' نکالا، فلسفہ کا رنگ بہت زیادہ غالب تھا، جس کی وجہ سے صرف منکرِ حدیث ہی نہیں بلکہ منکرِ قرآن اور منکرِ اسلام تک بات پہنچی۔

کتاب ''من و یزدان'' میں نیاز فتح پوری کے عقائد و نظریات واضح ہیں، تمام منکرینِ حدیث میں سے اسکی امتیازی خباثت یہ ہے کہ، قرآن کو نہ خدا کا کلام سمجھتا ہے اور نہ ''منزل من اللہ''، بلکہ اسے ایک انسان کا کلام مانتا ہے۔

اب ''من و یزدان'' کے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

> ''عام مسلمانوں اور مولویوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے لحاظ سے مکمل طور پر پہلے لوح محفوظ میں منقوش و موجود تھا اور رسول اللہ ﷺ انہی آسمانی الفاظ کو دہراتے تھے۔ یہ حد درجہ مضحکہ خیز ہے اگر قرآن کی زبان عربی نہ ہوتی بلکہ کوئی نئی زبان ہوتی تو بھی خیر کچھ کہا جا سکتا تھا، بہر حال قرآن کو خدا کا کلام اس حیثیت سے تسلیم کرنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کا بتایا ہوا ہے اور خود رسول ﷺ کے عقل و دماغ کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا، خدا کو اس کے منصب سے گرا کر انسان کی حد تک کھینچ لاتا ہے اور رسول کو سطحِ انسانیت کی حد تک کھینچ لاتا ہے اور رسول ﷺ کو سطحِ انسانیت سے بھی نیچے گرا دیتا ہے''۔(1)

1- من و یزدان حصہ اول ص 552

اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں ایک عربی رسول اور عربی امت پر نازل ہوتا تو ایسے قرآن سے ہدایت کیسے ممکن ہے، جسے نہ نبی سمجھ سکتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا شخص اسے سمجھ سکتا؟

لیکن یہی وجہ نیاز صاحب کے نزدیک خدا کو انسان کے مقام پر اور رسول ﷺ کو انسان سے بھی کسی کم تر مقام پر لانے کے مترادف ہے، چنانچہ وہ کھل کر اپنی فاسد فکر کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

''کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں اور نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں اور اس مسئلہ پر میں اس سے قبل کئی بار مفصل گفتگو کر چکا ہوں''۔ (1)

گویا قرآن کو انسان کا کلام سمجھنا ہی، دراصل رسول اللہ ﷺ کو انسانیت کے مقام پر اور خدا کو خدائی کے مقام پر ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔

علمائے وقت نے جب، یہ اسلام بیزاری دیکھی تو کفر و الحاد کا فتویٰ لگایا، تو لکھا کہ:

''یہ تھا وہ سب سے پہلا فتویٰ کفر و الحاد، جس نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اگر مولویوں کی جماعت واقعی مسلمان ہے تو میں یقیناً کافر ہوں اور اگر میں مسلمان ہوں تو یہ سب کافر ہیں؛ کیونکہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف تقلید کا اور تقلید بھی اصول و احکام کی نہیں، بلکہ بخاری و مسلم و مالک وغیرہ کی۔''(2)

نیاز فتح پوری بھی انکارِ حدیث میں نمایاں اور بدترین شخصیت تھی۔

عنایت اللہ مشرقی:

1888ء میں پیدائش ہوئی اور اس کی موت 1964ء میں ہوئی اور اس کو اچھرہ کے

1- من و یزدان حصہ اول ص 45

2- من و یزدان حصہ اول ص 537

مقام پر دفن کیا گیا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اسلامیہ کالج پشاور کا پرنسپل بنا، انشاء پرداز فلسفی اور مؤرخ تھا، 1931ء میں ''خاکسار تحریک'' کی بنیاد ڈالی اور ایک ہفتہ وار پرچہ ''الاصلاح'' جاری کیا، 1940ء میں یہ تحریک خلافِ قانون قرار دی گئی اور دم توڑ گئی۔ (1)

تصانیف: (1) تذکرۂ قولِ فیصل (2) مولوی کا غلط مذہب (3) ارشادات۔

حدیث اور فقہ سے انکار کے بعد عقل نے عنایت اللہ مشرقی صاحب کو جس مقام پر پہنچایا، اس کا نقشہ کچھ اس طرح ہے:

> ''تعجب ہے کہ مذہب کی طرف اس عام میلان کے باوجود ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ قطعی فیصلہ نہ ہو سکا کہ کون سا مذہب سچا ہے؟ کون سا شارعِ کائنات، اللہ تعالیٰ کے منشاء کے عین مطابق ہے؟ مذہب کی سچائی کا معیار کیا ہے؟ نہیں بلکہ خود مذہب کیا شے ہے؟ اور اس کا مقصود بالذات بعینہ کیا ہے؟ خود خدا کی ہستی اور اس کے صحیح منشاء کے متعلق آج تک کوئی حتمی اور متفق علیہ دلیل نہیں مل سکی۔'' (2)

عنایت اللہ صاحب خدا کی ہستی کے متعلق کوئی ایسی حتمی اور متفق علیہ دلیل چاہتے ہیں جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ ہم عرض کریں گے کہ ایسی حتمی اور قطعی دلیل موجود ہوتی تو کسی بھی شخص کا کافر یا دہریہ ہونا ناممکن ہوتا، پھر خدا کی اطاعت اضطراری ہوتی اختیاری نہ ہوتی۔

موصوف کی فلسفیانہ فکر نے، صرف حدیث سے ہی نہیں بلکہ مذہب اور خدا سے بھی بے نیاز کر دیا، لیکن اسلام سے وابستگی آڑے آتی رہی اور قرآن سامنے رہا۔

قرآن میں موصوف کو مغربی اقوام ہی صحیح مومن نظر آتے ہیں، انگریز قوم اور انگریزی تہذیب کی جو عقیدت دل میں تھی، اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی واضح ہوتا ہے:

1- آئینہ پرویزیت ص123

2- دیباچہ تذکرہ قول فیصل ص2

''یہی انگریز تو وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرشتوں نے اپنے پروردگار سے، جب اس نے زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کا ارادہ کیا تھا تو ان فرشتوں نے کہا تھا کہ ''کیا تو ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو اس زمین پر فساد اور خونریزی کرے گا، اور ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہم تیری حمد وثناء کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں''، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے آئندہ اعمال پر غور کرتے ہوئے فرشتوں کو جواب دیا کہ ''میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''، پھر اللہ تعالیٰ نے ان انگریزوں کو بہت سی چیزوں کے نام اور بہت سی چیزوں کی حقیقتوں سے آگاہ کرایا اور پھر ان چیزوں کے استعمال پر قدرت دی''۔(1)

تاہم بعد میں یہ اقرار کرلیا تھا کہ میں پیٹ کی خاطر قرآن کی تکذیب کرتا رہا ہوں، وہ تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''میں اپنے نفس کے لئے شب وروز ظلم کرتا رہا ہوں اور صبح وشام اپنی تنخواہ کے لئے انگریز کی پرستش کرتا رہا ہوں اور اپنے رب کی عبادت نہیں کرتا، تاکہ وہ مجھے اپنی طرف سے روزی عطا فرمائے، میں دن بدن قرآن کی تکذیب کرتا رہتا ہوں اور میں توحید پر مداومت کی طاقت نہیں رکھتا، بلکہ اپنے نفس کے لئے مکر پر مکر کئے جاتا ہوں اور بڑی سرعت سے بار بار شرک میں مبتلا ہورہا ہوں، سوتم مجھے نہ دیکھو بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے دیکھو۔''(2)

اسلم جیراجپوری:

اسلم جیراجپوری 1888ء میں جیراج پور ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی بھارت) میں پیدا ہوئے اور وفات 1955ء میں ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد 1906ء میں سرسیّد کی

1- تذکرہ عربی ایڈیشن ص 47

2- تذکرہ عربی ایڈیشن ص 141

علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر لگ گئے، بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اسلامی تاریخ، حدیث اور قرآن کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

انکارِ حدیث کے بڑے ستون ہی نہیں، بلکہ بعض وجوہ سے مرکز تھے، جیراجپوری صاحب حدیث کے اُصولاً مخالف تھے اور اس حوالے سے بہت کام کیا ہے، اُسوۂ رسول کے بارے میں ایسی ایسی قیود لگائیں کہ انجام، انکارِ حدیث ہی ہوا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کی تفسیر لکھتے ہوئے، احادیث پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

''اس (دین کی) تکمیل کے بعد اب دین میں کمی کیا رہ گئی، جو روایتوں سے پوری کی جائے؟ اس لئے روایتوں کی جگہ اپنی تاریخ کی الماری ہے، ان سے تاریخی اور علمی فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور فقہِ اسلامی (یعنی قوانین وضوابط) کے استنباط میں کام کیا جاسکتا ہے۔ حدیثوں میں آنحضرت ﷺ کے اقوال، اعمال اور احوال بیان کئے گئے ہیں اور اسی کا نام تاریخ ہے، بے شک قرآن کے احکام، مثلاً: نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ پر رسول اللہ ﷺ نے جو عمل کر کے دکھایا اور امت کو سکھایا اور جو سلسلہ متواتر چلا آرہا ہے وہ یقینی اور دینی ہے کیونکہ تواتر یقین کی اقسام میں داخل ہے اور اسی کے متعلق قرآن نے کہا ہے: لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ''۔(1)

انکارِ حدیث کے بعد عنایت اللہ مشرقی وغیرہ، انگریز قوم کے دلدادہ بن گئے تھے، مگر جیراجپوری صاحب، نے روس نوازی اختیار فرمائی تھی:

''اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں سوویت روس میں اہلِ مذاہب اور مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں لیکن جو لوگ قرآنی زاویہ نگاہ رکھتے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ عالم میں کچھ حرب وضرب، شورش وانقلاب، تغیر وتبدل ہو رہا ہے، وہ سب تکمیلِ دین اور اتمامِ نور کے لئے ہو رہا ہے، اسلام کے واسطے

1- طلوعِ اسلام ستمبر 1955ء

زمین تیار کی جا رہی ہے؛ کیونکہ انسانیت کو ایک نہ ایک دن ان حقائقِ ثابتہ پر پہنچنا لازمی ہے''۔(1)

جملہ مذاہب (نہ کہ دین) اشخاص پرستی سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی تاریخ میں سوائے تفرقہ اندازی، سفک دم اور عداوت پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں، ان کا مٹانا اسلام کا فریضہ ہے اور یہی روسیوں نے کیا ہے۔(2)

بعض ایسے مسائل کا بھی انکار کیا جن کے ارشادات قرآن کریم میں ملتے تھے، مثلاً: عذاب قبر سے انکار اور اطاعت والدین کی نفی وغیرہ۔(3)

جیراج پوری صاحب حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حدیث کی اہمیت تاریخ سے کچھ زیادہ نہیں بالفاظ دیگر کوئی شخص بھی موجودہ احادیث میں سے اگر کوئی حدیث قبول کرنا چاہے تو وہ محض اس کی پسند اور مرضی پر'' حدیث پر ہمارا ایمان ہے اور نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کے راوی پر ہمارا ایمان ہے، نہ اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں، ان پر ہمارا ایمان ہے، نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت مانیں''۔

تصانیف: (1) تاریخ القرآن، (2) تاریخِ امت (۸ جلدوں میں) (3) الوراثہ فی الاسلام۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق:

ڈاکٹر صاحب کی 1901ء بسال ضلع کیمبل پور میں پیدائش اور 1985ء میں وفات

1- نوادرات ص114

2- نوادرات ص115

3- آئینہ پرویزیت ص127

ہوئی۔ تعلیم کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب سے منسلک رہے اور کیمبل پور کے کالج کے پرنسپل بھی رہے، اقوامِ مغرب اور مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے، حدیث کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

''ملّا سے میرا نزاع اس بات پر ہے کہ وہ حدیث کو آگے لا کر بے شمار ظواہر کو جزوِ اسلام ماننا چاہتا ہے اور میں قرآن کو پیش کر کے ملّت کو ان ملّائی قیود سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔''(1)

انکارِ حدیث کے بعد ڈاکٹر صاحب کی فکر قرآنی کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ رسولوں پر ایمان لانا ضروری نہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ کو قبولِ اعمال کی بنیادی شرط قرار دیا ہے، اس میں ایمان بالرسل شامل نہیں۔''(2)

2۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لانا ضروری نہیں۔

''ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اللہ تعالیٰ اس آیت وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا میں نیک یہود و نصاریٰ کو مژدۂ رحمت سنا رہا ہے، یہ لوگ خدا اور آخرت پر تو یقین رکھتے تھے مگر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے قائل نہ تھے، ممکن ہے مُلّا میری اس تحریر سے بھڑک اٹھے، کے لو جی یہ زندیق و ملحد نجات کے لئے ایمان برمحمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ضروری نہیں سمجھتا۔''(3)

3۔ اب اس فکرِ برق کا دوسرا پہلو یہ ہے:

''دوسری اقوام کے انبیاء سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم مرتبہ نہیں، مثلاً: موسیٰ و عیسیٰ، ابراہیم و محمد، رام و کشن، کنفیوشس و زرتشت و بدھ علیہم السلام۔''(4) (العیاذ باللہ)

1- آئینہ پرویزیت 1344

2- ایک اسلام ص 49

3- ایک اسلام ص 47

4- ایک اسلام ص 25

4۔ پہلے تو ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی غیر ضروری قرار دیا تھا، لیکن جب انگریزوں کی تعریف کرنی تھی تو تمام انبیاء کی تعریف وتعلیمات کو ضروری قرار دیا:

''دوسری اقوام کے انبیاء پر ایمان لانا، ان کے اسوہِ حسنہ پر چلنا، ان کے مناقب بیان کرنا، انہیں ہر لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم مرتبہ ثابت کرنا اور ان کی تعلیمات کو تعلیمات قرآن کہنا، ہمارا کام تھا، اسے کر رہے ہیں، لیکن بعض غیر مسلم۔''(1) (یہاں بعض غیر مسلم سے مراد ہیں اقوامِ مغرب)

اقوامِ مغرب اور ان کی تہذیب پر بہ دل و جان نثار تھے۔ انگریز قوم کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں آپ کی آنکھوں کے سامنے اللہ کے تمام انعامات سے (انگریز) لطف اندوز ہو رہے ہیں، سلطنت اس کی، علم اس کا، فضائیں اس کی، ہوائیں اس کی، باغ اس کے، نہریں اس کی، دانش اس کی، حکمت اس کی، اگر کل کو اللہ اس کی آخرت بھی سنوار دے تو آپ اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔''(2)

5۔ انگریزوں کو ہی ''متقین'' مانتے ہیں:

''متقین کا مصدر ہے ''تقویٰ''، جس کے معنی ہیں حفاظت، بچاؤ، ڈیفنس یعنی متقی لوگ وہ ہیں جن کا ڈیفنس مضبوط ہو، جن کی سرحدیں مستحکم ہوں، جو مہیب عسکری طاقت کے مالک ہوں اور جن کا کردار اتنا بلند ہو کہ ان پر کسی قسم کا حملہ نہ کیا جا سکے، اور آج تقویٰ کی یہ شان خوفناک اسلحہ جنگ کے بغیر پیدا نہیں کی جا سکتی الخ۔''(3)

ایک جگہ مرزا غلام احمد قادیانی کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

1- ایک اسلام ص24

2- ایک اسلام ص46

3- دو اسلام ص262 طبع اول و ص265 طبع ششم

''مرزا صاحب درست فرماتے ہیں کہ تمام حدیثیں تحریفِ معنوی ولفظی سے آلودہ یا سرے سے موضوع ہیں۔''(1)

برق صاحب نے بھی (پرویز کی طرح) چند کتب لکھ کر یہ نظریہ پیش کیا کہ مسلمانوں کی موجودہ

پستی کی وجہ، یہی حدیثی اسلام ہے اور جب تک مسلمان اس سے پیچھا نہیں چھڑائیں گے ان کی اصلاح ناممکن ہے۔

اپنی کتاب ''دو اسلام'' میں ایک باب ''صحیح حدیث کو ماننا پڑے گا'' میں انکارِ حدیث کے نظریئے سے توبہ کرلی اور عنایت اللہ مشرقی کی طرح اپنی غلطی کا صرف برملا اعتراف ہی نہیں کیا، بلکہ ''تاریخِ حدیث'' لکھ کر تلافی بھی کردی۔(2)

تصانیف: (1) ایک اسلام (2) دو اسلام (3) دوقرآن (4) حرف محرمانہ (5) تاریخِ حدیث (6) جہانِ نو

تمنا عمادی پھلواری:

تمنا عمادی پھلواری منکرینِ حدیث کے حلقے میں یہ نسبتاً صاحبِ علم سمجھے جاتے ہیں، اس نے کتابتِ حدیث کے متعلق مستشرقین کے تمام اعتراضات کو من وعن پیش کیا:

''یہ سب من گھڑت افسانے ہیں، دراصل کسی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیثوں کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا تھا، اگر دو چار حدیثیں بھی کوئی صحابی کسی ورق پر لکھ لیتے تو وہ ورق تبرک کے طور سے ضرور محفوظ رکھا جاتا''۔(3)

احادیث کے بعد قرآن کے متعلق لکھا:

''راویانِ احادیث، تفسیر میں جولوگ زیادہ پیش پیش تھے تقریباً سب کے

1- حرف محرمانہ:75

2- آئینہ پرویزیت ص125

3- اعجاز القرآن: 1/ 73، مولف: مولانا تمنا عمادی

سب نا قابلِ اعتبار اور اس جماعت میں وضاعین وکذابین (گھڑنے والے) کی ایک بہت بڑی اکثریت کارفرما رہی، مفسرین متقدمین نے ہر آیت کے متعلق متضاد ومتخالف روایتیں جھوٹی سچی ہر طرح کی حدیثیں اور ہر طرح کے اقوال جمع کر کے آیاتِ قرآنی کے معانی کو مشتبہ کر دیا''۔(1)

غلام احمد پرویز کے ماہنامہ ''طلوعِ اسلام'' میں اس کے مضامین شائع ہوتے تھے، ستمبر سنہ 1950ء کی اشاعت میں اس کا ایک مضمون شائع ہوا، اس میں لکھا:

''اور منافقینِ عجم نے اپنے مقاصد کے ماتحت جمعِ احادیث کا کام شروع کرنا چاہا تو انہیں منافقینِ عجم کے آمادہ کرنے سے، اس وقت خود ابنِ شہاب کو خیال ہوا کہ ہم حدیثیں جمع کرنا شروع کر دیں، تو یہ مدینہ پہنچے اور کوفہ بھی اور مختلف مقامات سے حدیثیں حاصل کیں اور بیسیوں راویوں کے ساتھ رہے''۔(2)

غلام احمد پرویز:

غلام احمد پرویز 1903ء میں پیدا ہوا اور 1985ء میں فوت ہوا۔ غلام احمد پرویز مغربی فکر سے متاثر تھا، سرسید کے زاویۂ فکر کو اختیار کر کے اُسے مزید وسعت دی۔ غلام احمد پرویز کے دور میں فتنۂ انکارِ حدیث پورے عروج کو پہنچا ہے، اس نے ''تفسیر مفہوم القرآن'' کئی جلدوں میں تحریر کی ہے، جو اردو عبارت اور حسنِ طباعت میں نفیس کتاب ہے؛ لیکن اس میں بدترین طریقے سے اسلام کے قطعی نظریات سے کھیلا گیا ہے، نہایت وسیع پیمانے پر مغربی فکر میں مطابقت کی کوشش کی اور حدیث کی حجیت کے حوالے سے استشراقی فکر کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔

غلام احمد پرویز، اسلم جیراج پوری کا شاگرد تھا، عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گزارا، ہوم ڈیپارٹمنٹ میں سیکشن آفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دیں، پرویز نے اپنے

1- اعجاز القرآن: 1/9، مولف: مولانا تمنا عمادی

2- طلوعِ اسلام: 48، ستمبر سنہ 1950ء

خیالات کی اشاعت میں اپنی سرکاری پوزیشن بھی استعمال کی اور افسران کے ایک حلقے کو (جو پہلے سے علماء سے بغض رکھتا تھا) متأثر کیا اور جدید تعلیم یافتہ لوگ کسی درجے میں اس کے گرد جمع ہو گئے، پرویز نے اپنے اس موقف پر ادبی انداز میں خاصا لٹریچر میلا کیا ہے۔ 1947ء میں پاکستان بنا تو دہلی سے کراچی منتقل ہوا، ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر، لاہور منتقل ہوا، گلبرگ میں رہنے لگا۔

غلام احمد پرویز مغربی مفکرین کے افکار ونظریات سے گہری دلچسپی رکھتا تھا اور اپنے مافی الضمیر کی تشریح کے لئے بکثرت ان کے اقتباسات پیش کرتا تھا بعد میں قرآنی آیات لکھ کر ان افکار پر فٹ کر دیتا تھا۔(1)

اپنے افکار ونظریات کو پھیلانے کے لئے وسیع لٹریچر تخلیق کیا، ذیل میں ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

امتِ مسلمہ سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت فرض اور واجب ولازم ہے۔ لیکن غلام احمد پرویز اس ضمن میں لکھتا ہے:

''مقلد آئمہ ہوں یا مقلد روایات، تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہے کہ ہم رسولِ اکرم ﷺ یا صحابہ کبار یا ائمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ رسولِ اکرم ﷺ وصحابۂ کبار یا ائمۂ فقہ کسی کے مقلد نہیں تھے، وہ مسائل زندگی کا حل خود سوچتے تھے، آپ بھی اپنے مسائلِ زندگی کا حل خود تلاش کیجئے''۔(2)

اس اقتباس میں غلام احمد پرویز صاحب نے تقلید کا لفظ ائمۂ اجتہاد وفقہا کے ساتھ، صحابۂ کبار اور اس سے بڑھ کر رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت پر بھی استعمال کر کے

1- آئینہ پرویزیت ص128

2- اسباب زوال امت-از غلام احمد پرویز ص101

مسلمانوں کو اطاعتِ رسول ﷺ سے برگشتہ کرنے کی جسارت کی ہے اور اس سے بھی زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا خود سوچنے میں سارے مسائل کا حل موجود ہے؟(1)

سنتِ رسول ﷺ کی پیروی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد غلام احمد پرویز صاحب مقامِ رسالت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''توحید کے بعد رسالت حضور ﷺ ختم المرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن رسول ﷺ پر ایمان لانے سے مفہوم اس کی ذات پر ایمان نہیں کیونکہ اس کی ذات تو مکان و زمان کی حدود کی پابند ہوتی ہے اور ملتِ اسلامیہ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، ابدیت سے ہمکنار ہے۔ رسالتِ محمدیہ ﷺ پر ایمان سے مقصود، اس کتاب پر ایمان ہے جو حضور ﷺ کی وساطت سے امت کو ملی۔''(2)

غلام احمد پرویز نے یہ تصور بھی پیش کیا ہے کہ مسلمان ''اللہ تعالیٰ کی اطاعت'' سے مراد ''قرآن کی اطاعت'' لیتے ہیں اور رسول ﷺ کی اطاعت سے مراد ''حدیث کی اتباع'' ہے، یہ ایک ایسی بات ہے جو سراسر بے بنیاد ہے:

''یہ تصور قرآن کی بنیادی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی بھی ہوسکتی ہے، حتیٰ کہ خود رسول کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتلا دیا گیا کہ اسے بھی قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے، لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد 'مرکز نظام دین' ہے جہاں سے قرآنی احکام نافذ ہوں۔''(3)

''اور تو اور انسانوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہستی (محمد) کی پوزیشن بھی اتنی

1- تاریخ حدیث-ایم-اے علوم اسلامیہ (تخصص فی الحدیث 200)

2- فردوس گم گشتہ ص383

3- معارف القرآن ج4، ص616

ہی ہے کہ وہ اس قانون کا انسانوں تک پہنچانے والا ہے، اسے بھی کوئی حق نہیں کہ کسی پر اپنا حکم چلائے، خدا اپنے قانون میں کسی کو شریک نہیں کرتا''۔(1)

مزید حوالہ جات:

☆ مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لیے جو سازش کی گئی اس کی پہلی کڑی یہ عقیدہ پیدا کرنا تھا کہ رسول اللہ کو (اس وحی کے علاوہ جو قرآن میں محفوظ ہے) ایک اور وحی بھی دی گئی تھی جو قرآن کے ساتھ بالکل قرآن کے ہم پلہ ہے، یہ وحی روایات میں ملتی ہے۔(2)

☆ ''یہ جھوٹ مسلمانوں کا مذہب بن گیا، وحی غیر متلو (حدیث) اس کا نام رکھ کر اسے قرآن کے ساتھ مثلِ قرآن ٹھہرایا گیا''۔(3)

☆ ''رسول کی اطاعت نہیں کیونکہ وہ زندہ نہیں۔''(4)

☆ ''ہماری 'صلوٰۃ' وہی ہے جو (ہندو) مذہب میں 'پوجا پاٹ' کہلاتی ہے، ہمارے 'روزے' وہی ہیں جنہیں (ہندو) مذہب میں 'برت'، ہماری 'زکوٰۃ' وہی شے ہے جیسے 'خیرات'، ہمارا 'حج' (ہندو) مذہب کی 'یاترا' ہے'، ہمارے ہاں یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے، یہ تمام عبادات اس لئے سرانجام دی جاتی ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے' ان امور کو نہ افادیت سے کچھ تعلق ہے، نہ عقل و بصیرت سے کچھ واسطہ، آج ہم اسی مقام پر ہیں، جہاں اسلام سے پہلے دنیا تھی''۔(5)

1- سلیم کے نام از پرویز، ج4، ص32، شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام لاہور

2- مقام حدیث جلد 1 صفحہ 421

3- مقام حدیث جلد 2، صفحہ 122

4- اسلامی نظام صفحہ 112

5- قرآنی فیصلے ص: 301 تا 302

☆ ''آپ (علماء) اپنی قوم کے دامن پکڑ کر آج سے تیرہ سو سال پہلے کے دورِ وحشت کی طرف گھسیٹ رہے ہیں''۔[1]

☆ ''قرآن کی رو سے صرف مردار، بہتا خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کی طرف منسوب چیزیں حرام ہیں، ان کے علاوہ کچھ حرام نہیں، ہمارے مروّجہ اسلام میں حرام و حلال کی جو طولانی (لمبی) فہرستیں ہیں وہ سب انسانوں کی خود ساختہ ہیں''۔[2]

☆ ''رسولِ اکرم کو قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا''۔[3]

حدیث کو نکالنے کے بعد اسلام کا حلیہ کیا ہوجاتا ہے ان چند اقتباسات سے ظاہر ہے، پرویز نے سارے اسلام، قرآن، حدیث، تمام عبادات، تمام احکامِ شرعیہ کا مطلب بیک جنبش تبدیل کرکے رکھ دیا پھر بھی اس کے ماننے والوں کا اصرار ہے کہ، انہیں مسلمان اور اہلِ قرآن کہا جائے۔

کفر کا فتویٰ:

مشرقی ومغربی پاکستان کے گیارہ سو علماء نے غلام احمد پرویز کے نظریات دیکھ کر اس پر 1957ء میں کفر کا فتویٰ صادر فرمایا۔

حمیدالدین فراہی

(پیدائش:18 نومبر 1863،وفات:11 نومبر 1930ء) ابتداء میں سرسید کے قائم کردہ علی گڑھ کالج میں استاذ تھے، وہاں پر سرسید احمد کے گمراہ کن افکار سے متاثر ہوگئے اور حدیث سے اعراض وگریز کو اپنا مقصدِ زندگی بنایا، بعد میں انہوں نے ''سرائے میر'' میں قائم ایک دینی مدرسے کا انتظام سنبھال لیا، اوراس میں ''نظم قرآن'' کے نام پر انکارِحدیث

1- قرآنی فیصلے

2- حلال وحرام کی تحقیق، ماہنامہ طلوعِ اسلام مئی 1952ء

3- معارف القرآن جلد 4 صفحہ 731

کے فتنے کی بنیاد ڈالی۔ ان کے شاگردان کے مشن کو آگے بڑھانے میں مصروف رہے اور تمام مسلمات اسلامیہ کو مشکوک کردیا، اور یہ سب خرافات انہوں نے ''خدمت قرآن'' کے نام پر کیں۔

حدیث کا مقام

فراہی صاحب کہتے ہیں: ''بعض ماخذ اصل واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض فرع کی، اصل واساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے، اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے، باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں (1) احادیث (2) قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات۔ (3) گزشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں''۔

اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہے کو دخل نہ ہوتا، تو ہم ان کو فرع کے درجے میں نہ رکھتے، بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی اور سب بالا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔

تجزیہ:

(1) یہ کہنا کہ ''اصل واساس صرف قرآن ہے، قرآن کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے'' یہ گمراہی کی سب سے بڑی بنیاد ہے، یہ شریعت کے درست فہم سے جہالت کی دلیل ہے، دراصل یہ شیطانی جال اور مقام حدیث کا انکار ہے۔

(2) امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس طرح اسلام کی اصل واساس قرآن ہے، حدیث رسول ﷺ کو بھی بعینہ اسلام کی اصل واساس کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے درمیان فرق کرنا گمراہی ہے۔

(3) فراہی صاحب نے حدیث پر دوسرا ظلم یہ ڈھایا ہے کہ حدیث کو بالکل وہی مقام دیا، جو تاریخ اور قدیم صحیفوں کا ہے۔

(4) تاریخ صحیح اور غیر صحیح باتوں کا مجموعہ ہے، اس میں تحقیق اور چھان پھٹک کا کام بھی نہیں ہوا، قدیم صحیفوں کی صورت حال اس سے بھی ابتر ہے۔ وہ سب تحریف شدہ اور یکسر

غیر مستند ہیں، ان دونوں کے مقابلے میں حدیث کی حیثیت بالکل مختلف ہے، فراہی صاحب کے شاگرد، اصلاحی صاحب کے بقول ''محدثین نے حدیث کی چھان پھٹک میں تحقیق کی معراج کی بلندیوں کو چھوا ہے اور انسانی امکان کی حد تک اس فن کی خدمت کی ہے''۔

حدیث غیر محفوظ:

فراہی صاحب کہتے ہیں کہ:

''میں اپنے بعض بھائیوں کے طعن سے ڈرتا رہا، لیکن حدیث کے معاملے میں ان کے غلو نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا کہ وہ حدیث کو بھی آیت إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر:9) یہ یاددہانی ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) کے تحت داخل سمجھنے لگے اور اس کے نتائج پر انہوں نے غور نہیں کیا، لہذا اب میرے لیے ضروری ہے کہ میں حق کا جھنڈا بلند کروں اور اس بات کی پرواہ نہ کروں کہ اس جرم کی پاداش میں لوگ میرا سر قلم کر دیں گے''۔ (1)

تجزیہ:

(1) ''حدیث غیر محفوظ ہے''، یہ دعوی نیا نہیں ہے، ہر منکر حدیث کی زبان پر یہ دعوی جاری رہتا ہے۔ اس کا تفصیلی رد ''انوارِ حدیث'' میں پڑھ سکتے ہیں۔

(2) حدیث کے غیر محفوظ ہونے کا دعوی ان کی ایک مجبوری ہے تاکہ وہ اپنے خودساختہ باطل نظریات کو ثابت کرنے کے لیے جس حدیث کا چاہیں انکار کر دیں۔

فراہی صاحب کے چند گمراہ کن نظریات:

(1) حدیث کو وحی الٰہی کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسے اجتہادات سے تعبیر کرتے ہیں، جن میں عام انسانوں کے اجتہادات کی طرح صواب وخطاء دونوں کا

1- مقدمہ ''نظام القرآن''، صفحہ:65

امکان ہے۔[1]

(2) حدیث سے قرآن کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا۔[2]

(3) حضرت ابراہیم علیہ السلام خواب کی تعبیر کو نہ سمجھ سکے اور اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے راضی ہو گئے، حالانکہ خواب میں یہ اشارہ تھا کہ بیٹے کو اللہ کے گھر کی خدمت کرنے کے لیے وقف کرنا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام خواب کی یہ دقیق تعبیر نہیں سمجھ سکے۔[3]

(4) سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی والدہ سیدہ ہاجرہ علیہا السلام کا صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے والی صحیح بخاری کی روایت کو یہودیوں سے اخذ کردہ قرار دے کر سعی بین الصفا والمروہ کو اس واقعے کی یادگار ماننے سے انکار کیا ہے۔[4]

(5) منیٰ میں شیطان کو کنکر مارنا اصحاب فیل کی یادگار ہے، نہ کہ حضرت ابراہیم کی یادگار۔[5]

خلاصہ کلام:

فراہی صاحب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس منصب کا انکار کر رہے ہیں کہ حدیث سے قرآن پر اضافہ نہیں ہوسکتا، یہ حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حاصل نہیں ہے، لیکن خود اپنے آپ کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں اور جو چیز قرآن میں نہیں ہے وہ اپنی طرف سے قرآن کے نام پر قرآن میں داخل کر دیتے ہیں۔

1- حدیث کا شرعی مقام، 1/167، طبع: 2014

2- مقدمہ "نظام القرآن"، تفسیر کے خبری ماخذ، ص: 39

3- ذبیح کون ہے، ص: 20، یہ فراہی صاحب کی عربی کتاب "من ھو الذبیح" کا اردو ترجمہ ہے، مترجم: اصلاحی صاحب ہیں۔

4- ذبیح کون ہے، ص: 137

5- تفسیر سورۃ فیل، ص 403، از مولانا فراہی، مترجم امین احسن اصلاحی

قابل غور بات یہ ہے کہ جب قرآن کی پیغمبرانہ تفسیر، قرآن میں اضافہ شمار ہوتی ہے اور قرآن کی توہین ہے، تو ''فراہی تفسیر'' قابل فخر اور عظیم کارنامہ کیوں اور کس اعتبار سے ہے؟

جو حق صاحب قرآن، حامل قرآن، پیغمبر قرآن کو حاصل نہیں ہے، وہ حمید الدین فراہی، امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد غامدی کو کہاں سے حاصل ہو گیا ہے؟

فراہی فتنہ کئی فتنوں کا سرچشمہ ہے، جس میں انکار حدیث، قرآنی معجزات کا انکار، مسلمات اسلامیہ کا انکار، منصب رسالت کا انکار، شریعت سازی کا خود ساختہ ارتکاب، قرآن کے مقابلے میں تحریف شدہ صحیفوں پر زیادہ اعتماد، قرآن کریم کی معنوی تحریف اور قرآن کی من مانی تاویل، وغیرہ وغیرہ پایا جاتا ہے۔

امین احسن

امین احسن اصلاحی (پیدائش، 1904ء، وفات، 1997ء) انڈیا میں اعظم گڑھ کے ایک گاؤں ''بمہور'' میں ہوئی، مدرسہ فراہی کے ایک ریسرچ اسکالر تھے، وہ حمید الدین فراہی کے آخری عمر کے تلمیذ خاص ہیں۔

ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی، جب دس سال کے ہوئے تو مولانا شبلی نعمانی نے اپنے مدرسے ''مدرستہ الاصلاح'' میں داخل کر دیا۔ فراغت کے بعد حمید الدین فراہی کے ساتھ مستقل وابستہ ہو گئے، ان سے صرف علوم تفسیر ہی نہیں پڑھے بلکہ استاد کے طریقۂ تفسیر میں مہارت بھی حاصل کی، چنانچہ ایسی تفسیر لکھی جو حقیقی معنوں میں فکر فراہی کی ترجمانی کرتی ہے، خود کہتے ہیں:

> ''یہ (تفسیر) کم وبیش ایک صدی کا قرآنی فکر ہے، جو آپ کے سامنے ''تفسیر تدبّرِ قرآن'' کی صورت میں آیا ہے، اگرچہ میں اپنے فکر کو حضرت الاستاذ (حمید الدین فراہی) کے فکر کے ساتھ ملانا بے ادبی خیال کرتا ہوں، لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے کہ میں نے عمر بھر استاذ کے سر میں اپنا سر ملانے کی

کوشش کی ہے اور میرا فکر، ان کے فکر کے قدرتی نتیجہ ہی کے طور پر ظہور میں آیا، اس وجہ سے یہ جوڑ ملانے کی جسارت بھی کر رہا ہوں۔''

امین احسن کا دعویٰ:

اپنی کتاب ''مبادی تدبر حدیث'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''اس مضمون میں وہ اصول ومبادی میں نے بیان کر دیے ہیں جو احادیث کو سمجھنے اور ان کی صحت وسقم کا فیصلہ کرنے کے لئے میں ضروری سمجھتا ہوں اور جن کو میں نے ملحوظ رکھا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں کوئی مجھے منفرد قرار دے سکے۔

یہ ساری باتیں ہمارے ائمہ حدیث کی مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں اور یہ ایسی معقول اور فطری ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا، جو لوگ صرف اپنے فقہی مسلک ہی کی حدیثیں پڑھنے پڑھانے پر قانع ہیں ان کا کام بہت سہل ہوتا ہے، ممکن ہے وہ ان اصولوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ کر سکیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ وہ ان سے متوحش ہوں۔''

حدیث اور سنت میں فرق

مولانا اصلاحی کہتے ہیں:

''حدیث اور سنت میں آسمان وزمین کا فرق ہے اور دین میں دونوں کا مرتبہ ومقام الگ الگ ہے''۔

حدیث: حدیث نبی کے کسی قول یا فعل یا آپ کی کسی تصویب کی روایت کو کہتے ہیں۔ (1)

خبر متواتر: یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خبر متواتر کا اسم تو موجود ہے، لیکن ہمارے علم کی حد تک اس کا کوئی صحیح مسمی موجود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک وہ احادیث جنہیں خبر

1- مبادی تدبر حدیث، صفحہ:19

متواتر کہا گیا ہے تحقیق طلب ہیں، البتہ سنت کو تواتر کا درجہ حاصل ہے۔[1]

حدیث وسنت کے فرق کا تجزیہ

(1) جناب امین اصلاحی صاحب اپنے اس دعویٰ پر قائم نہیں رہ سکے کہ ان کی یہ کتاب ''ائمہ حدیث'' کی مستند کتب سے ماخوذ ہے کیوں کہ انہوں نے حدیث اور سنت کے اس زمین وآسمان کے فرق پر کسی بھی امام کا کوئی قول نقل نہیں کیا۔

(2) اصطلاحات المحدثین کی تبدیلی کو مولانا خود بھی منکرین حدیث کی جسارت قرار دیتے ہیں۔ (دیکھیے مقدمہ تدبر قرآن) لیکن تدبر حدیث پڑھنے والے جانتے ہیں کہ مولانا خود بھی اس فتوے کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔

(3) باقی رہا یہ دعویٰ کہ دونوں کا دین میں مقام ومرتبہ الگ الگ ہے، تو اس کی بھی کوئی دلیل انہوں نے ائمہ حدیث کی ''مستند کتب'' سے نہیں دی اور نہ خود ہی کوئی مقام و مرتبہ الگ الگ بیان کیا، آخر کیوں؟

(4) خبر تواتر کا فقط اسم مان کر مسمی کا انکار، درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ موصوف کے ہاں جس طرح خبر واحد قابل حجت نہیں (اگر چہ کثیر تعداد میں ہیں) اسی طرح خبر متواتر بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ خبر متواتر (ان کے اصولوں پر) ثابت ہی نہیں ہوتی۔ گویا تمام احادیث سے چھٹکارا حاصل ہوگیا۔ اب امین احسن صاحب کے اس دعوے کی منافقت بھی واضح ہوگئی ''قرآنی احکام کی تفصیل کے لئے سنت اور حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے''، یہ دعویٰ صرف مؤمنوں کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ''جناب شیخ کا قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی''۔

(5) اگر ''محدثین'' کے پیمانہ سے گزر کر تواتر کا درجہ پانے والی احادیث تحقیق طلب ہیں تو پھر کل کو قرآن کی قراءات متواترہ بھی تحقیق طلب ہوجائیں گی اور ''ائمہ محدثین'' کی مستند کتابوں سے دلیل دینے کے بجائے، اصول اصلاحی پیش کئے جائیں گے۔

1- مبادی تدبر حدیث، صفحہ: 20، 21

(6) اپنی من مانی تشریحات کو ائمہ حدیث کی طرف منسوب کرنا کا اختیار انہیں کیسے ملا؟ اگر بلا دلیل ہی یہ اختیار انہیں حاصل ہے تو پھر یہ اختیار کسی کو بھی حاصل ہوسکتا ہے، جیسے غلام احمد پرویز نے اپنی خود ساختہ اصطلاحات سے نظام ربوبیت، قانون خداوندی اور اللہ اور رسول کے کیا کیا معنی بیان کر دیئے۔

(7) اصلاحی صاحب کہتے ہیں کہ ''اصطلاحات کا بدلنا منکرین حدیث کی جسارت ہے'' اگر پرویز اصطلاحاتِ محدثین بدل کر منکرین حدیث قرار پاتا ہے تو جناب اصلاحی کے اپنے الفاظ خود ان پر بھی صادق آتے ہیں۔

(8) اگر خبر متواتر کا مسمی موجود نہیں تھا تو ائمہ حدیث کو متواتر کی اصطلاح بنانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟

قرآن اور حدیث وسنت کا باہمی تعلق

قرآن اور حدیث وسنت میں نہایت گہرا باہمی تعلق ہے، ان کا معنوی تعلق روح اور قالب کا اور ظاہری تعلق اجمال وتفصیل کا ہے، دونوں دین کے قیام کے لئے یکساں ضروری ہیں، دونوں کا اتباع اور احترام یکساں واجب ہے۔

قرآن نے دین کے کلیات اور اصول ومبادی پر جامع بحث کی ہے، لیکن کسی باب میں بھی تفصیلات اس میں نہیں ملتیں، ان کے لئے سنت اور حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔(1)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ لوگوں کو بتایا اور سکھایا اس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض نبوت سے نہ تو خارج کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کا درجہ اصل کتاب کے مقابل میں گرایا جا سکتا ہے۔(2)

جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احکامی آیات کے اجمالات کی وضاحت فرمائی اسی طرح

1- مبادی تدبر حدیث، صفحہ:33

2- مبادی تدبر حدیث، صفحہ:34

حکمت کے دقیق اشارات قرآن میں ہیں ان کی بھی وضاحت فرمائی۔ یہی چیز ہے جس کی بابت نبی ﷺ نے فرمایا:

''الا انی اوتیت القرآن ومثله معه'' (ابو داؤد، کتاب السنۃ) آگاہ رہو میں قرآن دیا گیا ہوں اور اس کی مانند اس کے ساتھ اور بھی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سنت، مثلِ قرآن ہے، سنت اپنے ثبوت میں بھی ہم پایۂ قرآن ہے، قرآن امت کے قولی تواتر سے ثابت ہے اور سنت عملی تواتر سے ثابت ہے۔[1]

اصول اصلاحی کا تجزیہ

1) موصوف پہلے کہہ چکے ہیں کہ حدیث وسنت میں زمین وآسمان کا فرق ہے اور دین میں دونوں کا مقام ومرتبہ الگ الگ ہے، لیکن یہاں ان دونوں کا فرق ختم کر دیا۔

2) قرآن کو صرف امت کے قولی تواتر سے ثابت ماننا بھی بڑی جسارت ہے؛ کیونکہ جمع القرآن کے وقت زبانی قراءت جو سینوں میں محفوظ تھی اور جو قرآن قرطاس میں تحریری صورت میں موجود تھا، دونوں کو طلب کر کے باہم موازنہ کر کے حتمی شکل میں ''الامام'' میں درج کیا گیا تھا، گویا فقط قولی تواتر کافی نہ تھا۔

3) یہ خود ساختہ قید کہ'' قرآن امت کے قولی تواتر سے ثابت ہے اور سنت عملی تواتر سے ثابت ہے''، اس قید کی کوئی بھی دلیل کسی بھی ''امام حدیث کی مستند کتاب'' سے پیش نہیں کی، اور نہ ہی کوئی حوالہ پیش کیا۔

تدبّرِ حدیث کے چند بنیادی اصول

لکھتے ہیں: علم رسول کے اس عظیم سرمایہ سے (جو احادیث کی شکل میں امت کو منتقل ہوا) حقیقی معنوں میں فیض یاب ہونے کے لئے تدبر حدیث ضروری ہے۔ یہ رہنما اصول پانچ ہیں:

1- مبادی تدبر حدیث، صفحہ: 35

پہلا اصول:

قرآن مجید ہی امتیاز کی کسوٹی ہے حدیث کے معاملے میں بھی اصلاً وہی امتیاز کی کسوٹی ہے۔ (1)

دوسرا اصول:

ہر حدیث، احادیث کے مجموعی نظام کا ایک جزو سمجھی جائے گی، اگر کوئی حدیث اپنے مجموعی نظام سے بے جوڑ ہوگی تو وہ رد کر دی جائے گی۔ (2)

تیسرا اصول:

حدیث کی اصل زبان عربی ہے، حدیث کے طالب علم کے لئے صرف عہد نبوت و صحابہ کی زبان کی مہارت ضروری ہے۔ اگر یہ چیز کسی کو حاصل نہ ہوگی تو اندیشہ ہے کہ وہ ''الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم'' کو قرآن کی ایک آیت باور کر لے گا، حالانکہ قرآن کی آیت تو درکنار، اس کو ایک صاحب ذوق کے لئے حدیث ماننا بھی مشکل ہے، اس کی زبان بالکل عجمی فقہاء کی زبان ہے۔ (3)

چوتھا اصول:

کلام کے عموم و خصوص، موقع و محل اور خطاب کا فہم ضروری ہے، مثلاً: ''الأئمۃ من قریش'' (خلفاء قریش میں سے ہوں گے) اس کے موقع و محل کو سمجھنے میں صدر اول کے، بعد کے دور کے، بیشتر اصحاب علم نے شدید غلطی کی ہے۔ (4)

بعض حدیثوں میں آتا ہے: ''امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ'' اس کو ظاہری معنی میں لیں اور صحیح موقع و محل نہ سمجھیں تو مستشرقین کا کہنا صحیح ثابت ہو جائے گا

1- مبادی تدبر حدیث، صفحہ:47

2- مبادی تدبر حدیث، طبع دوم، مارچ 1994ء، ص50

3- مبادی تدبر حدیث، صفحہ:52

4- مبادی تدبر حدیث، صفحہ:53

کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔

پانچواں اصول:

دین اور عقل وفطرت میں منافات نہیں ہے، ہر وہ چیز جو عقل وفطرت کے منافی ہوگی وہ دین کے بھی منافی ہوگی۔

تجزیہ:

(1) ایک عام انسان کی بات اگر قرآن کے موافق ہے تو وہ قابل قبول ہے، اور اگر قرآن کے مخالف ہو تو مردود ہے، اگر یہی معاملہ نبی کے ساتھ بھی ہو کہ اس کی وہ بات جو قرآن کے موافق ہے وہ قابل قبول، اور جو مخالف ہو تو وہ قابل قبول نہ ہو، تو نبی اور عام انسان میں فرق کیا رہ جائے گا؟ یہ صریح انکار حجیت حدیث ہے۔

(2) وہ احادیث جو قرآن کی آیات کی ترتیب بیان کرتی ہیں، کونسی قرآن کی آیت کے ذریعے ان احادیث کی صحت کو جانچا جائے؟

(3) سوال یہ ہے کہ اگر حدیث قرآن کے خلاف نظر آئے تو قابل قبول نہیں، اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے، اگر قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کے خلاف نظر آئے تو کیا وہ بھی قابل قبول نہیں ہوگی؟ لامحالہ اس میں تطبیق کی راہ نکالی جائے، اسی طرح اگر ایک حدیث قرآن کے خلاف نظر آئے تو اس میں بھی تطبیق کی صورت نکالی جائے گی، نہ یہ کہ اس حدیث کو ہی رد کیا جائے۔

(4) یقیناً احادیث کی زبان عربی ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو عجمی النسل ہیں وہ حدیث کی فصیح عربی کو کیسے سمجھیں گے؟

(5) ''الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم'' کو عجمی فقہاء کی زبان کہہ کر قابل رد قرار دینا انتہائی جسارت ہے، حالانکہ یہ روایت بخاری شریف میں موجود ہے، یہ اصلاحی صاحب کا اپنے منکر حدیث ہونے کا باضابطہ اعلان ہے۔

(6) یقیناً دین اسلام فطرت سلیمہ اور عقل سلیم کے مطابق ہی ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ حدیث کے قبول ورد میں صرف فطرت اور عقل کو معیار قرار دے دیا جائے؛ کیونکہ اسلام تو عقل سلیم اور فطرت سلیمہ کے خلاف نہیں مگر لوگوں کی عقلِ فاسد تو اسلامی احکام کے خلاف ہوسکتی ہے اور بری عادتیں غالب آجاتی ہیں، جس سے لوگوں کی فطرتیں مغلوب بھی ہوسکتی ہیں، جس کا مشاہدہ آئے روز ہوتا ہی رہتا ہے۔

(7) اس طرح کہنا کہ: ''ہر وہ چیز جو عقل وفطرت کے منافی ہوگی وہ دین کے بھی منافی ہو گی'' بہت بڑی جسارت ہے اور قرآن وحدیث دونوں کی حیثیت کو گھٹانا ہے۔

(8) حدیث کی حجیت کے انکار کے لئے اصلاحی صاحب نے یہ اصول بنایا کہ ''ہر وہ چیز جو عقل وفطرت کے منافی ہوگی وہ دین کے بھی منافی ہوگی''، تو سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کی آیت عقل وفطرت کے خلاف ہوگی تو کیا اس کا بھی انکار کریں گے؟

تفسیر تدبرِ قرآن سے چند اقتباسات:

(1) قرآن کی تفسیر میں اصل واساس کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے، احادیث کی حیثیت فرع کی ہے۔

(2) قرآن کا شانِ نزول صرف قرآن سے اخذ کرنا چاہیے۔

(3) دیگر آسمانی تحریف شدہ کتابوں سے تائید حاصل کرتے ہیں، انہیں حدیث سے بھی بڑا درجہ دیتے ہیں، بسا اوقات قرآن پر بھی فوقیت دیتے ہیں۔

(4) احادیث کی سند سے بڑی چڑ رکھتے ہیں، اور احادیث کی کتابوں کو ہدف تنقید بنانا محبوب مشغلہ ہے۔

(5) حدیث سے قرآن کے عموم کی تخصیص کو نہیں مانتے۔

(6) سورۃ الکوثر کی تفسیر میں ساری صحیح احادیث کا انکار کر کے ''الکوثر'' سے ''خانہ کعبہ'' مراد لیا ہے۔

(7) سورۃ الفیل کی وضاحت میں صحیح احادیث کا انکار کر کے من مانی تفسیر کی ہے۔

(8) امت مسلمہ صحیحین (بخاری ومسلم) کی اکثر احادیث کی صحت پر متفق ہے، لیکن فراہی گروہ صحیحین (بخاری ومسلم) کی صحت کو بالکل نہیں مانتے۔

(9) معراج جسمانی کی کو نہیں مانتے۔

(10) قیامت کے قریب نزول مسیح کے عقیدے کو نہیں مانتے۔

(11) حد رجم کے قائل نہیں ہیں۔

نوٹ: امین احسن اصلاحی صاحب کے نظریات کی یہ مختصر وضاحت ہے، اب ہم ان کے شاگرد رشید جاوید احمد غامدی کے نظریات کی تفصیل کریں گے، اور ہر چیز با حوالہ ذکر کریں گے؛ کیونکہ فی الحال فراہی گروہ کے سربراہ غامدی صاحب ہی ہیں اور جدیدیت کے علمبردار بھی یہی ہیں، کثیر اشرافیہ اور نابالغ مفکرین کو اپنا ہمنوا بھی بنا چکے ہیں۔

جاوید احمد غامدی

جاوید احمد غامدی کے نظریات پر تفصیلی گفتگو ہوگی؛ کیونکہ اس فتنے کا شکار، مذہبی طبقہ کثرت کے ساتھ بن رہا ہے۔

18 اپریل 1961ء کو پنجاب ضلع ساہیوال کے ایک گاؤں ''جیون شاہ'' کے نواح میں پیدا ہوا، آبائی گاؤں قصبہ داؤد ہے، آبائی پیشہ زمینداری ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی، اسلامیہ ہائی اسکول پاک پتن سے میٹرک کیا، گورنمنٹ کالج لاہور سے ''بی-اے، آنرز'' کا حصۂ اوّل میں امتحان پاس کیا، عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم ضلع ساہیوال ہی کے ایک گاؤں ''نانک پال'' میں مولوی نور احمد سے حاصل کی، دینی علوم قدیم طریقے کے مطابق مختلف اساتذہ سے پڑھے، کئی سال ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ رہے۔

قرآن وحدیث کے علوم 1973ء سے 1983ء تک دس سال ''مدرسہ فراہی'' کے سرغنہ امین احسن اصلاحی سے پڑھے، سورۃ زخرف سے آخر تک قرآن کا ترجمہ، مؤطا امام مالک، قرآن پر تدبر کے اصول، تدبر حدیث کے اصول اور فلسفۂ جدید کے مباحث پڑھے۔

موصوف کے یہ حالات زندگی ان کی کتاب ''مقامات'' سے ماخوذ ہیں، ان (درج بالا) کوائف سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ کوئی دینی تعلیم مکمل حاصل کی اور نہ ہی دنیوی، اس تعلیم کی بنیاد پر تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی کسی بھی رائے کا اعتبار نہ کیا جائے، لیکن آج کل انہیں ''عظیم مذہبی اسکالر اور مجتہد'' قرار دیا جاتا ہے۔

غامدی صاحب کے ہاں پوری امت میں صرف دو ہی علماء ان کے ممدوح ہیں، جن کو وہ آسمان کا درجہ دیتے ہیں باقی تمام علماءِ امّت کو وہ خاک کے برابر قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی کتاب ''مقامات'' میں خود لکھتے ہیں:

''میں نے بھی بہت عالم دیکھے ہیں، بہتوں کو پڑھا اور بہتوں کو سنا لیکن امین اصلاحی اور ان کے استاد حمید الدین فراہی کا معاملہ وہی ہے کہ:

غالب نکتہ دان سے کیا نسبت
خاک کو آسمان سے کیا نسبت''[1]

ملک وملّت کے غدار ''پرویز مشرف'' کے دورِ حکومت میں غامدی صاحب کو بڑی پذیرائی ملی اور وہ اسلامی نظریاتی کونسل تک پہنچ گئے، قرآن وسنت کے حوالے سے ان کی آراء کو جدید آزاد خیال طبقہ میں مقبول کرایا جارہا ہے۔

1990ء میں ''ادارہ علم وتحقیق'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، مزید ''المورد'' کے نام سے بھی ایک ادارے کے بانی ہیں، 1980ء سے مضامین اور کتابیں لکھ رہے ہیں۔

دو رسائل ''ماہنامہ اشراق'' اردو میں، (جس کا آغاز 1985ء سے ہوا)۔

اور ''Kenai-ssance'' انگریزی جریدہ، کے مدیر ہیں۔

غامدی کے حدیث اور سنّت کے متعلّق نظریات:

1۔ سنن کی تعداد میں تضاد:

جناب غامدی صاحب کے ہاں اُمورِ سنت اور دین میں بھی تضادات پائے جاتے ہیں۔

1- مقامات ص:57

☆ مثال کے طور پر وہ داڑھی کو کبھی سنت اور دین کہتے ہیں اور کبھی اسے سنت اور دین سے خارج سمجھتے ہیں۔

☆ اُن کے ہاں ایک وقت میں وضو اور تیمم سنت اور دین ہوتے ہیں اور دوسرے وقت وہ ان دونوں کو سنت اور دین کے دائرے سے نکال باہر کرتے ہیں۔

☆ وہ کبھی حرمین شریفین کی حرمت کو سنت اور دین قرار دیتے ہیں اور کبھی اسے سنت اور دین سے الگ کر دیتے ہیں۔

☆ اُن کے ہاں کبھی ''اشہرحرم'' (مخصوص حرمت والے مہینے) سنت اور دین ہوتے ہیں اور کبھی دین نہیں ہوتے۔

☆ کبھی طلاق اُن کے نزدیک سنت اور دین ہے اور کبھی سنت اور دین نہیں ہے۔

☆ کبھی خنزیر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت، سنت ہوتی ہے اور کبھی اُسے سنت کے امور سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ہر بار اپنے اس تغیر و تبدل کو وہ پوری قطعیت (یقین) کے ساتھ سنت اور دین کہتے پھرتے ہیں اور پھر بالکل قطعیت کے ساتھ اُسے سنت اور دین کے اعزاز سے محروم بھی کر دیتے ہیں، جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی ہے۔

غامدی صاحب جون 1991ء میں داڑھی کو سنت مانتے تھے، چنانچہ وہ اپنے ایک خط ''بنام جناب شیر محمد اختر صاحب'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''رجم کا معاملہ چونکہ دوسری قسم ہی سے تعلق رکھتا ہے، اس وجہ سے میں نے اس پر بحث کی اور عام رائے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، ورنہ داڑھی، ختنہ اور اس طرح کی بے شمار دوسری چیزوں میں سنت کو مستقل بالذات شارع مان کر ہی دین میں شامل قرار دیتا ہوں۔''(1)

اس کے بعد جب مئی 1998ء میں غامدی صاحب نے چالیس (40) امور پر مشتمل

1- جاوید غامدی صاحب کا خط بنام جناب شیر محمد اختر صاحب، حوالہ ماہنامہ اشراق، شمارہ جون 1991 ص 32

سنت اور دین کی ایک مکمل اور جامع فہرست جاری فرمائی تو اس میں داڑھی کی سنت کو شامل نہیں کیا اور اسے اس فہرست سے غائب کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ:

> ''سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے، جسے نبی نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد، اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ، اپنے ماننے والوں میں، دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے:
>
> (1) اللہ کا نام لے کر، اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے مواقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) جانوروں کا تذکیہ۔ (ذبح کرنا)۔ (6) نکاح۔ (7) نکاح کا خطبہ۔ (8) مونچھیں پست رکھنا۔ (9) زیرِ ناف کے بال مونڈنا۔ (10) بغل کے بال صاف کرنا۔ (11) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (12) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (13) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ (14) استنجا۔ (15) غسلِ جنابت۔ (16) میت کا غسل۔ (17) تجہیز و تکفین۔ (18) تدفین۔ (19) وضو۔ (20) تیمّم۔ (21) اذان۔ (22) اقامت۔ (23) نماز کے لیے مساجد کا اہتمام۔ (24) شب و روز کی پانچ لازمی نمازیں۔ (25) نمازِ جمعہ۔ (26) نمازِ عیدین۔ (27) نمازِ جنازہ۔ (28) روزہ۔ (29) اعتکاف۔ (30) عید الفطر۔ (31) صدقۂ عید الفطر۔ (32) زکوٰۃ۔ (33) ہدی۔ (34) طواف۔ (35) حرمین شریفین کی حرمت۔ (36) اشہرِ حرم۔ (37) حج و عمرہ۔ (38) عید الاضحیٰ۔ (39) عید الاضحیٰ کی قربانی۔ (40) ایامِ تشریق میں نمازوں کے بعد تکبیریں۔
>
> سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار

سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی، اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں، اُمت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔"(1)

اس کے بعد اپریل 2002ء میں غامدی صاحب نے چالیس (40) سنتوں کے اس (مختصر) دین کو صرف ستائیس (27) سنتوں میں تبدیل کر کے اسی دین کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر لیا۔

سنتیں جب گھٹ گئیں تو دین کامل ہو گیا، چنانچہ سنتوں کی ایک اور فہرست جاری فرماتے ہوئے لکھا:

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے، جسے نبی نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد، اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ، اپنے ماننے والوں میں، دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے:
(1) اللہ کا نام لے کر، اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے مواقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) مونچھیں پست رکھنا۔ (6) زیرِ ناف کے بال مونڈنا۔ (7) بغل کے بال صاف کرنا۔ (8) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (9) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (10) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ (11) استنجا۔ (12) حیض ونفاس میں زن وشوہر کے تعلق سے اجتناب۔ (13) حیض ونفاس کے بعد غسل۔ (14) غسل جنابت (15) میت کا غسل- (16) تجہیز وتکفین۔ (17) تدفین۔ (18) عیدالفطر- (19) عیدالاضحیٰ۔ (20) اللہ کا نام لے کر

1- ماہنامہ اشراق، شمارہ مئی 1998 ص35

جانوروں کا تذکیہ۔(21) نکاح وطلاق اور ان کے متعلقات۔(22) زکوۃ اور اس کے متعلقات۔(23) نماز اور اس کے متعلقات۔(24) روزہ اور صدقۂ فطر۔(25) اعتکاف۔(26) قربانی۔(27) حج وعمرہ اور ان کے متعلقات۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔''[1]

پھر بارہویں ایڈیشن میں سنتوں کی مزید تعداد کم ہوکر صرف سترہ (17) سنتیں رہ گئی ہیں۔[2]

2۔قرآن وسنت کے مقدّم ومؤخّر ہونے میں موقف:

چنانچہ وہ ایک جگہ قرآن کو ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر شخص پابند ہے کہ اس (قرآن) پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے۔''[3]

پھر اسی کتاب ''میزان'' میں آگے چل کر سنت کو قرآن سے مقدم قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے۔''[4]

3۔کبھی قرآن میزان اور کبھی سنت میزان ہے:

غامدی صاحب کبھی صرف قرآن کو میزان قرار دیتے ہیں اور کبھی اس کے ساتھ سنت کو بھی میزان ٹھہراتے ہیں۔کبھی ایک میزان اور کبھی دو میزان:

''قرآن میزان ہے، چنانچہ تولنے کے لئے یہی ہے، اس دنیا میں کوئی چیز ایسی

1- میزان ص10 طبع دوم اپریل 2002ء

2- میزان ص14 طبع دوازدہم، فروری 2019ء

3- میزان ص24 طبع دوازدہم، فروری 2019ء

4- میزان ص48 طبع دوازدہم، فروری 2019ء

نہیں ہے جس پر اسے تولا جا سکے۔"[1]

"ہر چیز اب اسی میزان (قرآن) پر تولی جائے گی۔"[2]

مگر دوسرے موقع پر صرف قرآن ہی میزان نہ رہا بلکہ قرآن کے ساتھ سنت بھی میزان بن گئی، چنانچہ "اشراق" جس کے مدیر غامدی صاحب ہیں، میں یہ اشتہار عرصے تک چھپتا رہا کہ:

"قاری محترم! اشراق ایک تحریک ہے، علمی تحریک فکر ونظر کو قرآن وسنت کی میزان میں تولنے کی تحریک"۔[3]

4۔ سنت کے متعلق موقف:

(الف) سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے، یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں، علم وعقیدہ، تاریخ، شان نزول اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا علمی نوعیت کی کوئی چیز بھی سنت نہیں ہے، اس کا دائرہ کرنے کے کام ہیں، اس دائرے سے باہر کی چیزیں کسی طرح شامل نہیں کی جا سکتیں۔[4]

(ب) سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔[5]

(ج) سنت، خبرِ واحد سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ اجماع اور عملی تواتر سے ثابت ہوتی ہے۔[6]

1- میزان ص 24 طبع دوازدہم، فروری 2019ء

2- میزان ص 24 طبع دوازدہم، فروری 2019ء

3- ماہنامہ اشراق، بابت اپریل مئی جون جولائی، اگست، اکتوبر نومبر اور دسمبر 1991ء

4- میزان ص 59-60، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

5- میزان ص 14، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

6- میزان ص 62، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

5۔حدیث کے متعلق موقف:

(الف)''اس (حدیث) سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔''[1]

(ب)''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبارِ آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنھیں اصطلاح میں ''حدیث'' کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحبِ علم انھیں ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک یہ کہ رسول اللہ نے ان کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔ دوسری یہ کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی علمِ یقین کے درجے تک نہیں پہنچتا۔''[2]

(نوٹ: میزان کے بارہویں ایڈیشن میں درج بالا عبارت کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔)

(ج) حدیث کی تبلیغ اور حفاظت کا آپ نے کوئی اہتمام نہیں فرمایا بلکہ سننے اور دیکھنے والوں کے لیے چھوڑ دیا کہ چاہیں تو انہیں آگے پہنچائیں اور چاہیں تو انہیں چھوڑ دیں لہذا حدیث سے دین میں کوئی عقیدہ اور عمل ثابت نہیں ہوتا۔[3]

غامدی کے مزید گمراہ کن وعجیب نظریات

☆ قرآن پاک کی صرف ایک ہی قراءت صحیح ہے:

چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن کی ایک ہی قراءت ہے جو ہمارے مصاحف میں ثبت ہے، اس کے علاوہ اس کی جو قراءت تفسیروں میں لکھی ہوئی ہیں یا مدرسوں میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں، یا بعض علاقوں میں لوگوں نے اختیار کر رکھی ہیں، وہ سب اسی فتنۂ عجم کی باقیات ہیں جن کے اثرات سے

1- میزان ص62، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

2- میزان، حصہ دوم، ص68، طبع اپریل 2002ء

3- میزان ص15، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

ہمارے علوم کا کوئی شعبہ، افسوس ہے کہ محفوظ نہ رہ سکا''۔[1]

☆ شادی شدہ زانی کے لیے سزائے رجم نہیں ہے:

غامدی صاحب نے شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی شرعی سزا (حد) ہونے کا بھی انکار کیا ہے، حالانکہ یہ سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ چنانچہ سورۃ النور، آیت 2 میں ہے:

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ[2]

''زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو''، کے حکم کو عام حکم مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

''زانی خواہ کنوارا ہو یا شادی شدہ دونوں کے لیے اسلام میں صرف سو کوڑوں کی سزا مقرر ہے اور شریعت میں شادی شدہ زانی کے لیے رجم (سنگساری) کی سزا نہیں ہے۔''

''کوئی زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ دونوں کی اصل سزا تو جلد (تازیانہ) ہی ہے۔''[3]

''تعجب ہوتا ہے کہ یہ اصحابِ عقل وبصیرت آخر کس طرح فرض کر لیتے ہیں کہ قرآن میں تو لامحالہ صرف کنوارے زانیوں ہی کی سزا بیان ہوئی ہے، رہے شادی شدہ زانی تو اُن کی سزا چونکہ عقل وحکمت اور عدل وانصاف کی رُو سے زیادہ ہونی چاہیے اس لیے قرآن سے نہ بھی ملے تو کسی اور جگہ سے تلاش کر کے وہ ان پر نافذ کر دینی چاہیے۔''[4]

1- میزان صفحہ 32، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

2- پارہ 18، سورۃ النور، آیت 2

3- میزان، حصہ اوّل، صفحہ 183، طبع مئی 1985ء

4- میزان، حصہ اول، صفحہ 168، طبع مئی 1985ء

''لغتِ عرب سے واقف کوئی شخص اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ، الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي کے الفاظ سے محض کنوارا زانی اور کنواری زانیہ بھی مراد لیے جاسکتے ہیں''۔ (1)

(نوٹ: میزان کے بارہویں ایڈیشن میں درج بالا تین اقتباسات کوحذف کردیا گیا ہے۔)

''موت کی سزا قرآن کی رُو سے ''قتل'' اور ''فساد فی الارض'' کے سوا کسی جرم میں بھی نہیں دی جاسکتی، اللہ تعالیٰ نے پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ان دو جرائم کو چھوڑ کر، فرد ہو یا حکومت یہ حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کی جان کے درپے ہو اور قتل کر ڈالے، مائدہ میں ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (2)

(ترجمہ:) ''جس نے کسی کو قتل کیا، اس کے بغیر کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو اس نے گویا سب انسانوں کو قتل کیا۔'' (3)

☆ مرتد کے لیے قتل (سزائے موت کا حکم) شرعی سزا نہیں ہے:

اس بارے میں اُن کا موقف یہ کہ مرتد کے لئے قتل کی سزا کا حکم تو ثابت ہے مگر یہ صرف رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے اُن مشرکین عرب کے ساتھ خاص ہے جو اسلام قبول کر لینے کے بعد ارتداد اختیار کریں، باقی اور کسی قسم کے مرتد کے لیے قتل کی شرعی سزا کا کوئی وجود نہیں، غامدی صاحب اپنے اس موقوف کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ارتداد کی سزا کا یہ مسئلہ محض ایک حدیث کا مدعا، نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، ابن عباس کی روایت ہے، یہ حدیث بخاری میں اس طرح نقل ہوئی ہے:

1- میزان، حصہ اول، صفحہ 135، طبع مئی 1985ء

2- سورہ مائدہ، 5/32

3- میزان صفحہ 612، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

''من بدل دینه فاقتلوه''(1)

ترجمہ: ''جو شخص اپنا دین تبدیل کرے، اسے قتل کردو''۔

ہمارے فقہا اسے بالعموم ایک حکمِ عام قرار دیتے ہیں جس کا اطلاق ان کے نزدیک ان سب لوگوں پر ہوتا ہے جو زمانۂ رسالت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر کہیں بھی اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں گے۔

اُن کی رائے کے مطابق ہر وہ مسلمان جو اپنی آزادانہ مرضی سے کفر اختیار کرے گا، اسے اس حدیث کی رُو سے لازماً قتل کر دیا جائے گا، اس معاملے میں ان کے درمیان اگر کوئی اختلاف ہے تو بس یہ کہ قتل سے پہلے اسے توبہ کی مہلت دی جائے گی یا نہیں اور اگر دی جائے گی تو اس کی مدت کیا ہونی چاہیے؟ فقہائے احناف البتہ، عورت کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ہر مرتد کی سزا خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اسلامی شریعت میں قتل ہے۔(2)

مزید کہ:

''لیکن فقہاء کی یہ رائے محلِ نظر ہے، رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم تو بیشک ثابت ہے مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی حکمِ عام نہ تھا بلکہ صرف انہی لوگوں کے ساتھ خاص تھا، جن میں آپ کی بعثت ہوئی اور جن کے لیے قرآن مجید میں ''اُمیین مُشرکین'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے''۔(3)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے فقہا کی غلطی یہ ہے کہ اُنھوں نے قرآن وسنت کے باہمی ربط سے اس حدیث کا مدعا سمجھنے کے بجائے اسے عام ٹھہرا کر ہر مرتد کی سزا موت قرار

1- بخاری، باب حکم المرتد والمرتدۃ، حدیث نمبر:6922

2- برہان، صفحہ 139، طبع ششم فروری 2009ء

3- برہان، صفحہ 140، طبع ششم فروری 2009ء

دی اور اس طرح اسلام کے حدود و تعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کر دیا، جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں ہے۔''(1)

☆ اسلام میں دیت کی مقدار مقرر نہیں:

اسلام میں دیت کی مقدار مقرر نہیں ہے اور یہ کہ عورت اور مرد کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اسلام نے دیت کی کسی خاص مقدار کا ہمیشہ کے لیے تعین کیا ہے، نہ افراد کے لحاظ سے دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھہرائی، عورت کی دیت، اس زمانے کے اربابِ حل وعقد اگر چاہیں تو پوری مقرر کر سکتے ہیں۔''(2)

☆ کفار کے خلاف جہاد وقتال (کا حکم اب باقی) نہیں ہے:

چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اُنہیں (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو) قتال کا جو حکم دیا گیا، اس کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمامِ حجّت سے ہے۔''(3)

''یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرینِ حق (کافروں) کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔''(4)

غامدی فکر وتحقیق کے چند شاہکار ملاحظہ کیجئے:

1- برہان، صفحہ 143، طبع ششم فروری 2009ء

2- میزان، صفحہ 624، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

3- میزان، صفحہ 581، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

4- میزان صفحہ 602، طبع دوازدہم، فروری 2019ء

☆ مرزا غلام احمد قادیانی، غلام احمد پرویز سمیت کوئی بھی کافر نہیں، کسی بھی امتی کو کسی کی تکفیر کا حق نہیں ہے۔(1)

☆ اجماع، دین میں بدعت کا اضافہ ہے۔(2)

☆ ہر آدمی کو اجتہاد کا حق ہے، اجتہاد کی اہلیت کی کوئی شرائط متعین نہیں، جو سمجھے کہ اسے ''تفقہ فی الدین'' حاصل ہے وہ اجتہاد کر سکتا ہے۔(3)

☆ تصوف عالم گیر ضلالت اور اسلام سے متوازی ایک الگ دین ہے۔(4)

☆ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ باغی اور یزید بہت متحمل مزاج اور عادل بادشاہ تھا، واقعۂ کربلا سو فیصد افسانہ ہے۔(5)

☆ مسلم وغیر مسلم اور مرد وعورت کی گواہی میں فرق نہیں ہے۔(6)

☆ زکوٰۃ کے نصاب میں ریاست کو تبدیلی کا حق حاصل ہے۔(7)

☆ یہود و نصاریٰ کے لیے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا ضروری نہیں، اِس کے بغیر بھی اُن کی بخشش ہوجائے گی۔(8)

☆ موسیقی فی نفسہ جائز ہے۔(9)

1- اشراق، اکتوبر 2008، ص:67

2- اشراق، اکتوبر 2011، ص:2

3- سوال و جواب، ہٹس 612، تاریخ اشاعت: 10 مارچ 2009

4- برہان، ص: 181، 192، طبع 2009

5- غامدیت کیا ہے؟ از مولانا عبدالرحیم چار یاری

6- برہان، ص: 25 تا 34، طبع فروری 2009

7- اشراق، جون 2008، ص:70

8- ایضاً

9- اشراق، فروری 2008، ص:69

☆ بت پرستی کے لیے بنائی جانے والی تصویر کے علاوہ ہر قسم کی تصویریں جائز ہیں۔(1)

☆ بیمہ (انشورنس) جائز ہے۔(2)

☆ یتیم پوتا، دادے کی وراثت کا حق دار ہے۔

☆ مرنے والے کی وصیت ایک ثلث (تہائی) تک محدود نہیں۔

☆ وارثوں کے حق میں بھی وصیت درست ہے۔(3)

☆ سؤر کی نجاست صرف گوشت تک محدود ہے، اس کے بال، ہڈیوں، کھال وغیرہ سے دیگر فوائد اٹھانا جائز ہے۔(4)

☆ اگر کہیں قرآن کا ٹکراؤ یہود ونصاریٰ کے فکر وعمل سے ہوگا تو قرآن کے بجائے یہود و نصاریٰ کے متواتر عمل کو ترجیح ہوگی۔(5)

☆ عورت، مردوں کی امامت کرا سکتی ہے۔(6)

☆ دوپٹہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس کے بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے، دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے اس کا کوئی جواز نہیں۔(7)

☆ مسجدِ اقصیٰ پر مسلمانوں کا نہیں، اس پر صرف یہودیوں کا حق ہے۔(8)

1- اشراق، مارچ، 2009، ص: 69

2- اشراق، جون 2010، ص: 2

3- اشراق، مارچ 2008، ص: 63۔ مقامات: 140، طبع نومبر 2008

4- اشراق، اکتوبر 1998، ص: 89

5- میزان، ص: 14، طبع 2014

6- ماہنامہ اشراق، ص 35 تا 46، مئی 2005

7- ماہنامہ اشراق، ص 47، شمارہ مئی 2002

8- اشراق جولائی، 2003 اور مئی، جون 2004

☆ بغیر نیت، الفاظِ طلاق کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ (1)

☆ سنت صرف افعال کا نام ہے، اس کی ابتدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں بلکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوتی ہے۔ (2)

☆ دین میں معروف (اچھائی) ومنکر (برائی) کا تعین فطرتِ انسانی کرتی ہے۔ (3)

☆ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت (انتقال) کے بعد کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ (4)

☆ زکوٰۃ کا نصاب منصوص اور مقرر نہیں ہے۔ (4)

☆ یہ (شراب نوشی کی سزا) شریعت، ہرگز نہیں ہوسکتی۔ (5)

☆ غیر مسلم بھی مسلمانوں کے وارث ہوسکتے ہیں۔ (6)

☆ سؤر کی کھال اور چربی وغیرہ کی تجارت اور ان کا استعمال شریعت میں ممنوع نہیں ہے۔ (7)

☆ یاجوج ماجوج اور دجال سے مراد مغربی اقوام ہیں۔ (8)

☆ اسلام میں جہاد وقتال کا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ (9)

1- اشراق، جون 2008، ص: 65

2- میزان ص 10، 65، طبع دوم

3- میزان، ص 48، طبع دوازدہم

4- ماہنامہ اشراق، دسمبر 2000، ص 55، 54

4- قانون عبادات، ص 119

5- برہان ص 138، طبع ششم، فروری 2009ء

6- میزان ص 171، طبع دوم، اپریل، 2002

7- ماہنامہ اشراق، اکتوبر 1998ء ص 79

8- ماہنامہ اشراق، جنوری، 1996ء، ص 61

9- میزان، ص 264، طبع دوم، اپریل 2002

☆ کفار کے خلاف جہاد کرنے کا حکم اب باقی نہیں رہا اور مفتوح کافروں سے جزیہ لینا جائز نہیں۔ (1)

غامدی صاحب کی اسلام میں رخنہ اندازی کا خلاصہ:

☆ غامدی صاحب صرف اشکالات اٹھانا جانتے ہیں۔

☆ ان کی فکر میں ٹھہراؤ نہیں ہے، ارتقاء پذیر ہے، ان کی کتابوں کے ہر نئے ایڈیشن میں یا تو ان کی رائے بدل جاتی ہے، یا کسی عبارت کو حذف کر چکے ہوتے ہیں۔

☆ کوئی بھی تحقیق ان کی اپنی نہیں ہے، زیادہ تر چیزیں انہوں نے اپنے استاذ 'امین احسن اصلاحی' سے مستعار (ادھار) لی ہیں، دوسری شخصیت 'وحید الدین خان' کی ہے، تیسری روایات کے حوالے سے بیشتر دلائل حبیب الرحمان کاندھلوی کے ہیں، کافی دلائل من وعن مولانا کی کتاب ''مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت'' سے اٹھائے گئے ہیں، چوتھی اور سب سے عجیب تر بات، خاص کر نزولِ مسیح کے موضوع پر غامدی صاحب کے تمام دلائل مرزا غلام احمد قادیانی 'مردود سے ماخوذ ہیں، پانچویں معجزات میں غامدی صاحب سرسید' کی تفسیر سے استفادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ (اگر اسی کو فکری کام کہتے ہیں تو کچھ مشکل نہیں آپ لکھنا جانتے ہیں تو قدیم وجدید اہلِ علم کی کتابوں سے مواد لیجیے اور اپنے نام سے چھاپ دیجیے، آپ بھی ''مجدّدِ دوراں'' اور ''فقیہِ وقت'' بن جائیں گے۔)

☆ غامدی صاحب کے بہت سے نظریات قرآن وحدیث کی صریح نصوص کے خلاف اور اہلِ سنت وجماعت کے اجماعی واتفاقی عقائد سے متصادم ہیں۔

☆ غامدی صاحب تحریکِ استشراق کا اسلامی نمونہ ہیں۔

☆ ان کی فکر سخت تضادات کا شکار ہے۔

سوال: اگر کوئی کہتا ہے کہ، غامدی صاحب مسلم امت کے مذہبی فکر کی ''تشکیلِ نو'' کر رہے

1- میزان ص270، طبع دوم اپریل 2002ء

ہیں، جس کے اثرات مستقبل میں بہت وسیع و عمیق ہوں گے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ:
کسی بھی مفکّر کے ماننے والوں کا معیار اور رویّہ اس مفکر کی فکری خوبی یا خامی کو واضح کر دیتا ہے، تھوڑا غور کریں تو ایک ایسی جنریشن (generation) جو حقیقت میں دین سے ناواقف ہے، سلف (بزرگوں) سے دور ہے اور مغرب سے مرعوب و مرغوب ہے۔

یہ غامدی صاحب کی کل کمائی (پیروکار) ہے، مزید یہ کہ، غامدی صاحب کے کارنامے کم از کم موجودہ حالات میں عوام میں کبھی بھی پذیرائی نہیں پا سکتے، اس کام کو جتنا عوامی کیا جائے گا، مخالفت اور پروپیگنڈے کی شدت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا!

یہ بات جناب غامدی صاحب پورے شعور کے ساتھ سمجھتے ہیں! لیکن غامدی صاحب یہ بھی جانتے ہیں کہ، نئے اسلام (مغرب زدہ اسلام) کی ترویج و اشاعت کے لئے، غامدی صاحب کا یہ (فسادی) کام ریفرنس کے طور پر آنے والی صدیوں میں استعمال ہوگا، اس وقت تک ہم عصروں کی فطری اور تاریخی چپقلش (مخالفت) بھی دم توڑ چکی ہوگی، دوسرا غامدی صاحب وفات پا کر مقدس بھی ہو چکے ہوں گے اور متقدمین کی لسٹ کے ممبر بھی بن چکے ہوں گے، یوں اسلام میں رخنہ اندازی تکمیل کو پہنچے گی، اس گناہِ بےلذت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ، غامدی صاحب مستقبل میں ''عظیم الشان مفکر اور محسنِ اسلام'' شمار ہوں گے۔

اتنا کچھ کافی ہے، یہ معلوم کرنے کیلئے کہ غامدی صاحب کون سی تحقیق فرما رہے ہیں؟! اور ان کی زندگی کی جد و جہد کا مقصود کیا ہے؟؟

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

انکارِ حدیث کی چند بڑی وجوہات

منکرینِ حدیث میں فکری ٹیڑھا پن اچانک نہیں آیا، بلکہ اسلامی علمی بنیادوں کو ترک کرنا اور دنیاوی و اخروی ترجیحات کا تبدیل ہونا، انہیں یہاں تک لے آیا، لیکن وہ معذور نہیں ہیں۔ چند وجوہات درج ذیل ہیں:

1۔ مستشرقین کی خوشہ چینی:

مستشرقین نے مسلمانوں کے بنیادی عقائد کو متزلزل کرنے کے لئے حدیثِ رسول ﷺ کے بارے میں مختلف شکوک وشبہات اور بے بنیاد اعتراضات پیش کر کے حدیث پر مسلمانوں کے اعتماد کو ختم کرنے کی سرتوڑ کوششیں کیں، جس کے اثرات منکرینِ حدیث پر بھی پڑے، یہی وجہ ہے کہ حدیث کے بارے میں یہاں کے منکرینِ حدیث کے بڑے بڑے شبہات اور مستشرقین کے شبہات میں مماثلت پائی جاتی ہے، مثلاً: حدیث کے متعلق اگر گولڈ زیہر (Gold Ziher)، سپرنگر (Sprenger) اور ڈوزی (Dozy) کے لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ منکرینِ حدیث کی طرف سے کئے جانے والے بڑے بڑے اعتراضات من وعن وہی ہیں جو ان مستشرقین نے کئے ہیں اور عجیب بات ہے کہ موجودہ دور کے منکرینِ حدیث نے بھی اپنا ماخذ ومرجع انہی دشمنانِ اسلام، مستشرقین کو بنایا ہے اور یہ حضرات انہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

2۔ برطانوی سامراج کی سازشیں:

ہندوستان پر انگریز حکومت کی مکمل عملداری اور 1857ء کی جنگِ آزادی میں کامیابی کے بعد، انگریز مسلمانوں کو اپنی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنانے لگے؛ کیونکہ انہوں نے مسلمان حکمرانوں سے حکومت چھینی تھی اور انہیں ہر وقت مسلمانوں کی طرف سے مزاحمت کا خطرہ رہتا تھا، مزید جنگِ آزادی میں مسلمانوں نے انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا تھا، لہٰذا وہ

مسلمانوں کو ہر میدان میں کچلنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کی اپنے بنیادی عقائد کے ساتھ مکمل وابستگی اور آپس کا اتحاد تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے مسلمانوں کو دینی اعتبار سے کمزور کرنے کے لئے مختلف سازشیں شروع کردیں، مثلاً: مسلمانوں میں فرقہ بندی کو ہوا دی، انکارِ ختمِ نبوت اور انکارِ حدیث کی راہ کھولی۔

انگریزوں نے ان فتنوں کی مکمل پشت پناہی کی، تیرہویں صدی میں یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا جب کہ مسلمان ہر میدان میں پٹ چکے تھے، ان کے اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی تھی، ان کے ملک پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور ان کو معاشی حیثیت سے بُری طرح کچل ڈالا گیا تھا، ان کا نظامِ تعلیم درہم برہم کردیا گیا تھا اور ان پر فاتح قوم نے اپنی تعلیم، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے قوانین، اور اپنے اجتماعی وسیاسی اور معاشی اداروں کو پوری طرح مسلط کردیا تھا۔

ان حالات میں جب مسلمانوں کو فاتحین کے فلسفہ وسائنس اور ان کے قوانین اور تہذیبی اُصولوں سے سابقہ پیش آیا تو قدیم زمانے کے معتزلہ کی بہ نسبت ہزار درجہ زیادہ سخت مرعوب ذہن رکھنے والے معتزلہ ان کے اندر پیدا ہونے لگے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب سے جو نظریات، جو افکار وتخیلات، جو اُصولِ تہذیب وتمدن اور جو قوانین حیات آرہے ہیں، وہ سراسر معقول ہیں۔ ان پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقید کرکے حق وباطل کا فیصلہ کرنا محض تاریک خیالی ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی صورت بس یہ ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال دیا جائے۔

3۔ دنیاوی اغراض ومقاصد کا حصول:

انکارِ حدیث کی ایک وجہ اغراض ومقاصد کا حصول بھی ہے جن کی خاطر جان بوجھ کر منکرینِ حدیث اس گمراہی کے مرتکب ہوئے، چنانچہ مولانا محمد قطب الدین لکھتے ہیں:

"منکرینِ حدیث اور ان کے پیشوا علمائے یہود کی مانند محض دنیوی اغراض و مفادات کے لئے دیدہ و دانستہ 'کتمانِ حق' بھی کرتے ہیں اور التباسِ حق و

باطل بھی۔"(1)

پروفیسر محمد فرمان نے انکارِحدیث کی مختلف وجوہات کا احاطہ درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"ہمیں یہ تسلیم ہے کہ بعض لوگوں نے دنیاوی جاہ ومنصب کے لئے حدیث کو نشانہ بنا رکھا ہے۔بعضوں نے کسی محبوب کا اشارہ پا کر یہ تحریک شروع کر رکھی ہے بعضوں نے کم علمی اور اسلام کے سطحی مطالعہ کی بنیاد پر یہ روش پسند کر لی ہے۔"(2)

4۔عقل کو معیار بنانا،عقل پرستی،ریشنل ازم(Rationalism):

ریشنل ازم(Rationalism) مذہب کے تصورِ "ایمان(Faith)" کے ردِّعمل میں ایک باقاعدہ تحریک کے طور پر یورپ میں سرگرم ہوا اور اس کے قوی اثرات مسلسل چلے آرہے ہیں۔

انکارِحدیث کا فتنہ بھی چونکہ مغرب کی علمی مرعوبیت کا شاخسانہ ہے، اسلئے یہاں بھی عقل پسندی کے گہرے رجحانات پائے جاتے ہیں، اکثر منکرینِ حدیث نے احادیث کو تسلیم کرنے میں عقلی حجت بازیاں کی ہیں اور احادیث کی صحت جانچنے کیلئے یہ اُصول متعارف کرایا ہے کہ، وہی احادیث قابل قبول ہیں جو عقل انسانی کو اپیل کرتی ہیں۔

اسلام میں عقل کو استعمال کرنے،اس پر اعتماد کرنے اور اس کی نشوونما کرنے کی بڑی ترغیب ملتی ہے،لیکن اس کی بعض مقام پر حدود بندی کی گئی ہے،اور اسے حق تک پہنچنے کا راستہ بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ یہ حتمی معیار(Standard) نہیں ہے۔

1- محمد قطب الدین،مولانا،مظاہر حق،1966ء،ج1،دیباچہ کتاب

2- محمد فرمان، پروفیسر،انکارِحدیث ایک فتنہ ایک سازش، گجرات،مکتبہ مجددیہ نور پور شرقی،1964ء ص209

ایک مسلمان عقل پر بے جا اعتماد کرنے کے بجائے اپنی عقل کو خالقِ کائنات کی رہنمائی میں چلانے کا پابند ہے اور وہ اپنی عقل کو اس حد تک آزاد نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے خالق اور اس کی ہدایات پر بھی اعتراضات کرنا شروع کردے؛ کیونکہ بہت سے دائرے ایسے ہیں جہاں انسانی عقل بے بس ہوجاتی ہے، مثلاً: حسن وقبح (Good and Evil) کی پہچان میں عقل بے بس ہے۔

وحی کی تشریح میں عقل وبصیرت کو استعمال کرنا اسلام کا مطلوب ہے جبکہ وحی پر اعتراض کے میدان میں عقل کو کھڑا کرنا، عقل کے ساتھ ظلم اور اپنے خالق کی ہدایات کے ساتھ ناانصافی ہے۔

موجودہ دور کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ اُسلوبِ استدلال کی تبدیلی کا ہے، اسلام میں استدلال کا اسلوب تو یہ ہے کہ جہاں فرمانِ الٰہی یا حدیثِ نبوی آجائے تو اس کی استنادی حیثیت کی توثیق (جانچ) کرنے کے بعد اس کے سامنے سرِتسلیم خم کردیا جائے، مزید تائید کے لئے عقلی توجیہات، منطقی صغرے کبرے ہیں، جو اطمینانِ قلبی کا موجب ہوتے ہیں، اسلام ان کی اجازت دیتا ہے لیکن اسلام میں کسوٹی بننے کا مقام بنیادی طور پر وحیِ الٰہی کو ہی حاصل ہے۔

جبکہ جدید تعلیم یافتہ حضرات استدلال کی بنیاد صرف عقلی توجیہات کو بناتے ہیں اور آخر میں تائید کی غرض سے حدیثِ نبوی یا آیتِ قرآنی بھی لے آتے ہیں، اسی اسلوب نے انکارِحدیث کا دروازہ کھولا ہے۔

5۔خواہشاتِ نفس کی پیروی:

احادیثِ نبویہ ﷺ جو قرآن مجید کے اُصول اور کلیات کی تفصیل ہیں، قدم قدم پر خواہشاتِ نفسانیہ کی پیروی میں رکاوٹ ہیں، نیز ان میں تاویل کی گنجائش بھی نہیں ہے، یہ پابندی طبیعت میں آزادی رکھنے والوں اور خواہشات کی پیروی کرنے والوں پر گراں گزرتی ہے۔

سابق منکرِ حدیث مولانا تمنا عمادی پھلواری لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کو قبول کر لینے اور باقی سارے دینی لٹریچر کو ردی قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ قرآنی آیتوں کو توڑ مروڑ کر جو مفہوم جس آیت سے چاہیں گے نکال لیں گے، جس لفظ کے چاہیں گے معنی حقیقی کی جگہ مجازی لے لیں گے، جس واقعے کو چاہیں گے خواب کا واقعہ کہہ دیں گے، جس عبارت میں ضمیر جدھر چاہیں گے پھیر دیں گے، جس اسمِ اشارہ کا جس کو چاہیں گے مشار الیہ قرار دیں گے، جس لفظ کے متعدد معانی لغت والوں نے لکھے ہیں، ان میں سے جو معنیٰ چاہیں گے حسبِ دلخواہ مراد لے لیں گے، اس طرح قرآن مجید کی آیتوں کو اپنے منشا اور اپنی اغراض کے تابع رکھنے کی پوری آزادی حاصل رہے گی۔

دوسروں نے کیا لکھا ہے اس کو دیکھنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ دوسرے تو سب کسی نہ کسی فرقے کے ہیں اور فرقہ وارانہ روایات کے پابند ہیں اور یہاں روایات کے اتباع کو گمراہی بلکہ شرک سمجھتے ہیں؛ اس لیے ان ''مشرکین'' کی تفسیروں اور ترجموں کو دیکھنا بھی گناہ ہے۔

ہاں! ان میں سے اگر کسی کا کوئی قول ایسا مل جائے جس سے اپنے خیال کو تقویت ہو تو البتہ اس کو پیش کریں گے بلکہ ضعیف سے ضعیف روایت اور کسی منافق راوی کا قول بھی اپنے موافق مل جائے گا، تو اس کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کریں گے اور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: (وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ) ''ہم نے ضرور اس قرآن کو آسان کر دیا ہے'' تو پھر انسان کے سمجھنے میں دشواری کیوں ہوگی؟ ہم جو مطلب جس آیت کا سمجھے ہیں صحیح ہی سمجھے ہیں۔ آسان بات کے سمجھنے میں غلطی نہیں ہو سکتی، مگر قرآنی آیات کو سمجھنے کی کوشش کب کی جاتی ہے؟ ساری کوششیں تو آیات سے اپنے موافق مفہوم پیدا

کرنے کے لیے ہوتی ہیں''۔ (1)

حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا اوّلین مقصد نفسانی خواہشوں کا کچلنا اور پامال کرنا تھا؛ اس لئے کہ شہوتوں کو آزادی دینے سے دین اور دنیا دونوں ہی تباہ ہو جاتے ہیں؛ اس لیے منکرینِ حدیث نے ان دو متضاد راہوں میں تطبیق کی ایک نئی راہ نکالی، وہ یہ کہ حدیث کا تو انکار کر دیا جائے جو ہماری آزادی میں سدِ راہ ہے، اور مسلمان کہلانے کے لیے قرآنِ کریم کا اقرار کر لیا جائے؛ کیونکہ قرآن کریم ایک اُصولی اور قانونی کتاب ہے، اس کی حیثیت ایک دستورِ اساسی کی ہے کہ جو زیادہ تر اُصول وکلیات پر مشتمل ہے۔ جس میں ایجاز اور اجمال کی وجہ سے تاویل کی گنجائش ہے اور احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اقوالِ صحابہ میں ان اصول اور کلیات کی شرح اور تفصیل ہے، اس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔

اس لیے اس گروہ نے حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو انکار کر دیا اور مسلمان کہلانے کے لیے قرآنِ کریم کو مان لیا اور اس کے مجملات اور موجز (مختصر کیے ہوئے) کلمات میں ایسی من مانی تاویلیں کیں کہ جس سے ان کے اسلام اور یورپ کے کفر اور الحاد میں کوئی منافات ہی نہ رہی۔

6۔کم علمی اور جہالت:

برِصغیر کے منکرینِ حدیث کے لٹریچر کے مطالعہ اور حدیث کے بارے میں ان کے خود ساختہ اور من گھڑت شبہات اور اعتراضات کو دیکھ کر اس چیز کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ، وہ نہ تو علمِ حدیث پر عبور رکھتے ہیں اور نہ ہی علومِ قرآنی کی گہرائیوں سے واقف ہیں، چونکہ قرآن وسنت اور ان کے مستند ماٗخذ تک منکرینِ حدیث کی رسائی نہیں، لہٰذا ان کی توجیہ بھی ان کے بس کا روگ نہیں ہے؛ یہی وجہ ہے کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کرنے لگتے ہیں۔

1- علاّمہ تمنا عمادی مطبوعہ ماہنامہ ''فاران'' (کراچی) جنوری 1971

7۔ تدوینِ حدیث پر عدمِ اعتماد:

بعض منکرینِ حدیث ایسے ہیں جو احادیث کی تدوین پر عدمِ اعتماد کی وجہ سے کلی طور پر احادیثِ نبوی کو قبول نہیں کرتے۔ قرآن جو حدیث کی بنسبت اعلیٰ معیار پر محفوظ ہے، وہ دونوں کی استنادی حیثیت میں بنیادی فرق ملحوظ رکھے بغیر، دونوں کے لئے یکساں اسلوب اور برابری کے درجے کی حفاظت کا تقاضا کرتے ہیں۔

حالانکہ قرآن کلامِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے ''الفاظ کی حفاظت'' کا اسلوب چاہتا ہے، جبکہ احادیث مرادِ الٰہی ہونے کے ناطے ''مفہوم کی حفاظت'' کا تقاضا کرتی ہیں۔

اسی طرح منکرینِ حدیث موجودہ حالات پر قیاس کرتے ہوئے صحیح تجزیہ کئے بغیر، برسوں قبل کے حالات کو اپنے دور کے اندازوں کے مطابق پرکھنا چاہتے ہیں۔

دورِ نبوت میں حفاظت کے تقاضوں کو آج کے دور کے حفاظت کے تقاضوں سے پرکھنا بہت بڑی علمی غلطی ہے یا علمی خیانت ہے۔ موجودہ دور میں اگر کتابت کو حفاظت کا معتمد ذریعہ مانا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیشہ سے کتابت ہی معتمد اور مستند ترین ذریعہ چلا آرہا ہو۔ بلکہ شاید بہت جلد انفارمیشن ٹیکنالوجی، کتابت کی بھی حیثیت ختم کردے۔

دین کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ذریعے اس طرح سادہ انداز میں پوری کرائی ہے، جو ہر دور میں حفاظت کا آسان انداز رہا ہے اور اس پر عمل کرنا، اس کے تقاضے بجا لانا انسانوں کے لئے بآسانی ممکن رہا ہے۔ چنانچہ ابتدا میں قرآن وحدیث کو بحفاظت آگے منتقل کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ بنیادی طور پر ''حافظہ پر اعتماد'' کا طریقہ ہے، جس کو بعد میں کتابت اور دیگر ذرائع سے بھی تقویت دی گئی ہے۔

منکرینِ حدیث نے یہ فرض کرلیا ہے کہ قرآن تو گویا ہمیشہ سے ''تحریری شکل'' میں محفوظ چلا آرہا ہے، جبکہ حدیث کی تدوین میں زیادہ اعتماد ''حافظہ'' پر رہا ہے، اس لئے

احادیث ناقابلِ اعتماد ہیں۔ جبکہ اگر معمولی غور و فکر سے بھی کام لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ موجودہ قرآن کی حفاظت بھی تحریر کی بجائے حافظہ (تلاوت و ادا) ہی کی مرہونِ منت ہے۔

ذیل میں ہم حافظہ اور کتابت کے تقابلی مطالعہ کے علاوہ ان دلائل کو پیش کرتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کی حفاظت میں بھی اصل اعتماد حافظہ' اور ادا' پر رہا ہے۔

حافظہ اور کتابت کا تقابل:

حافظہ پر اعتماد کی بنیادی وجوہات درج ذیل ہیں:

1۔ حافظہ انسان کی فطری بنیادی صلاحیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ابتدائے انسانی زندگی سے، جب فنِ کتابت وجود میں بھی نہیں آیا تھا، انسان اپنی روزمرہ یادداشت کے لئے حافظہ پر ہی اعتماد کرتا تھا۔ عرب کا حافظہ بڑا مثالی تھا حتیٰ کہ تحریر کرنے کو عیب اور حافظہ کی کمزوری سمجھا جاتا تھا۔

2۔ حافظہ کے لئے کسی آلہ یا کاغذ کی ضرورت نہیں بلکہ یہ صلاحیت ہر ذی شعور میں پائی جاتی ہے۔ دورِ نبوی میں کاغذ تو بالکل نادر، اور چمڑے وغیرہ بھی بہت کم موجود تھے۔

3۔ دورِ نبوی میں فنِ تحریر اس قدر سادہ تھا کہ آج کا حافظِ قرآن بھی اس دور کے لکھے قرآن کو نہیں پڑھ سکتا۔ اس میں نقاط اور حرکات جو عربی زبان میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں، ان کا استعمال بڑے عرصے بعد شروع ہوا۔

عالمِ عرب اور برِصغیر دونوں میں رسم الخط عثمانی میں شائع ہونے والے قرآن کے رموز وعلامات میں، آج بھی اتنا فرق ہے کہ، حفاظِ قرآن کے علاوہ دیگر پاکستانی مسلمان عربی رسم الخط میں چھپے قرآن کریم سے تلاوت میں مشکل محسوس کرتے ہیں؛ کیونکہ دونوں میں علامات اور کلمات لکھنے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

قرآن کریم کا رسم الخط ایک باقاعدہ فن ہے جس میں بعض اُمور پر علماء میں بھی اختلافات موجود ہیں۔

یہ علم دینی مدارس بالخصوص مدارسِ تجوید و قراءت میں بالتفصیل پڑھایا جاتا ہے۔

مزید برآں مختلف قراءات میں شائع شدہ قرآنِ کریم دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان مغاربہ اور مشارقہ کے طرزِ کتابت میں بھی بڑا اختلاف ہے، مثلاً: مغاربہ کے ہاں 'ن' میں نقطہ نہیں لکھا جاتا، 'ق' کے نیچے ایک نقطہ ہوتا ہے اور 'ف' بغیر نقطہ کے لکھی جاتی ہے، جبکہ اہلِ مشرق کا طرزِ کتابت اس سے مختلف ہے۔

4۔ فنِ کتابت کے متحیر العقل ارتقاء کے باوجود آج بھی حافظہ زیادہ جامع ہے۔ اس کی مدد سے ایک شے کو یاد کرنا اور اسے ادا کرنا، دونوں زیادہ آسانی سے اور بہتر طور پر مکمل ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے تلفظ اور ادائیگی کی تفصیلات کا 'فنِ کتابت' آج بھی احاطہ نہیں کرتا۔

گذشتہ برسوں میں بعض ایسے مصاحف شائع ہوئے ہیں جن میں ادائیگی کے رموز، مثلاً: اِخفاء وادغام اور مد وقصر وغیرہ کو 24 رنگوں سے نمایاں کیا گیا ہے، آج سے چند برس قبل تک اس کا تصور بھی نہیں تھا۔

اس کے باوجود آج بھی فنِ کتابت میں قرآنِ کریم کی ادائیگی کی مکمل تفصیلات محفوظ نہیں ہوسکتیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت ''تلقی واداء'' کے ذریعے ہوئی ہے جبکہ حدیث کی حفاظت ''تحمل وروایت'' کے ذریعے ہوئی۔

5۔ دورِ نبوی میں آلاتِ کتابت اور کاغذ عام میسر نہ تھے، چنانچہ عہدِ نبوی میں قرآن اگر مکمل صورت میں موجود تھا تو وہ ''حفّاظِ قرآن'' کے سینوں میں تھا، کاغذ یا چمڑے پر تو قرآن متفرق اور بکھرا ہوا تھا۔

اسی لئے محققین کے نزدیک قرآنِ کریم کی آیات کی ترتیب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ آیات کی ترتیب کے بغیر ایک مسلسل مضمون نہیں مل سکتا۔

جمہور محدثین کے ہاں ان ٹھیکریوں، چوڑی ہڈیوں اور کھجور کی چھالوں پر لکھے ہوئے قرآن کو سب سے پہلے حفّاظِ قرآن نے ہی عہدِ صدیقی میں کتابی شکل دی۔

پھر سورتوں کی مکمل ترتیب اور خاص رسم الخط میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

جمع کیا؛ لہٰذا ''جامع القرآن'' کا لقب انہی کے لئے خاص ہے۔

6۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ''حفظ وادا'' کی صورت میں ملا، نہ کہ بصورتِ کتابت، جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام اور نبی رحمت ﷺ اس کو حافظے کی مدد سے صحابۂ کرام علیہم الرضوان تک پہنچایا کرتے۔

7۔ اس امر کی شہادت بھی قرآن میں موجود ہے کہ قرآنِ کریم کی دنیا میں حفاظت کس طرح ہوئی:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ﴾ (1)

ترجمہ: ''بلکہ وہ (قرآن) تو واضح آیات ہیں جو ان لوگوں کے سینے میں محفوظ ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے۔ اور ہماری آیات سے بے انصاف لوگوں کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا''۔

8۔ قرآن کریم کی دورِ صدیقی میں تدوین کا واقعہ، خود اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت اوّلاً ''حافظہ'' کے ذریعے ہوئی، چنانچہ جب تک حفاظِ قرآن کی بڑی تعداد موجود رہی، صحابۂ کرام حفاظتِ قرآن سے مطمئن رہے۔ جب جنگِ یمامہ میں تقریباً 700 حفّاظِ قرآن صحابہ کی شہادت ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حفاظتِ قرآن کی فکر دامن گیر ہوئی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے قبل جلیل القدر صحابۂ کرام حفاظِ قرآن کی کثرت کی وجہ سے مطمئن تھے اور وہ حفاظت سینوں میں تھی، کتابت میں نہیں۔

ہمارے ذہن میں کتابت والے یہ مغالطے اس لئے جنم لیتے ہیں کہ ہم اُس دور کو اپنے موجودہ زمانے پر قیاس کرتے ہیں۔ لہٰذا اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ دورِ نبوی ﷺ میں نہ صرف حدیث بلکہ قرآن بھی ''بین الدفتین'' تدوین نہ ہوا تھا۔

1- سورۃ العنکبوت: 49

منکرینِ حدیث کا قرآن وسنت کی تدوین پر عدمِ اعتماد والا اعتراض دراصل فنِ تحریر کے موجودہ ارتقاء اور یورپی علوم کے طریقۂ حفاظت سے مرعوب ہونے کا شاخسانہ ہے، جس میں زمانوں کے بدلتے ہوئے حالات کی رعایت نہیں رکھی گئی۔

❖❖❖❖❖

منکرینِ حدیث اور علماء حق کی توہین

منکرینِ حدیث کے فاسد اعتقادات اور گمراہ کن نظریات کی تردید چونکہ علماءِ اسلام نے ہی کی اور انہیں علمی وفکری طور پر ان حضرات سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ منکرینِ حدیث کا ایک مشترکہ ہتھیار یہ بھی رہا کہ علماء کو وہ علماءِ سوء قرار دیتے ہیں اور ان کے پیش کردہ اسلامی اعتقادات کو وہ مضحکہ خیز قرار دیتے رہتے ہیں۔

علماء کی ناقدری اور ان کو نازیبا کلمات سے نوازنے میں، منکرینِ حدیث نے کوئی کسر نہیں چھوڑی، پھر عالمی میڈیا اپنی بھرپور قوت سے علماءِ اسلام کے خلاف سامراجی اَدوار سے سرگرم رہا ہے اور اس کی بھرپور مہم کا نتیجہ ہے کہ، ''مولوی اور ملّا'' جو کبھی علما کے لئے فخر تھا، اب حرفِ ملامت بن گیا اور شہروں میں کوئی بھی ایسے القاب کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔

چنانچہ منکرینِ حدیث کے لئے میدان ہموار کرنے میں بھی ان کے سرپرست مغرب نے پرزور معاونت کی اور عملاً ان کے ہاتھوں اصلاح کی بجائے الحادی تحریک اور فکری تحریف نے جنم لیا۔

❖❖❖❖❖

ناقدینِ حدیث کے بنیادی گروہ

ناقدینِ حدیث کو چھ (6) بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ ناقدینِ حدیث کا پہلا گروہ، کلاسیکی گروہ، اس گروہ کے نزدیک نبی بشر ہوتا ہے اور کسی بھی بشر کا قول مذہب اور شریعت میں حجت نہیں ہوسکتا، نبی کا کام صرف اور صرف اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہ گروہ نہ تو نبی کو ''شارحِ وحی'' کی حیثیت میں تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی ''شارع'' کی حیثیت دیتا ہے، اسی گروہ کو ''حقیقی منکرِ حدیث'' قرار دیا جا سکتا ہے۔

2۔ ناقدین کا دوسرا گروہ، ان لوگوں کا ہے کہ جن کے مطابق احادیث کا ذخیرہ محفوظ نہیں رہا؛ اس لئے یقین کے ساتھ یہ حکم لگانا ممکن ہی نہیں ہے کہ ''فلاں بات حدیث ہے اور فلاں بات حدیث نہیں''۔

ان کے نزدیک محفوظ صرف کتاب اللہ ہے اور اسے ہی حجت تسلیم کیا جا سکتا ہے، نہ تو یہ گروہ حدیث کو تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی تاریخ کو۔

3۔ ناقدینِ حدیث کا تیسرا گروہ، وہ ہے کہ جس کے نزدیک نبی کریم ﷺ، کے وہی اقوال مقبول ہیں کہ جن کی تائید قرآن کریم سے ہوتی ہے، اگر کوئی قول اس گروہ کو قرآن کریم کے مطابق دکھائی نہیں دیتا تو (وہ بھلے سند کے اعتبار سے کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو) یہ گروہ اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

4۔ ناقدینِ حدیث کا چوتھا گروہ، وہ ہے کہ جو صرف درایت (عقل) کے نام پر حدیث کو رڈ کر دیتے ہیں۔

مدار چونکہ عقل ہے، جسے عقل درست مانے وہ درست، جسے عقل غلط کہے تو وہ غلط ہے؛ لہٰذا مضبوط سند سے منقول روایات اور وہ روایات جو سند کے اعتبار سے کمزور

ہوں، وہ بھی قبول ہیں، مگر ایسی روایات بھی رد ہوسکتی ہیں کہ جن کی سند انتہائی مضبوط ہوں یا بالکل بے سند روایت ہو، گویا یہ گروہ حدیث کے حوالے سے عقل اور منطق کو فوقیت دیتا ہے۔

5۔ ناقدین حدیث کا پانچواں گروہ، وہ ہے کہ جو''خبر واحد'' کی حجیت کے منکر ہیں، یعنی اگر احادیث تواتر سے منقول ہیں تو (وہ خواہ قرآن کے موافق ہو یا مخالف ہو) قابلِ قبول ہیں، لیکن اگر تواتر نہ ہوتو مطلقاً حدیث حجت نہیں۔اس کے نتیجے میں احادیث کا وسیع ذخیرہ عبث ہوجاتا ہے۔

6۔ ناقدین حدیث کا چھٹا گروہ، وہ ہے کہ جو احادیث کو اس وقت مانتا ہے جب وہ یورپ کے موجودہ نظریات کے مطابق ہوں، چنانچہ اگر احادیث میں ان جدید نظریات کی مخالفت نظر آئے تو وہ احادیث نا قابلِ قبول ہیں۔

یہ فکری گمراہی صرف حدیث تک نہیں رکتی، بلکہ اگر قرآن کی کوئی آیت بھی انہیں مغربی نظریات کے خلاف ملتی ہے تو اس کی تاویلات کر کے اسے مغربی نظریات کے مطابق ڈھالنے کی بھر پور کوشش کرتے ہیں۔جاوید احمد غامدی کے اصول میں تیسرا، چوتھا اور پانچواں صراحتاً شامل ہے لیکن غامدی صاحب کا منہج تقریباً چھٹا ہی ہے۔

پہلا گروہ''منکرِ جمیع حدیث'' ہے، پانچواں اور چھٹا گروہ''منکرِ بعض حدیث'' ہے اور بقیہ تین گروہ''منکرِ حجیتِ حدیث'' ہیں۔

❖❖❖❖❖

انکارِ حدیث کے نقصانات

1۔ دنیا پرستی:

انکارِ حدیث انسان کو رنگینیِ حیات کی طرف لے جاتا ہے، منکرینِ حدیث (سرسید، محمد عبدہ، وغیرہ) کا حال دیکھو کہ یہ لوگ جب تک روایتی فہمِ دین اور راسخ العقیدگی اور تمسک بالکتاب والسنت کے دور میں رہے، ان کے اپنے بیانات سے ظاہر ہے کہ، ان پر نیکی اور تقویٰ کا غلبہ تھا، اور وہ دنیوی ناز و نعم کو اہمیت نہیں دیتے تھے، بلکہ دوسروں کو بھی اس دنیا سے گریز کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن جونہی ان کی زندگی میں دنیوی اور مادی ترقی کی اہمیت داخل ہوئی، انھوں نے حدیث کو اس راہ میں رکاوٹ جانا، پھر خود بھی اور دوسروں کو بھی اس دنیا کی اہمیت اور اس کے حصول پر توجہ دینے کی دعوت دی اور اس بارے میں اسلامی مزاج کو بدلنے اور نبوی تعلیمات وہدایات کو جھٹلانے لگے۔

اسلام بلاشبہ دنیا سے اپنا حصہ لینے کی تعلیم دیتا ہے: لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا [1] مگر اس کا اصل زور آخرت پر ہے: وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ [2] وہ (اسلام) اس دنیا کو کھیل تماشا: وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ؕ [3] متاعِ قلیل: مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى [4] اور دھوکے کا سامان: وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ [5] قرار دیتا ہے۔

1- سورۃ القصص:77
2- سورۃ العنکبوت:64
3- سورۃ العنکبوت:64
4- سورۃ النساء:77
5- سورۃ آل عمران:185

اور جہاں دونوں (دنیا وآخرت) میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑ جائے، وہاں آخرت کی کامیابی کے حصول کی طرف پُر زور طریقے سے متوجہ کرتا ہے: وَ فِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ[1] (ترجمہ: اور انہی (آخرت کی نعمتوں کے حاصل کرنے) میں آگے بڑھنے والوں کے آگے بڑھنا چاہیے)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نگاہ میں اہلِ ایمان کے لیے مطلوبہ زندگی اور طرزِ عمل وہی ہے، جس میں آخرت کو طلب کرنے کی جھلک ہو اور یہ جھلک انسان کے اندر زہد وتقویٰ اور راسخ العقیدگی اور اتباعِ سنت اور التزامِ شریعت سے پیدا ہوتی ہے، یقیناً اس میں بھی غلو کرنا غلط اور قابلِ مذمت ہے اور دینِ فطرت اسلام نے اس سے روکا ہے، تاہم یہ بھی اپنی جگہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ، اسلامی تناظر میں آخرت اور اخروی کامیابیوں کے مقابلے میں دنیا اور دنیاوی منافع ولذّات کی حیثیت مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں ہے۔

2۔ دین بیزاری:

احادیث کی حجیت وآئینی حیثیت کا قائل ایک مسلمان لازماً سنت کا انکار کرنے والے شخص کے مقابلے میں اسلامی اخلاقیات اور قرآنی تعلیمات پر زیادہ عمل پیرا ہوگا۔ فکرِ انکارِ حدیث میں ہر عصری خواہش کو پورا کرنے کا تمام مواد موجود ہے، نفسانی خواہشات کے ساتھ سب سے زیادہ ٹکرانے والی چیز، سنت ہے اور اب ایک مسلمان اور کافر کے درمیان تمیز اتنی مشکل ہو گئی ہے کہ، الامان والحفیظ۔

جب نہ لباس مسئلہ رہے، نہ شکل مسئلہ رہے، نہ معاملات میں کسی حرام بلکہ اشد الحرام میں ملوث ہونا کوئی مسئلہ رہے، جب دینی ریاست کسی کو خلافِ شرع کام کرنے پر نہ ٹوک سکے، بلکہ جب مسلمان بننے کے لئے ایمان بالرسالت ہی غیر ضروری ٹھہرے، مطلب آپ یہودی، عیسائی رہ کر بھی (ایک خاص ماحول کے اندر) حقدارِ جنت بنتے ہیں، تو پھر کہاں رہا اسلام؟ کہاں رہی شوکتِ اسلام؟ یہ وہ خدشات ہیں، جواب خدشات نہیں رہے۔

1- سورۃ المطففین: 26

ان حضرات کی کوششوں سے دین کا حلیہ بگڑا، اور حدیث کی تشریعی حیثیت متاثر ہوئی، دین کی بنیادیں کمزور پڑیں، اور وہ پاک دین جس کو دور سے ہی دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ ''یہ اسلام ہے'' اس کی اپنی ایک پہچان، ایک خاص ٹرمنالوجی اور ایک خاص آئیڈیالوجی ہے، ان حضرات کی کوششوں سے یہ سارا کچھ ریت کے گھروندوں کی طرح منہدم ہو گیا۔ یہ لوگ براہِ راست سنت سے ٹکراتے ہیں، سنت کو درمیان سے ہٹا کر اسلام کی ایک ایسی من چاہی شکل بناتے ہیں، اور مزید بنائے جا رہے ہیں، جہاں آپ کچھ بھی کر کے، کچھ بھی بول کر، کچھ بھی بن کر ''مسلمان'' ہی رہتے ہیں۔

جب آپ چودہ صدیوں کی ساری اصطلاحات پر پانی پھیر دیں گے اور ادھر آپ ایک مغلوب، احساسِ کمتری میں مبتلا تہذیب، ایک مری ہوئی قوم کے مالک اور حامل ہوں گے اور آپ کا دین کسی پانی کی مثل ہو، کہ اسے جس برتن میں ڈالا جائے، یہ اس ہی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، تب غالب تہذیبیں اور غالب اقوام کے نظریات عوام میں قبولیت پا جاتے ہیں، یوں آپ کے وجودِ فکری اور تشخصِ دینی کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

3۔ لادینیت:

اس (انکارِ حدیث کی) تحریک کا دعویٰ ہے کہ یہ اصلاحی اور تعمیری ہے؛ کیونکہ یہ اسلام کے تاریخی و علمی سرمائے کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ احیاء وتجدید کا یہ عمل یورپ کی لبرل فکر کے زیرِ سایہ انجام پایا، جس سے رفتہ رفتہ دین کی نئی تعبیر وتشریح ہوئی اور دینی مسلمات وعقائد، ایک نئی تفہیم میں بدل گئے، نتیجہ یہ نکلا کہ سیکولر ولادینیت پروان چڑھی، پبلک لائف کا دائرہ اور دین کا دائرہ بالکلیہ الگ الگ ہو کر رہ گیا۔

اس نام نہاد احیائے اسلام نے حقیقت میں ایک پل تعمیر کیا ہے، جس پر دوڑتے ہوئے لادینیت اور الحاد کا دیو مسلم دنیا میں گھس آیا اور بہ آسانی ایک کے بعد ایک قلعہ تسخیر کرتا گیا، اس لیے یہ بات محض اتفاق نہیں ہے کہ منکرینِ حدیث کے تلامذہ ومعتقدین میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوا، جس نے بعد میں مکمل لادینیت والحاد کو اپنا مشن بنا لیا۔

4۔ تقلیدِ استشراق:

منکرینِ حدیث کی رسوائی کا ایک داخلی سبب یہ بھی رہا ہے کہ، ان کے افکار ونظریات ماضی قریب کے مستشرقین کے پیش کردہ ہیں، گویا خود فکری یتیم ہیں اور خالص مقلد ہیں۔

موجودہ منکرینِ حدیث اپنے لمبے چوڑے تحقیقی دعووں کے باوجود سر سید، محمد عبدہ، طٰہ حسین، چراغ علی وغیرہ، سے کچھ مختلف تحقیقات پیش نہیں کر سکے، اس طرح یہ مقلد قرار پائے، پھر ان پیشواؤں نے بھی کوئی تیر نہیں مارا، مستشرقین (گولڈز یہر، جوزف شاخت، منٹگمری واٹ، وغیرہ) کے نظریات کی ہی تقلید کرتے ہیں۔

اگر یہ (گمراہوں اور کافروں کی) تقلید ہی اعلیٰ تحقیقی مزاج اور قرآنی بصیرت ہے تو امام ابوحنیفہ، امام شافعی، وغیرہ، علمائے اسلام کی تقلید کیوں تحقیق نہیں ہے؟؟ کیوں قرآن کی صحیح بصیرت نہیں ہے؟؟

5۔ دنیا کی رسوائی:

یک طرفہ تماشا یہ ہے کہ، منکرینِ حدیث نے جن مغربی آقاؤں کو راضی کرنے کے لیے، اپنے دین میں تحریف پر آمادہ ہوئے اور خاتم الانبیاء محمد مصطفی ﷺ کی سنت وسیرت کو ٹھکرا بیٹھے (انہیں آخرت میں جو رسوائی ہوگی وہ ایک الگ مسئلہ ہے)، انہی مغربی آقاؤں نے ان کی اس دین فروشی اور دینی بے راہ روی کو کچھ زیادہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ تحقیر آمیز رویہ اور ناکارہ ہونے کا لقب ملا، اور ہمیشہ یہی کہا کہ:

> ''اِن لوگوں (منکرینِ حدیث) نے مسلمانوں کی دینی غیرت کا بہت کم کچرا صاف کیا ہے اور ابھی بہت سا کام کرنا باقی ہے، انھوں نے جو احتیاط ملحوظ رکھی اور کسی نہ کسی حد تک اسلام سے اپنی نسبت اور تعلق کو باقی رکھا، اگر وہ ایسا نہ کرتے، بلکہ پورے طور سے مغربی تہذیب اور افکار ونظریات کو اپنے اندر جذب کر لیتے تو یہ ایک قابلِ قدر کام ہوتا۔''

6۔ انکارِ حدیث سے انکارِ قرآن تک:

جب منکرینِ حدیث کو کوئی حدیث عقل کے خلاف نظر آئے تو وہ اس کا انکار کر دیتے ہیں، جب اسی طرح کی بات قرآن میں مل جائے تو پھر اگلا مرحلہ انکارِ قرآن کا آتا ہے، اور یہی مغربی آقاؤں کا اصل مطلوب ہے۔

واقعات وشواہد بتاتے ہیں کہ جس شخص پر اس کی شقاوت غالب آئی اور اسے انکارِ حدیث کا سرطان لگ گیا، تو ضرور اس کی ایمانی حالت کمزور ہو کر رہی، بعض بدنصیبوں کو ان کی بدنصیبی علانیہ انکارِ قرآن اور ارتداد تک بھی لے گئی، فکری آوارگی میں دینِ حق سے بہت دور جا پڑے، ظاہر ہے کہ کسی بھی غیرت منداور باشعور مسلمان کا مزاج اور ضمیر اس انجام کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوسکتا ہے۔

سچی بات وہی ہے جو ربِ ذوالجلال نے بہت پہلے بتادی ہے:

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (1)

''یہ یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک کہ تم پوری طرح ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا۔ اگر اس علم کے بعد (جو تمہارے پاس آچکا ہے) تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہوگا''۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

1- سورۃ البقرۃ:120

منکرینِ حدیث سے سوالات

سوال نمبر 1:

اگر احادیث حجت نہیں ہیں تو موضوع (جھوٹی، بناوٹی) احادیث کیوں گھڑی جاتی رہی ہیں؟ نقل اُسی کی بنائی جاتی ہے جس کی اصل کا کوئی مقام ومرتبہ ہوتا ہے۔ مارکیٹ میں 5000 کا نوٹ چلتا ہے، جب ہی تو نقلی نوٹ مارکیٹ میں چلایا جاتا ہے، اگر اصلی نہ چلتا ہو تو بتائیں کون بیوقوف ہے جو نقلی نوٹ بنائے۔ ہمارے ملک پاکستان میں فی الحال 10000 (دس ہزار) کا نوٹ نہیں چلتا، بتائیں کیا کوئی دس ہزار کا جعلی نوٹ بنائے گا؟ نہیں بنائے گا کیونکہ دس ہزار کا نوٹ چلتا ہی نہیں، جب احادیث شروع سے ہی دین سمجھی جاتی تھیں اسی وجہ سے ہی موضوع احادیث بنائی گئیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر حدیث کو دین نہ سمجھا جاتا تو موضوع احادیث کیوں گھڑی جاتی رہیں؟

سوال نمبر 2:

قرآن مجید کی 114 سورتیں ہیں، ان سورتوں کے نام کس نے رکھے ہیں؟ کیا قرآن نے خود ان سورتوں کے نام رکھے ہیں؟ اگر یہ نام قرآن نے رکھے ہیں تو کس پارے میں یہ نام موجود ہیں؟ یا یہ نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھے ہیں؟ اگر یہ نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھے ہیں تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اختیار تھا کہ اللہ عزّ وجلّ نے بغیر نام کے سورتوں کو نازل کیا اور آپ نے اُن کے نام رکھ دیئے؟ یا پھر اللہ عزّ وجلّ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھے ہیں؟ بہر صورت حدیث حجت ہوگی۔

سوال نمبر 3:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ (1)

1- سورۃ البقرۃ:106

(ترجمہ:)''جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے''۔

اس آیت قرآنی میں اللہ عزّوجلّ نے بتایا ہے کہ ہم جس آیت کو چاہیں منسوخ کر دیں۔ کیا قرآنی آیات منسوخ بھی ہوتی ہیں؟ کیا آیات کی منسوخی کے لئے کوئی آیت نازل ہوئی ہے کہ فلاں آیت اب منسوخ ہے یا پھر رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ فلاں آیت اب منسوخ ہے؟ اگر احادیث سے پتہ چلا کہ فلاں آیت منسوخ ہے تو پھر یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ جس طرح قرآن دین اور حجت ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا اِرشاد بھی دین اور حجت ہے۔

سوال نمبر 4:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (1)

(ترجمہ:)''حج کے چند معلوم مہینے ہیں تو جو اِن میں حج کی نیت کرے تو حج میں نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو اور نہ کوئی گناہ ہو اور نہ کسی سے جھگڑا ہو اور تم جو بھلائی کرو اللہ عزّوجلّ اسے جانتا ہے اور زادِراہ ساتھ لے لو پس سب سے بہتر زادِ راہ یقیناً پرہیزگاری ہے اور اے عقل والو! مجھ سے ڈرتے رہو''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حج کے مہینے مقرّر ہیں، ''اَشْهُر'' جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو کہ کم از کم 3 کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اب آپ قرآن سے بتائیے کہ حج کے کون کون سے مہینے ہیں؟ یا پھر اس آیت کو سمجھنے کے لئے بھی حدیث کی ضرورت ہے؟ تو پھر ماننا پڑے گا کہ احادیث بھی قرآن کی طرح دین کا حصہ ہیں۔

1- سورۃ البقرۃ:167

سوال نمبر 5:

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (1)

(ترجمہ:) ''اور تم میں سے جو مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں تو جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو (اے سرپرستو!) تم پر مواخذہ نہیں اس کام میں جو عورتیں اپنے معاملہ میں موافقِ شرع کریں اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے''۔

اس آیت میں اللہ رب العزت نے بتایا کہ جو عورتیں ایامِ عدّت میں ہوں یعنی جن کے شوہر انتقال کر جائیں وہ ''4 مہینے اور دس۔'' انتظار کریں۔ اب قرآن سے بتایئے کہ یہ ''دس'' کیا ہیں؟ چار مہینے اور دس دن؟ چار مہینے اور دس ہفتے؟ چار مہینے اور دس عشرے؟ چار مہینے اور دس سال؟ کیا قرآن نے اس کی وضاحت کی ہے؟ جب کہ احادیث مبارکہ میں اس کی وضاحت موجود ہے، تو مان لیں کہ حدیث حجّت ہے۔

سوال نمبر 6:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ، ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (2)

(ترجمہ:) ''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے حکومت والے ہیں۔ پھر اگر کسی بات میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اگر اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اس بات کو اللہ اور

1- سورۃ البقرۃ: 234

2- سورۃ النساء: 59

رسول کی بارگاہ میں پیش کرو۔ یہ بہتر ہے اور اس کا انجام سب سے اچھا ہے''۔

قرآن نے کہا: اگر تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے (تو اگر تم اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو) تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرو۔ اب ہم اس آیت پر عمل کیسے کریں کہ اپنے اختلافات کے حل کے لئے کس کی طرف رجوع کریں؟ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کا مطلب تو قرآن کی طرف رجوع ہے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کا مطلب کیا احادیث کی طرف رجوع نہیں؟ یقیناً احادیث کی طرف رجوع ہے، پس ثابت ہوا کہ حدیث بھی قرآن کی طرح حجت ہے۔

سوال نمبر 7:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (1)

(ترجمہ:) ''تم فرماؤ، جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، اُس میں کسی کھانے والے پر میں کوئی کھانا حرام نہیں پاتا سوائے یہ کہ مردار ہو یا رگوں میں بہنے والا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ ناپاک ہے یا وہ نافرمانی کا جانور ہو جس کے ذبح میں غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو تو جو مجبور ہو جائے (اور اس حال میں کھائے کہ) نہ خواہش (سے کھانے) والا ہو اور نہ ضرورت سے بڑھنے والا تو بے شک آپ کا رب بخشنے والا مہربان ہے''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: آپ فرما دیجئے کہ میں ان چار (4) چیزوں (مرا ہوا جانور، خنزیر، خون اور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے) کے سوا کسی چیز کو حرام نہیں پاتا۔ اب بتائیں، کیا صرف یہ چار چیزیں حرام ہیں اور کتا، بلی، گدھا، چیل، گیدڑ، بھیڑیا، چیتا، شیر، بندر، ریچھ، ہرن، بھینسا، خرگوش، کوا، باز، شکرہ، کبوتر، مینا وغیرہ وغیرہ باقی سب

1- سورۃ الانعام: 145

حلال ہیں؟ آج تقریباً سب لوگ مچھلی کھاتے ہیں جو کہ پانی سے نکلنے کے بعد فوراً مر جاتی ہے۔ اگر صرف قرآن ہی حجت ہے تو بتائیے کہ مچھلی حلال ہے یا حرام؟ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کی آیت سے سمندری جانور حلال ہیں تو سمندری جانور جو زندہ ہو وہ حلال ہے یا سمندری مرا ہوا جانور بھی حلال ہے؟ قرآن کی واضح آیت بتائیں، اِدھر اُدھر کی باتوں میں نہ اُلجھائیں۔

اگر آپ ان سوالوں کا جواب قرآن سے نہیں دے سکتے تو مان لیں کہ قرآن سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے احادیث بھی ضروری ہیں۔

سوال نمبر 8:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (1)

(ترجمہ:) ''جس نے رسول کا حکم مانا، بیشک اس نے اللہ کا حکم مانا اور جس نے منہ موڑا تو ہم نے تمہیں، انہیں بچانے کے لئے نہیں بھیجا''۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (2)

(ترجمہ:) ''بیشک تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ موجود ہے، اس کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہو''۔

ان دونوں آیات سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی فرض ہے۔ اب بتائیں کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی ہم کس طرح کریں گے؟ اگر ایک شخص رسول اللہ ﷺ کو بہترین نمونہ سمجھے پھر آپ کے طریقے پر عمل کرنا چاہے تو وہ کیسے عمل کرے گا؟ کیا

1- سورۃ النساء:80

2- سورۃ الاحزاب:21

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے اور طریقے پر چلنے کے لئے احادیث کی ضرورت نہیں ہوگی؟ یقیناً ہوگی۔ پھر ماننا پڑے گا کہ احادیث پر عمل کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ تو مان لیں کہ احادیث دین کا لازمی جزء ہیں۔

سوال نمبر 9:

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا [1]

(ترجمہ:) ''تو اے حبیب! تمہارے رب کی قسم، یہ لوگ اسی وقت مسلمان ہوں گے، جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم بنالیں پھر جو کچھ تم حکم فرمادو، اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی نہ پائیں اور اچھی طرح دل سے مان لیں''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کو دل سے تسلیم نہ کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فیصلہ کرنے والا نہ مانے وہ مؤمن نہیں۔

اب بتائیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قسم کھا کر اس بات کی نفی فرمائی کہ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فیصلہ کرنے والا نہ مانے اور آپ کے فیصلے پر دل سے راضی نہ ہو جائے، ''وہ مومن نہیں ہے''؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ کہاں ملے گا؟ یقیناً احادیث میں ہی ملے گا۔ اس آیت کی روشنی میں بھی ہم کو ماننا پڑے گا کہ احادیث، دین ہیں۔

سوال نمبر 10:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ [2]

1- سورۃ النساء: 65

2- سورۃ التوبہ: 29

(ترجمہ:)''وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ان میں سے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ ہی آخرت کے دن پر اور نہ وہ ان چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں جنہیں اللہ اوراس کے رسول نے حرام کیا ہے اور نہ وہ سچے دین پر چلتے ہیں، ان سے جہاد کرتے رہو، حتّٰی کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں''۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اُن لوگوں کو قتل کرو جو اللہ عزّ وجلّ کے حرام کو حرام نہیں مانتے اور رسول اللہ ﷺ کے حرام کو حرام نہیں مانتے۔ اللہ کا حرام تو قرآن سے ثابت ہے، رسول اللہ ﷺ کا حرام کیا ہے؟ یعنی جسے رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا ہو؟ وہ کہاں ملے گا؟ یقیناً وہ احادیث میں ملے گا تو ماننا پڑے گا کہ احادیث بھی دین ہیں۔

سوال نمبر 11:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (1)

(ترجمہ:)''بیشک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک، اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہیں، جب سے اس نے آسمان اور زمین بنائے، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔ یہ سیدھا دین ہے تو ان مہینوں میں اپنی جان پر ظلم نہ کرو، اور مشرکوں سے ہر حال میں لڑو، جیسا وہ تم سے ہر وقت لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔

اس آیت میں اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں مہینوں کی تعداد 12 ہے اور چار حرمت والے مہینے ہیں۔ اب بتائیں کتاب اللہ میں 12 مہینے کون کون سے ہیں؟ اور چار حرمت والے مہینے کون کون سے ہیں؟ اگر اس سوال کے جواب میں بھی آپ

1- سورۃ التوبہ:39

حدیث لائیں گے اور یقیناً لائیں گے؛ کیونکہ احادیث کے بغیر اس کی وضاحت ممکن نہیں تو مان لیں کہ حدیث حجّت ہے۔

سوال نمبر 12:

وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا[1]

(ترجمہ:) ''اور جب ہم نے تم سے کہا: ''بیشک سب لوگ تمہارے رب کے قابو میں ہیں'' اور ہم نے آپ کو جو مشاہدہ (معراج) کرایا، اسے لوگوں کیلئے آزمائش بنادیا اور اس درخت کو بھی (آزمائش بنادیا) جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے اور ہم انہیں ڈراتے ہیں تو یہ ڈرانا ان کی بڑی سرکشی میں اضافہ کردیتا ہے''۔

اس آیت میں ایک درخت کا ذکر ہے جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔ بتائیں کہ قرآن کی 114 سورتوں میں سے، کس سورت میں اِس درخت کے نام کے ساتھ لعنت کی گئی ہے؟ لعنت کے الفاظ کہاں ہیں؟ یا اس آیت کو احادیث کی مدد سے سمجھیں گے؟ اگر احادیث کی مدد سے سمجھیں گے اور یقیناً احادیث کی مدد سے ہی سمجھیں گے، تو ماننا پڑے گا کہ احادیث بھی دین ہیں۔

سوال نمبر 13:

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا[2]

(ترجمہ:) ''بیشک اللہ اور اس کے فرشتے، نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان

1- سورۃ بنی اسرائیل:60

2- سورۃ الاحزاب:56

والو! ان پر درود اور خوب سلام بھیجو''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ نبی ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجیں۔ کیا قرآن نے صلوٰۃ وسلام کا طریقہ بتایا؟ کب بھیجیں، نماز میں؟ دُعا میں؟ یا عام حالات میں؟ کن الفاظ سے بھیجیں؟ بغیر احادیث کے ہم قرآن پر عمل کیسے کریں؟

سوال نمبر 14:

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ (1)

(ترجمہ:) ''اے محبوب! بیشک ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں کوثر عطا کی۔ بتائیں کہ کوثر کیا ہے؟ جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو عطا کی، کیا کسی عورت کا نام ہے یا یہ کوئی اور چیز ہے؟ قرآن مجید سے جواب دیں۔

سوال نمبر 15:

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ○ اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَھُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ○ وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡھِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ○ تَرۡمِیۡھِمۡ بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ○ فَجَعَلَھُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ○ (2)

(ترجمہ:) ''کیا تم نے نہ دیکھا کہ، تمہارے رب نے ان ہاتھی والوں کا کیا حال کیا؟ کیا ان کے مکر وفریب کو تباہ نہ کر ڈالا۔ اور ان پر فوج درفوج پرندے بھیجے۔ جو انہیں کنکر کے پتھروں سے مارتے تھے۔ تو انہیں جانوروں کے کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا''۔

اب بتائیں کہ، یہ ہاتھی والے کون تھے؟ ان کا جرم کیا تھا؟ قرآن نے اُن کا کیا قصور بتایا ہے؟ قرآن سے جواب دیں؟

1- سورۃ الکوثر:1

2- سورۃ الفیل:1-5

سوال نمبر 16:

بعض منکرینِ حدیث کہتے ہیں کہ، ہم احادیث تو مانیں گے مگر وہ حدیث نہیں مانیں گے جو عقل میں نہ آئے۔

پہلا سوال یہ کہ، ایک حدیث ایک آدمی کی عقل میں آتی ہے، دوسرے کی عقل میں نہیں آتی، اب کس کی عقل کو معیار بنایا جائے گا؟ دوسرا سوال یہ کہ، کیا عقل دین میں معیار (Standard) ہے؟ اگر نہیں تو یقیناً، معیار قرآن ہے، (جو آپ کے اور ہمارے درمیان متفق معیار ہے) تو جو آیت ہماری عقل میں نہ آئے، کیا ہم اُس کو تسلیم نہیں کریں گے؟ یقیناً تسلیم کریں گے تو اسی طرح وہ احادیث جو صحیح سند سے ثابت ہوں، چاہے وہ ہماری عقل میں آئیں یا نہ آئیں، ہم اُس کو تسلیم کریں گے۔ کثیر آیاتِ قرآنی ہیں جو ہماری عقل کے خلاف ہیں مگر ہم اُنہیں تسلیم کرتے ہیں، دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (1)

ترجمہ: ''ہم نے فرمایا: اے آگ! ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوجا''۔

وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا، وَ قَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ، قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا، وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ، اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ، اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (2)

(ترجمہ:) ''اور اس (یوسف) نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا، اور سب اس کے لیے سجدے میں گر گئے اور یوسف نے کہا: ''اے میرے والد! یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے، بیشک اسے میرے رب نے سچا کردیا اور بیشک اس نے مجھ پر احسان کیا کہ، مجھے قید سے نکالا اور آپ سب کو گاؤں سے

1- سورۃ الانبیاء:69

2- سورۃ یوسف:100

لے آیا، اس کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں میں ناچاقی کروادی تھی، بیشک میرا رب جس بات کو چاہے آسان کردے، بیشک وہی علم والا، حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا، حالانکہ آگ کا کام تو جلانا ہے، لیکن وہ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی؟ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، کیا یہ بات عقل کے خلاف نہیں ہے؟؟ جناب یعقوب نے اپنے بیٹے یوسف کو سجدہ کیا، دونوں نبی ہیں، باپ نے بیٹے کو سجدہ کیا۔ کیا کوئی انسان، کسی انسان کو سجدہ کرسکتا ہے؟ اور اگر سجدہ کرنا ہی ہو تو بیٹا، باپ کو سجدہ کرے گا یا باپ، بیٹے کو؟ عقل کہتی ہے کہ سجدہ کرنا ہی تھا تو بیٹا، باپ کو کرتا۔

جب چند ایسی آیات جو عقل میں نہیں آتیں، پھر بھی اُن کو تسلیم کرتے ہیں، تو وہ احادیث بھی قابلِ قبول ہیں جو صحیح ہیں، چاہے وہ عقل میں آئیں یا نہ آئیں۔

سوال نمبر 17:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (1)

(ترجمہ:) ''تو تم اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو''۔

قرآن مجید میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، رکوع کرنے، سجدہ کرنے کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے، کھڑے ہونے کا بھی حکم موجود ہے، سوال یہ ہے کہ پہلے کھڑے ہوں یا پہلے رکوع کریں یا سجدہ کریں؟ اور کھڑے ہوں تو ہاتھ باندھ کر یا چھوڑ کر کھڑے ہوں؟ ہاتھ اگر باندھے جائیں تو کہاں باندھے جائیں؟ رکوع کرنے کا حکم ہے، رکوع کا معنی ''جھکنا'' ہے۔ کہاں جھکیں، آگے جھکیں یا دائیں بائیں؟ رکوع کی حالت میں ہاتھ کہاں رکھیں؟ سجدہ کس طرح کریں؟ کون سے اعضاء کو زمین پر رکھیں؟ سجدہ ایک کریں یا دو؟ ان سوالات کا جو بھی جواب آپ دیں اس کا ثبوت قرآن سے دیں۔ اور اگر آپ قرآن سے ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتے (اور یقیناً نہیں دے سکتے) تو مان جائیں کہ قرآن پر

1- سورۃ الکوثر:2

عمل کرنے کے لئے حدیث کی ضرورت ہے اور حدیث بھی قرآن کی طرح دین کا حصہ ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ ہے، یہ زکوٰۃ کب دی جائے گی؟ کیا ہر نماز کے ساتھ زکوٰۃ دی جائے گی؟ یا سال میں ایک مرتبہ دی جائے گی؟ کس حساب سے دی جائے گی؟ غلے پر کتنی اور سونے چاندی پر کتنی دی جائے گی؟ یہ سارے مسائل قرآن سے بتائیں؟ یہ سب مسائل قرآن سے ثابت نہیں، احادیث سے پتہ چلتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ احادیث مانے بغیر قرآن پر بھی عمل نہیں ہوسکتا۔

انہی مثالوں پر دیگر مثالیں بھی بنالیں، مثلاً: روزہ، حج، عمرہ، جمعہ کے احکام، مالِ غنیمت، چور کا ہاتھ کاٹنا، زانی کی سزا، وغیرہ۔

سوال نمبر 18:

قرآن مجید جو ہمارے پاس موجود ہے، کیا اللہ رب العزت نے اسی طرح نازل کیا ہے یا یہ ترتیب رسول اللہ ﷺ نے دی ہے؟ اگر یہ ترتیب رسول اللہ ﷺ نے دی ہے تو کیا حدیث حجت نہ ہوگی؟ کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ترتیب کے مطابق تلاوتِ قرآن کرتے ہیں۔ کیا رسول اللہ ﷺ کے پاس اختیار تھا کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب میں اپنی مرضی سے آیات کو ترتیب دیں یا یہ کام آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق کیا؟ تو پھر مان لینا چاہیئے کہ قرآن کے علاوہ بھی آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی اور وہ بھی دین ہے جو احادیثِ صحیحہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اگر کوئی منکرِ حدیث یہ کہے کہ قرآن جس ترتیب سے ہمارے پاس موجود ہے اسی ترتیب سے اللہ نے نازل فرمایا ہے۔ تو سورۃ المائدۃ چھٹے پارے میں اللہ تعالیٰ نے اِرشاد فرمایا:

اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا (1)

1- سورۃ المائدہ:3

جب چھٹے پارے میں دین مکمل ہو گیا تو باقی پارے کیوں نازل کئے گئے؟ کیا کسی منکرِ حدیث کے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟؟؟

سوال نمبر 19:

منکرینِ حدیث، یہ فریب دیتے ہیں کہ ہم وہ احادیث نہیں مانیں گے جو قرآن کے خلاف ہوں گی، حالانکہ کوئی صحیح حدیث قرآن کے خلاف نہیں، یہ صرف ہماری کم علمی کا قصور ہے، دونوں میں تطبیق دے کر دونوں کو ماننا چاہئے۔

اگر یہی قانون قرآن پر رکھا جائے، یعنی دو آیاتِ قرآنی ایک دوسرے کے خلاف محسوس ہوں تو ہم کیا کریں گے؟ یقیناً ہم دونوں کو تسلیم کریں گے کیونکہ دونوں درست ہیں۔ کیا ایک آیت کو تسلیم کر کے دوسری کو ضعیف کہہ کر ردّ کر دیں گے؟ یا دونوں کو تسلیم کریں گے؟ جب ہم دونوں کو تسلیم کرتے ہیں تو احادیث کے لئے ہم یہ فارمولہ کیوں نہیں اپناتے؟

قرآنی آیات دیکھیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (1)

(ترجمہ:) ''اور کافر بولے قرآن ان پر ایک ساتھ کیوں نہ اتار دیا ہم نے یونہی بتدریج اُسے اُتارا ہے کہ اس سے تمہارا دل مضبوط کریں''۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (2)

(ترجمہ:) ''ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا''۔

ایک آیت میں فرمایا کہ یہ قرآن ایک ساتھ نازل نہیں ہوا۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ ہم نے اس کو ایک رات میں نازل کیا۔ اب ہم دونوں آیتوں میں تطبیق دے کر دونوں کو تسلیم کرتے ہیں، اسی قانون کے تحت ہم احادیث کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟

1- سورۃ الفرقان:32

2- سورۃ القدر:1

اللہ تعالیٰ سے، ہم اپنے لئے اور تمام پڑھنے والوں کے لئے دُعا کرتے ہیں کہ، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُس حق کو سمجھنے کی اور اُس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے بذریعۂ وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ کیونکہ توفیق دینے والی ذات صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ہے۔

آمین بجاہ النبی الامین علیہ الصلوٰۃ و التسلیم

❖❖❖❖❖

فتنۂ انکارِ

حدیث

تعارفِ مصنف

علامہ حافظ محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المتکلمین علامہ حافظ محمد ایوب دہلوی بن شیخ عبدالرحمن، دہلی میں 1888ء کو پیدا ہوئے، شیخ عبدالرحمن، دہلی میں تجارت کرتے تھے۔

تعلیم وتربیت:

ابتدائی تعلیم اپنے گھر سے حاصل کی، اس کے بعد قرآن حکیم حفظ کیا، بعدازاں وقت کے مشاہیر علماء سے شرفِ تلمّذ حاصل کیا (اس کی تفصیلات معلوم نہیں ہوسکیں)، البتہ ''ملا واحدی'' کی خودنوش کتاب ''دِلّی، جوایک شہر تھا'' سے معلوم ہوا کہ، انہوں نے عظیم ریاضی دان علامہ مولانا محمد اسحاق رامپوری سے بھی استفادہ کیا تھا، بہرحال مختلف علمائے کرام سے درسِ نظامی مکمل کرکے فارغ التحصیل ہوئے۔

بیعت:

آپ فرماتے تھے کہ: میں نے حضرت خواجہ غریب نواز سید معین الدین چشتی اجمیری قُدِّسَ سِرُّہ سے روحانی طور پر بیعت کرلی ہے، ان سے فیض یاب ہوں۔

دہلی میں ایک درویش رہتے تھے، مولانا ایوب دہلوی نے ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہ کران کی خوب خدمت کی، ان سے بھی فیض یاب ہوئے۔

شادی اوراولاد:

آپ نے دہلی میں ''عجائب خانم'' خاتون سے شادی کی، جس سے 8 لڑکے اور 8 لڑکیاں ہوئیں، ان میں سے بعض بچے بچپن میں فوت ہوگئے۔

حلقۂ احباب:

مولانا سید ناصر جلالی دہلوی، مولانا سید عبد السلام باندوی، مولانا سید منتخب الحق

قادری، مولانا مفتی محمد عمر نعیمی، مولانا امیر احمد انصاری جودھپوری، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا شفیع اوکاڑوی، وغیرہ وغیرہ۔

معتقدین:

آپ کی صحبت میں بیٹھنے والے، درس میں شرکت کرنے والے، استفادہ کرنے والے، خوشہ چین (فیض حاصل کرنے والے)، معتقدین ومحبین کی فہرست طویل ہے، آپ کے درس میں اہلِ علم، فاضل اور نامور شخصیات شرکت کرتی تھیں، اُن میں سے بعض کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

نامور دانشور، ملا واحدی (کراچی)، حکیم محمد سعید (بانی ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی)، محترم سخی سید شوکت دہلوی (بانی مکتبہ رازی، کراچی)، مولانا عزیز ڈپٹی (سیکریٹری حکومت پاکستان، کراچی)، محمود احمد خان (ریٹائرڈ الیکشن کمشنر سندھ، کراچی)، حکیم فاروقی (ہندوستانی دواخانہ، گارڈن)، حکیم محمد محسن الدین احمد صاحب بقائی (ٹھٹھائی کمپاؤنڈ، ناظم آباد، کراچی)، خان بہادر شیخ حبیب الرحمن، محمد صالح دہلوی (دِلّی کے مشہور پنجابی سوداگر)، حاجی شیخ محمد خلیل سوت والے (کھارا در)، ڈاکٹر رفیع، اسد ملتانی (سیکریٹری حکومت پاکستان، کراچی)، اسلم ملتانی، حاجی محمد صدیق (طبی سینٹر نیو چالی)، وغیرہ، وغیرہ۔

سفرِ حرمین شریفین:

آپ نے 1922ء کو حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا، مکہ مکرمہ میں عمرہ ادا کیا اور مدینہ منورہ میں روضہ رسول ﷺ کی حاضری کی سعادت حاصل کی، یا د رہے کہ آپ کو حج کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔

درس:

آپ ہر اتوار کو درس دیا کرتے تھے، ایک اتوار کو حکیم محمد سعید (بانی ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی) کے گھر شکار پور کالونی، نزد مزار قائد پر، دوسرے اتوار کو اسد ملتانی (سیکریٹری پاکستان) کی کوٹھی 10 ڈی، گارڈن روڈ، کراچی پر، جس میں قرآن وحدیث کے ساتھ،

فلسفہ و منطق پر بحث ہوا کرتی تھی، درسِ قرآن ہوا کرتا تھا جس میں قرآنِ حکیم کی تفسیر تشریح اور علمی نکات بیان کرتے تھے، ان دروس میں حاضرین کو کوئی بھی سوال دریافت کرنے کی کھلی اجازت ہوا کرتی تھی۔

اعتقادات و نظریات:

''مرأۃ التصانیف'' میں علامہ حافظ عبد الستار سعیدی صاحب نے علامہ ایوب دہلوی علیہ الرحمۃ کو اہلسنّت علماء میں شامل کیا ہے، رئیس المتکلمین علامہ حافظ ایوب دہلوی محفلِ درس میں فرماتے تھے کہ:

''ہر اس مجلس میں جانا چاہیے کہ جہاں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم کی جا رہی ہو اور ہر اس مجلس میں نہیں جانا چاہئے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے ادبی ہو رہی ہو، (لہذا وہاں جانا) حرام ہے گناہ ہے،'' یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' (کہنے) میں کیا جھگڑا ہے؟ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایسے بزرگ ہیں جن کو سب مانتے ہیں، دیو بندی، بریلوی اور غیر مقلّد تینوں متفق ہیں، وہ فرماتے ہیں:

یا صاحب الجمال و یا سید البشر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ
من وجهك المنیر لقد نور القمر
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جب انہوں نے ''یا'' کہہ کر پکارا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، ہمارے استادوں کا سلسلہ ان سے شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے''۔

''مذہبی چیزوں میں ائمہ اربعہ کو بزرگ جانتا ہوں اور ''حنفی مذہب'' کا پیرو ہوں، ہر مذہب والا اپنے مذہب کو افضل کہتا ہے، میں بھی اپنے مذہب کو افضل کہتا ہوں''۔ (1)

''چند اہل حدیث (غیر مقلِّد) درس میں بیٹھا کرتے تھے، (ایک روز) میں

1- مقالات ایوبی، جلد اول، ص262، مطبوعہ مکتبہ رازی، کراچی

نے ردّ کر دیا تو وہ مجھ سے ناراض ہو گئے، (میں نے کہا بھلے) ہو جاؤ، غیر مقلدی غلط چیز ہے، اس سے بڑا نقصان پہنچتا ہے، چاروں امام حق پر ہیں، ان کی تقلید جو نہیں کرے گا، تو گمراہ ہوگا۔''(1)

''مجتہد اگر غلطی کرے گا، تو اس کو ایک انعام ملے گا، اگر ٹھیک کرے گا تو دو انعام ملیں گے، چاروں امام حق پر ہیں، تمام مجتہدین حق پر ہیں، تمام اولیاء اللہ اور اربابِ کشف حق پر ہیں، یہ میرا عقیدہ ہے۔''(2)

تصنیف وتالیف:

آپ نے باقاعدہ تصانیف بہت کم کی ہیں، آپ کے علمی دروس کو محبین ومتوسّلین نے آڈیو کیسٹ میں محفوظ کرلیا تھا، جسے ضبطِ تحریر میں لا کر کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

(چند ایک درج ذیل ہیں:)

(1) تفسیرِ ایوبی (چار جلدیں)

(2) فتنۂ انکارِ حدیث

(3) ختمِ نبوت

(4) مقصودِ کائنات

(5) مقالاتِ ایوبی (3 جلدیں)

(6) تحقیق الکلام

(7) مسئلۂ جبر وقدر

عادات وخصائل:

مولانا پیشے کے حوالے سے کپڑے کی تجارت کرتے تھے دن بھر ''خالق دین ہال'' کے سامنے کپڑے کی مارکیٹ (ایم اے جناح روڈ کراچی) میں لٹھا کی دوکان پر بیٹھتے تھے،

1- مقالاتِ ایوبی، جلد اول، ص 260، مطبوعہ مکتبہ رازی، کراچی

2- ایضاً، ص 295

کسی مسجد میں امامت وخطابت ان کا معمول نہیں تھا، نہ وہ کسی دار العلوم سے منسلک تھے۔ ان کی الگ ہی دنیا تھی، اپنی دنیا میں ہی مشغول ومصروف رہا کرتے تھے۔

وہ دین کی خدمت ''فی سبیل اللہ'' کرتے تھے اور اس پر یقین رکھتے تھے، وہ فیس مقرر کر کے کسی جلسہ میں جانے کو بہت برا سمجھتے تھے، اسی وجہ کئی تقریبات میں شرکت نہیں کرتے تھے، اپنی تشہیر کو سخت ناپسند کرتے تھے، غالباً اس لئے آپ کی کسی کتاب میں بھی سوانح منسلک نہیں ہے، وہ گم نامی و گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے، وہ سیدھے سادے، سادہ مزاج، صاف گو، عظیم انسان تھے، وہ لباس سے نہیں پہچانے جاتے تھے کہ یہ وہ عالم ہیں جس کی نظیر نہیں، معمولی سا لباس زیبِ تن فرماتے، ''گدڑی میں لعل'' کے مصداق معلوم ہوتے۔

پروفیسر نعیم صاحب نے بتایا کہ، وہ فرماتے تھے:

''تم لوگ درس میں آتے تو ہو، لیکن اس کی تشہیر کبھی نہیں کرنا''۔

وہ اس چیز پر سب سے عہد لیا کرتے تھے اور فرماتے تھے:

''جنہیں درس میں آنا نصیب ہے، وہ ضرور آ کر رہے گا؛ اس لئے تشہیر ونمائش کی ضرورت نہیں''۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ اشتہارات میں ان کا نام نمایاں اور القابات سے شائع ہو، اس لئے کسی جلسہ میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

صاحبزادہ محمد زین العابدین صاحب نے بتایا کہ: وہ ساداتِ کرام کا نہایت احترام کرتے تھے، سادات پر زکوۃ کو حرام سمجھتے تھے۔ جھوٹ سے نفرت رکھتے تھے اور حق سچ کا ساتھ دیتے تھے۔

ایک صاحب کے ان کی طرف 9 ہزار روپے تھے، لیکن وہ پاکستان آ کر بھول گئے، مولانا نے قیامِ پاکستان کے بعد انہیں یاد دلا کر، پوری رقم لوٹا دی۔

ایک بار ایک صاحب دوکان پر حاضر ہوئے، وہ ان سے کہنے لگے:

''بلینک چیک لے لیں اور یہ لکھ کر دیں کہ عیسائیت، قادیانیت، پرویزیت اور غیر مقلّدِیت کا ردّ نہیں کریں گے''۔

لیکن اس مردِ خدا نے سختی سے دوٹوک الفاظ میں وہ پیشکش ٹھکرادی، وہ کہتے تھے کہ:

''در بارِ رسالت میں بک چکا ہوں، اب کوئی میری بولی نہیں لگا سکتا''۔

وہ بکنے، جھکنے اور دبنے والے انسان نہیں تھے، بلکہ حضور پاک ﷺ کے سچے غلام، دین اور اسلام کے مخلص سپاہی تھے۔

وہ سخی تھے، راہِ خدا میں لٹانا جانتے تھے، سارے دن کی کمائی میں سے گھر کا خرچہ نکال کر بقیہ رقم اہلِ ضرورت، سفید پوش محتاجوں اور بیوہ خواتین پر خرچ کر دیتے تھے۔

مولانا مرحوم، کتب خانہ و کتب بینی کی حاجت سے آزاد تھے، اُنہیں ربّ کریم نے وہبی علم عطا فرمایا تھا، وہ نہ لکھتے تھے، نہ پڑھتے تھے، ان کے معمولات اس طرح تھے کہ روزانہ فجر پڑھ کر ناشتہ کرتے، اس کے بعد کھارادر سے بس میں بیٹھ کر برنس روڈ آتے، گوشت سبزی وغیرہ خرید کر، لائن میں لگے ہوئے فقیروں کو خیرات دیتے ہوئے واپس گھر آتے، پھر وہاں سے بس میں بیٹھ کر دوکان پر چلے جاتے، حلال روزی کماتے، شام گھر واپس ہوتے، عشاء کے بعد سو جاتے، یہ ہیں ان کے معمولاتِ زندگی، ان کے فیض یافتہ شاگرد ''ملا واحدی'' لکھتے ہیں:

''افسوس انہیں لکھنے کی مشق نہیں تھی، وہی زبان جو تقریر میں استعمال کرتے تھے، تحریر میں استعمال کر سکتے تو بلا مبالغہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح حیاتِ جاوید پالیتے، مجھے چودہویں صدی ہجری کے عظیم ترین علماء و مشائخ سے شرفِ نیازمندی حاصل رہا، میں نے علم کے سمندر، غوطہ خور عالم اور غزالی صفت درویش، مولانا ایوب دہلوی جیسا نہیں پایا''۔ (1)

1- مولانا ایوب، جنھوں نے دین کی تجارت کبھی نہیں کی: ملا واحدی، جنگ کراچی 20، دسمبر 1969ء

وصال:

مولانا حافظ محمد ایوب دہلوی کا 4 شوال المکرم 1389ھ بمطابق دس، دسمبر 1969ء بروز پیر، 81 سال کی عمر میں کراچی میں انتقال ہوا۔

آپ کا مزار، دھوبی گھاٹ کے متصل، یوسف پورہ لیاری کے قبرستان میں ہے جو کہ دہلی کی قوم، ''سوداگران'' کی ملکیت ہے۔ (ماخوذ از انوارِ علمائے اہلِ سنت، سندھ)

❖❖❖❖❖

افتتاحِ کتاب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وحی کی کتنی صورتیں ہیں اور کیا کتابِ الٰہی کے علاوہ بھی وحی ہوسکتی ہے یا نہیں؟

سوال: کیا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن شریف کے علاوہ بھی وحی کی جاتی تھی یا وحی صرف کتاب اللہ میں منحصر ہے؟ کیا ہر وہ نبی جس پر کتاب نازل ہوئی، علاوہ کتاب کے، اس پر وحی نازل کی گئی یا نہیں؟

جواب: ہر نبی پر وحی آئی اور ہر نبی صاحبِ کتاب پر علاوہ کتاب کے، بھی وحی آئی۔ بالخصوص ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر علاوہ قرآن شریف کے بارہا بکثرت وحی آئی۔

ثبوت: اس بات کا ثبوت (کہ وحی، کتاب کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ کتاب کے علاوہ بھی ہر صاحبِ کتاب نبی پر وحی آتی رہی) یہ ہے کہ:

''ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں ہے مگر صاحبِ وحی ہے''یعنی نبی، وحی کے بغیر نہیں ہوسکتا اور کتاب کے بغیر نبی ہوسکتا ہے۔ اب اگر وحی کتاب کے ساتھ مختص ہوگی، تو ہر نبی کو صاحب کتاب ہونا چاہیے، حالانکہ اس بات پر اجماع ہے کہ ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں ہے، اور صاحب وحی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰۤی اِلَیَّ (1)

''کہہ دے کہ میں تمہارے جیسا آدمی ہوں، (یعنی بشریت میں تم جیسا ہوں، فرق یہ ہے کہ) میری طرف وحی کی جاتی ہے''۔

1- سورۃ الکہف:110

اس سے ظاہر ہو گیا کہ نبی، غیرِ نبی سے صرف وحی میں ممتاز ہے، بغیر وحی کے نبی ہو ہی نہیں سکتا۔

وحی کیا چیز ہے؟

اللہ کا بشر سے کلام کرنا ''وحی'' ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (1)

''یعنی اللہ تعالیٰ بشر سے صرف تین طریقوں سے کلام کرتا ہے، (1) وحی سے، (2) پردہ کے پیچھے سے، (3) ایک رسول (فرشتہ) کو بھیجتا ہے، وہ (فرشتہ) اس (اللہ تعالیٰ) کی اجازت سے، اس کی مشیت کے موافق، اس انسان پر وحی کر دیتا ہے۔''

یہ تین طریقے ہیں وحی کے، اور تینوں وحی ہیں۔

''اِلَّا وَحْيًا'' میں وحی صاف ہے، ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کلام کیا تھا، یہ بھی وحی ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (2)

(ترجمہ:) ''میں نے تجھ کو پسند کر لیا، تو سن وہ جو وحی کی جا رہی ہے''۔

حضرت موسیٰ سے جو کلام کیا اس کو اللہ تعالیٰ نے وحی سے تعبیر کیا، ''اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ'' میں وحی موجود ہے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ کا بشر سے کلام کرنا وحی ہے اور جس پر وحی ہو وہ نبی ہے؛ کیونکہ فرق، نبی اور غیر نبی کا صرف وحی ہے۔

اب ہم کو یہ سمجھانا ہے کہ قرآن شریف جبریل روح الامین لے کر آئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

1- سورۃ الشوریٰ:51

2- طٰہٰ:13

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (1)

''قرآن کو روح الامین لے کر آئے ہیں''۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (2)

''جبرئیل نے تیرے دل پر قرآن اتارا''۔

اس سے صاف واضح ہوگیا کہ ''يُرْسِلَ رَسُوْلًا'' میں جس وحی کی طرف اشارہ ہے وہ قرآن مجید ہے، وہ رسول اور فرشتہ جو باذنِ الٰہی وحی کرتا ہے، وہ صرف قرآن ہے اور واضح ہوگیا کہ وحی کا انحصار قرآن ہی میں نہیں ہے بلکہ قرآن سے علیحدہ، دو وحیاں اور ہیں، جس کی طرف ''اِلَّا وَحْيًا'' اور ''اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' میں اشارہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی کی قسمیں بتائیں اور قرآن شریف تیسری قسم یعنی ''اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا'' میں شامل ہے ''اِلَّا وَحْيًا'' اور ''اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' یہ دونوں قرآن کے علاوہ ہیں؛ کیونکہ قرآن کو روح الامین (جن کو آیت میں رسول سے تعبیر فرمایا ہے) لے کر آئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ وحی کا انحصار صرف قرآن شریف میں نہیں ہے، بلکہ وحی علاوہ قرآن شریف کے ان دو طریقوں پر (یعنی ''اِلَّا وَحْيًا'' اور ''اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'') بھی ہوتی ہے۔

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ انبیائے سابقین پر بھی وحی ہوئی اور وہ وحی کتاب نہیں تھی، حضرت آدم سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا:

وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ (3)

''اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو سہو''۔

يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ (4)

1- سورۃ الشعراء:193

2- سورۃ البقرہ:97

3- سورۃ البقرہ:35

4- سورۃ البقرہ:33

''اے آدم! ان کو (یعنی فرشتوں کو) ان اشیاء کے نام بتا دے''۔

وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا (1)

''ان کے رب نے ان کو پکارا کہ کیا میں نے تم دونوں کو منع نہیں کیا تھا''۔

اللہ تعالیٰ نے آدم سے بار ہا کلام کیا اور یہ کلام، کتاب نہ تھا۔

حضرت نوح پر وحی کی:

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (2)

''نوح کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے اب کوئی ایمان نہیں لائے گا، جو ایمان لانے والے تھے وہ لا چکے''۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ (3)

''جب تو اور تیرے ساتھی کشتی پر سوار ہو جائیں''۔

يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (4)

''اے نوح! وہ (یعنی تیرا بیٹا) تیرے اہل میں سے ہے ہی نہیں''۔

الغرض! متعدد کلام حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوئے یہ سب وحی تھے اور کتاب نہ تھے، کیونکہ مایوسی کے وقت، ڈوبنے کے وقت اور نجات پانے کے وقت، کتاب کی ضرورت نہیں تھی، کتاب کا نزول بشارت اور انذار اور رفعِ اختلاف کے لیے ہوتا ہے، وہ اس وقت مقصود نہ تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی ہوئی:

يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا (5)

''اے ابراہیم! چھوڑ بھی اس خیال کو''۔

یہ وحی تھی اور کتاب نہ تھی:

1- سورۃ الاعراف:22

2- سورہ ھود:36

3- سورۃ المؤمنون:28

4- سورہ ھود:46

5- سورہ ھود:76

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ (1)

''حضرت ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ کے لیے یہ حجت ہم نے دی تھی''۔

حضرت ابراہیم نے کواکب اور شمس وقمر کے غروب اور غائب ہونے سے، ان کے حدوث پر استدلال کیا، اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنالیا اور کہا کہ: یہ حجت ہم نے ابراہیم کو سکھائی تھی، یہ وحی تو تھی، مگر کتاب نہ تھی۔

حضرت یعقوب نے فرمایا:

اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ (2)

''مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے''۔

حاضرین نے کہا کہ، آپ تو وہی پرانے خیالات میں ہیں، پھر جس وقت آپ بینا ہو گئے، تو فرمایا:

اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (3)

''مجھے اللہ کی طرف سے وہ باتیں معلوم ہوجاتی ہیں، جو تمہیں معلوم نہیں ہوتیں''۔

بس یہ وحی ہے مگر کتاب نہیں ہے، کتاب ہوتی تو بیٹوں کو اور تمام حاضرین کو معلوم ہوجاتی، اس کی تو تبلیغ فرض تھی۔

حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی ہوئی:

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا (4)

''ہم نے یوسف کو وحی کی کہ تو اُن کی اِس غلطی پر، اُن کو متنبہ کرے گا''۔

چنانچہ انھوں نے ان کو متنبہ کیا:

هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ (5)

1- سورۃ الانعام:83

2- سورہ یوسف:95

3- سورہ یوسف:96

4- سورہ یوسف:15

5- سورہ یوسف:89

''تمھیں کچھ پتہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ تم نے کیسا (برا) برتاؤ کیا تھا''۔
بہرحال یہ وحی کنوئیں میں ڈالتے وقت ہوئی تھی اور یہ وحی کتاب نہ تھی۔
حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو طور پر وحی ہوئی:
يٰمُوسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ (1)
''اے موسیٰ! میں ہی معبود ہوں''۔
یہ وحی تھی، کیونکہ فرمایا:
فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (2)
''سن! جو وحی (تیری طرف) کی جارہی ہے''۔
بہرحال طُور کا کلام وحی ہے مگر کتاب نہیں:
وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ (3)
''ہم نے موسیٰ کو وحی بھیجی کہ اپنا عصا پھینک دے''۔
یہ وحی ہے اور کتاب نہیں ہے؛ کیونکہ توریت ان وحیوں کے بہت عرصہ بعد نازل کی گئی تھی۔
وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ (4)
''ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا''۔
یہ وحی ہے اور کتاب نہیں ہے، الغرض! متعدد وحیاں ان حضرات کو ہوئیں اور یہ وحیاں کتابیں نہ تھیں۔
حضرت لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملائکہ نے کہا:
يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ (5)
''اے لوط! ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں''۔

1- سورۃ القصص:30
2- سورہ طٰہٰ:13
3- سورۃ الاعراف:117
4- سورۃ الشعراء:52
5- سورہ ھود:81

یہ وحی تھی کتاب نہ تھی؛ کیونکہ عذاب کے وقت کتاب کیسی؟ عذاب کے وقت کتاب، بے سود چیز ہے۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (1)

''بنی اسرائیل کے نبی نے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے''۔

یہ وحی ہے کتاب نہیں ہے۔

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی ہوئی:

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ (2)

''ہم نے اس فیصلہ کو سلیمان کو سمجھا دیا''۔

یہ وحی تھی کتاب نہ تھی، کتاب ہوتی تو حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام اسے جانتے۔

حضرت زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی ہوئی:

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ (3)

''اے زکریا! ہم تجھے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں''۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ (4)

''فرشتوں نے ان کو آواز دی جس وقت وہ نماز پڑھنے محراب میں کھڑے ہوئے تھے''۔

اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى (5)

''کہ اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے''۔

تو یہ وحی تھی کتاب نہ تھی، اگر کتاب میں یہ مضمون ہوتا تو نہ دعا مانگتے، نہ تعجب کرتے۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہوئی:

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ (6)

1- سورۃ البقرہ:247

2- سورۃ الانبیاء:79

3- سورہ مریم:7

4- سورہ آل عمران:39

5- سورہ آل عمران:39

6- سورۃ المائدہ:115

''اللہ نے کہا: میں تمہارے اوپر خوان اتاروں گا''۔

یہ وحی تھی کتاب نہ تھی؛ کیونکہ اگر یہ کتاب ہوتی تو نہ حواری مطالبہ کرتے، نہ ضد و بحث ہوتی، یعنی کتاب میں یہ مضمون ہوتا کہ اللہ خوان اتار سکتا ہے اور اتارے گا، تو اس صورت میں مطالبہ ہی نہ ہوتا؛ کیونکہ انجیل، توریت وغیرہ سب دفعتاً نازل ہو چکی تھیں۔

الغرض! جو نبی صاحبِ کتاب نہیں تھے ان پر تو صرف وحی ہی وحی نازل ہوئی اور جو صاحب کتاب تھے ان پر کتاب سے پہلے اور کتاب کے بعد برابر وحی ہوتی رہی اور قرآن شریف میں بکثرت یہ وحیاں مذکور ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی بشر سے کلام کرنا ہی ''وحی'' ہے، اور اس کی تین قسمیں ہیں، اور ''کتاب'' اس کی ایک قسم ''اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا'' میں مشتمل ہے، وحی عینِ کتاب نہیں ہے، وحی کبھی کتاب ہوگی، کبھی ''اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' ہوگی، کبھی خالص وحی ہوگی۔

(حضرت محمد ﷺ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی جو کہ درج ذیل دلائل سے ثابت ہے:)

اب خاص طور سے اسے سمجھئے کہ حضرت محمد ﷺ پر وحی علاوہ قرآن شریف کے بھی آتی تھی۔

پہلی دلیل:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (1)

''جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے چپکے سے ایک حدیث (بات) بیان کی، پھر اس بیوی نے اس کو کسی دوسری سے کہہ دیا اور اللہ نے نبی پر اس واقعہ کو ظاہر کر دیا (یعنی اللہ نے نبی پر یہ ظاہر کر دیا کہ تیری بیوی نے اس بات کو دوسری بیوی پر ظاہر کر دیا ہے) تو نبی ﷺ نے اس بیوی سے کچھ حصہ بیان کیا اور کچھ نہیں بیان کیا، جب نبی نے بیوی کو اس واقعہ کی خبر دی تو بیوی نے کہا کہ:

1- سورۃ التحریم:3

آپ کو کس نے خبر دی، تو نبی ﷺ نے کہا کہ: مجھے علیم وخبیر نے خبر دی ہے''۔

اللہ نے نبی پر یہ واقعہ ظاہر کیا، ''اَظْھَرَہُ اللہُ'' اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ نے اس کا اظہار جو نبی پر کیا ہے، یہ وحی تھی اور نبی نے جو یہ کہا کہ ''علیم وخبیر نے خبر دی'' یہ وحی تھی، اس آیت کے دونوں ٹکڑے ''وحیِ غیرِ قرآن'' پر دلالت کر رہے ہیں؛ کیونکہ اللہ نے نبی پر جو اس واقعہ کو ظاہر کیا ہے، یہ قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہے اور نبی نے جو یہ کہا کہ: ''مجھے علیم وخبیر نے خبر دی ہے'' تو علیم وخبیر کا یہ خبر دینا کہیں قرآن میں مذکور نہیں ہے، اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ قرآن کے علاوہ نبی ﷺ پر وحی ہوئی۔

دوسری دلیل:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ(1)

''کھجور کے درخت جو تم نے کاٹ دیئے یا ان کی جڑوں پر باقی رہنے دیئے تو یہ (جو کچھ تم نے کیا ہے) اللہ کی اجازت سے کیا ہے''۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ نبی ﷺ پر قرآن کے علاوہ وحی ہوئی؛ کیونکہ جس حکم کے ذریعہ ان درختوں کو کاٹا گیا وہ حکم قرآن شریف میں کہیں نہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ ''اذنِ الٰہی'' کس جگہ ہے؟ قرآن میں ہے یا قرآن سے باہر ہے؟ اگر قرآن میں ہے تو دکھاؤ کہاں ہے؟ ہرگز قرآن میں ان درختوں کے کاٹنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن قرآن سے اجازت ثابت ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ اجازت ''دوسری وحی'' سے ہے جو علاوہ قرآن شریف کے ہوئی۔

تیسری دلیل:

سورۂ بقرہ وآلِ عمران وغیرہ یہ سب سورتیں مدنی ہیں، جو تقریباً دس سال بعد نازل ہوئی ہیں تو جس طرح یہ نازل ہوئی تھیں، اسی طرح ان کو کیوں ترتیب نہیں دیا گیا، جو سورۃ پہلے نازل ہوئی وہ پہلے لکھی جاتی، جو پیچھے نازل ہوئی وہ پیچھے لکھی جاتی، لیکن ایسا نہیں کیا،

1- سورۃ الحشر:5

بلکہ پہلے نازل شدہ سورتیں پیچھے لکھی گئیں اور پیچھے والی پہلے لکھی گئیں، اللہ تعالیٰ فرمایا ہے کہ:

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (1)

''جو لوگ ہماری ملاقات کے آرزومند نہ تھے، وہ کہنے لگے کہ: اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لا، یا اس کو بدل دے۔ کہہ دے: مجھ سے کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو صرف وحی کا پابند ہوں''۔

اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ تبدیلی بغیر وحی کے نہیں ہوسکتی، یہ جو نبی ﷺ نے تبدیلی ''تنزیلی ترتیب'' میں کی ہے، یہ وحی سے کی ہے اور یہ وحی قرآن میں مذکور نہیں ہے، یعنی کہیں قرآن میں یہ نہیں ہے کہ ''اے نبی یہ سورت یہاں لکھواؤ، یہ وہاں'' لہٰذا قرآن کے علاوہ وحی ہوئی۔

چوتھی دلیل:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (2)

''یہ صرف اسماء (نام) ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں اللہ کی منظوری کے بغیر''۔

اس سے ظاہر ہوگیا کہ اللہ کی منظوری کے بغیر نام رکھنا، ناجائز ہے؛ لہٰذا جو سورتوں کے نام نبی ﷺ نے رکھے ہیں ''سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران وغیرہ'' یہ قطعی اللہ کی مرضی سے رکھے ہیں، اور یہ منظوری قرآن میں کہیں نہیں دی، بلکہ قرآن کے علاوہ منظوری دی گئی، یہی وحی ہے جو قرآن کے علاوہ ہے۔

1- سورہ یونس:15

2- سورۃ النجم:23

پانچویں دلیل:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ (1)

''جب قرآن پڑھا جائے تو سنو''۔

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (2)

''جب ہم قرآن پڑھیں تو اس کی پیروی کرو''۔

مگر قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ''اے نبی! جب قرآن نازل ہوا کرے تو لکھ لیا کرو'' یہ جو نبی ﷺ نے قرآن کو لکھوایا، یہ کس وحی سے آیا؟ وحیِ قرآنی سے؟ تو وحی قرآنی تو ساکت ہے؛ لہٰذا ''وحیِ غیرِ قرآنی'' سے اس کو لکھوایا۔

چھٹی دلیل:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (3)

''دو دو، تین تین، چار چار، جو عورتیں اچھی لگیں، ان سے نکاح کر سکتے ہو''۔

ہم پوچھتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جو چار سے زیادہ نکاح کئے یہ کس وحی سے؟ وحی قرآنی میں تو صرف چار تک کا حکم ہے، نبی ﷺ کا یہ فعل بالضرور ''وحی غیر قرآنی'' سے ہوا۔

ساتویں دلیل:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (4)

1- سورۃ الاعراف:204

2- سورۃ القیامہ:18

3- النساء:3

4- سورۃ القیامہ:18،19

''جب ہم قرآن کی تلاوت کریں، تو اس کی پیروی کرو (یعنی سنو)، پھر (اس کے بعد) اس کا سمجھانا ہمارے ذمہ ہے''۔

یعنی قرآن کے نازل ہونے کے بعد، قرآن کا بیان کرنا اور واضح کرنا، اللہ کے ذمہ ہے۔

اب ہم کہتے ہیں کہ، یہ بیانِ قرآن، قرآن ہے یا قرآن سے علیحدہ ہے؟ اگر قرآن ہے، تو اس قرآن کے لیے پھر بیان کی کیا ضرورت ہے؟ اگر قرآن کے علاوہ ہے تو بیانِ قرآن، قرآن سے علیحدہ ''منزّل من اللہ'' ہوگیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: بیانِ قرآن ہمارے ذمہ ہے اور بیانِ قرآن، غیرِ قرآن ہے؛ کیونکہ اگر بیانِ قرآن، قرآن ہوگا، تو تسلسل لازم آئے گا؛ لہٰذا بیانِ قرآن، غیرِ قرآن ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی وحی ثابت ہوگئی، جو قرآن سے علیحدہ ہے۔

آٹھویں دلیل:

بیت المقدس کو تقریباً سترہ مہینے نبی ﷺ نے قبلہ بنائے رکھا، یہ کس وحی سے بنایا؟ وحیِ قرآن تو ساکت ہے، قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ ''اے نبی ﷺ! تم بیت المقدس کو قبلہ بناؤ''۔ اور نبی صرف وحی کا پیروکار ہے؛ لہٰذا بیت المقدس کو جس وحی سے قبلہ بنایا، وہ وحیِ غیرِ قرآنی ہے۔

نویں دلیل:

نبی ﷺ فرما رہے تھے کہ: تین ہزار فرشتوں کی امداد تمہیں کافی نہیں ہے۔

اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُنْزَلِیْنَ (1)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کو نقل کیا ہے، نبی ﷺ کے اس قول سے قبل، یہ قول کہیں قرآن میں نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ نبی ﷺ کو اس قول کی وحی،

1- سورہ آل عمران:124

قرآن سے الگ ہوئی تھی۔

دسویں دلیل:

یُوۡصِیۡ بِهَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ (1)

اس آیت میں وصیت مقدم ہے، دَین (قرض) پر، لیکن نبی ﷺ نے دَین کو وصیت پر مقدم کر دیا اور نبی، وحی کے خلاف نہیں کر سکتا اور وحی قرآنی میں اس تبدیلی کا حکم موجود نہیں ہے؛ لہٰذا قرآن کے علاوہ وحی ہوئی تھی۔

گیارہویں دلیل:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمۡ (2)

''اللہ تعالیٰ نے تم کو جس طرح ہدایت کی ہے اس طرح تکبیر کہو''۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تکبیر کا طریقہ نہیں بیان کیا، صرف نبی ﷺ نے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کو اپنی طرف منسوب کیا، اس سے ظاہر ہو گیا کہ، نبی کو وحی کی کہ ''اس طرح تکبیر کہو یا تکبیر پڑھو''۔ اور یہ وحی کہ اس طرح تکبیر کہو، قرآن شریف میں شامل نہیں ہے۔

بارہویں دلیل:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِذۡ قُلۡنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ (3)

''(یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ: بیشک! تیرے رب نے لوگوں کو گھیر لیا ہے''۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ قرآن شریف کے علاوہ دوسری وحی

1- سورۃ النساء:11

2- سورۃ البقرہ:185

3- سورہ بنی اسرائیل:60

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوئی؛ کیونکہ قرآن شریف میں ''اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ'' کہیں نہیں ہے، اور یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ بے شک لوگوں کو تیرے رب نے گھیر لیا ہے''۔ تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کے علاوہ، دوسری وحی کے ذریعہ کہا تھا کہ:

''اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ'' یعنی ''تیرے رب نے لوگوں کو گھیر لیا ہے''۔ اور اب اس کہنے کو یاد دلایا ہے۔

تیرھویں دلیل:

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (1)

''اللہ نے اپنے بندہ کو جو وحی کرنی تھی کی''۔

یہ صاف دلیل ہے کہ جو کچھ وحی ہوئی، وہ وحی قطعاً قرآن نہیں ہے، اس لیے کہ وحیِ قرآنی سب کو معلوم ہے اور اس وحی کا کسی کو صحیح پتہ نہیں، نیز قرآن یا مکی ہے یا مدنی اور یہ وحی نہ مکی ہے، نہ مدنی۔

غرض بے شمار دلیلیں موجود ہیں، قرآن کے علاوہ دوسری وحی پر (جیسا کہ)

وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (2)

''وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، اس کا نطق صرف وحی ہے'' (سے ظاہر ہوتا ہے)۔

اب اگر کوئی کہے کہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف قرآن اپنی خواہش سے نہیں بولتا تو یہ غلط ہے؛ اس لیے کہ ''قرآن'' کو آیت میں محذوف نکالنا پڑے گا اور حذف ''خلافِ اصل'' ہے، دوسرے ''ھو'' کی ضمیر کا مرجع اوپر مذکور نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ، نہ سیدھے رستے سے رکا اور نہ ٹیڑھا چلا۔

1- سورۃ النجم:10

2- سورۃ النجم:3،4

عمل کی صفائی: مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَ مَا غَوٰی [1] سے کردی اور قول کی صفائی: مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی [2] سے کردی، یعنی اس کا قول وفعل ''من جانبِ اللہ'' ہے۔

اس کے علاوہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مطلقاً ''نطقِ ہوائی (خواہشات)'' کی نفی ہے اور اگر قرآن کے ''نطق ہوائی'' کی نفی ہوگی اور اس کے علاوہ الگ ''نطق ہوائی'' ہوگا تو ''نطق ہوائی'' سے ''نطق غیر ہوائی'' قطعاً ثابت نہیں ہوگا؛ کیونکہ جس وقت وہ یہ کہے گا کہ: ''یہ اللہ کا قول ہے یعنی یہ کہے گا کہ ''الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ'' اللہ تعالیٰ کا قول ہے تو نبی ﷺ کا یہ قول اگر ''ہوا (خواہش)'' سے ہوگا، تو اللہ تعالیٰ کا قول اس ''ہوائی قول'' سے ہرگز ثابت نہیں ہوگا؛ لہٰذا اُس (نبی ﷺ) کا ہر قول ''غیر ہوائی'' ہے اور وحی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ نبی کا ہر قول وفعل جو قرآن میں مذکور نہیں ہے، اس کی بابت کیا کہتے ہو؟ اگر وحی سے ہے، تو قرآن کے علاوہ وحی ثابت ہوگئی اور اگر وحی سے نہیں ہے تو اس آیت کے خلاف ہوجاتا ہے کہ:

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ [3]

''میں تو صرف وحی کا پیرو ہوں''۔

اگر کوئی کہے کہ: نبی کا ہر قول وفعل وحی سے ہے اور وحیِ قرآنی سے ہے، بعض اقوال و افعال ''نص'' سے ہیں، بعض استنباط سے ہیں تو یہ غلط ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللہُ [4]

''تاکہ تم لوگوں میں فیصلہ کرو، جس طرح اللہ تعالیٰ تمہیں دکھائے''۔

1- سورۃ النجم:2

2- سورۃ النجم:3

3- سورہ یونس:15

4- سورہ النسآء:105

اللہ تعالیٰ جو معنی دکھاتا تھا، اس پر حکم صادر فرماتے تھے، استنباط نہیں کرتے تھے، اس کے علاوہ استنباط کے لیے ''اشتراکِ علت'' ضروری ہے، جہاں علّت مشترک نہیں، وہاں استنباط نہیں ہوسکتا، اب دیکھیے:

''شدید القویٰ: عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (1) میں، روح الامین: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (2) میں اور روح: فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا (3) میں، رسول کریم: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ''۔(4) میں، ان سب سے مراد ''جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام'' ہیں۔

دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی استنباط نہیں کرسکتیں کہ ان الفاظ کے معنی ''جبریل'' ہیں، جب تک متکلم خبر نہ دے کہ ان الفاظ سے ''جبریل'' مراد ہے، قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ ان الفاظ سے جبریل سمجھ لینا۔

اسی طرح ''ذوالنون'' اور ''صاحبِ حُوت'' سے مراد ''یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام'' ہیں، کہیں سے بھی مستنبط نہیں ہوسکتا، خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کے ایسے اقوال موجود ہیں اور ایسے افعال موجود ہیں جو قطعاً نہ قرآن میں موجود ہیں، نہ قرآن سے ثابت ہیں، نہ اشارۃً، نہ اقتضاء، نہ دلالتاً۔ بتاؤ یہ اقوال و افعال بالوحی ہیں یا نہیں؟ اگر بالوحی ہیں تو یہ وہی وحی ہے جس کے ہم درپے ہیں، اگر بالوحی نہیں ہیں تو قطعی اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ کے خلاف ہیں، اور ایسا کہنا کفر ہے کہ نبی ﷺ وحی کے پیرو نہ تھے۔ (معاذ اللہ) بہرحال نبی ﷺ کا ہر قول و فعل بالوحی تھا۔

❖❖❖❖❖

1- سورۃ النجم:5

2- سورۃ الشعراء:193

3- سورۃ مریم:17

4- سورۃ التکویر:19

حدیثِ رسول ﷺ فی نفسہٖ دین میں حجت ہے یا نہیں؟

سوال: حدیثِ نبی ﷺ اور نبی ﷺ کا قول حجّت ہے یا نہیں؟

جواب: نبی ﷺ کا قول حجّت ہے۔

ثبوت: یہاں تین صورتیں ہیں:

1۔ ایک تو یہ کہ نبی ﷺ کا ہر قول حجت ہے۔

2۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نبی ﷺ کا کوئی قول حجت نہیں ہے۔

3۔ تیسری صورت یہ ہے کہ نبی ﷺ کے بعض قول حجت ہیں اور بعض نہیں ہیں۔

بس صرف تین صورتیں اور تین شقیں ہیں اور کوئی شق نہیں ہے، تیسری شق (یعنی نبی ﷺ کے بعض قول حجت ہیں اور بعض حجت نہیں) یہ شقّ باطل ہے؛ اس لیے کہ بعض قول کا حجت ہونا اور بعض قول کا حجت نہ ہونا، یہ ترجیح بلا مرجّح اور تخصیص بغیر مخصص ہے۔

ترجیح بلا مرجّح اور تخصیص بلا مخصص کے یہ معنی ہیں کہ بعض قول حجت ہیں بغیر وجہ کے اور بعض قول حجت نہیں ہیں بغیر وجہ کے، یعنی جبکہ نبی ﷺ کے قول دونوں ہیں (وہ بعض بھی جو حجت ہیں اور وہ بعض بھی جو حجت نہیں ہیں) تو بغیر وجہ کے ایک بعض (قول) حجت ہو دوسرا بعض (قول) حجت نہ ہو، اس کو ترجیح بلا مرجّح اور تخصیص بلا مخصص کہتے ہیں، اور ترجیح بلا مرجّح اور تخصیص بغیر مخصص بداہۃً باطل ہے؛ لہٰذا بعض قول کا حجت ہونا اور بعض قول کا حجت نہ ہونا یہ شقّ بالکل باطل ہوگئی؛ اس لیے کہ "یہ بعض" بھی نبی ﷺ کے قول ہیں جو حجت ہیں اور "وہ بعض" بھی نبی ﷺ کے قول ہیں جو حجت نہیں ہیں اور قول ہونے میں دونوں برابر ہیں تو یہ بات غیر معقول ہے کہ ایک بعض تو حجت ہو اور دوسرا بعض حجت نہ ہو؛ کیونکہ جب دونوں نبی ﷺ کے قول ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایک تو حجت ہو اور دوسرا حجت نہ ہو؟

اس دلیل کا حاصل یہ ہے کہ جو بعض قول حجت ہیں، اس بعض قول کے حجت (دلیل) ہونے پر کونسی شے حجت ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض قول کے حجت ہونے پر اللہ تعالیٰ کا قول حجت ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول اگر اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق ہے تو بے شک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول حجت ہے اور اگر اللہ کے قول کے مطابق نہیں ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول اس وقت حجت نہیں ہے۔

اس مقولہ (بات) کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول اللہ تعالیٰ کے قول (یعنی قرآن) کے مطابق ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول حجت ہوگا، ورنہ نہیں، یعنی ترجیح بلا مرجّح اور تخصیص بلا مخصص لازم نہیں آتی؛ کیونکہ مرجِّح اور مخصص اللہ تعالیٰ کے قول کی مطابقت ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قول اور قرآن کی آیت، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول پر اس وقت حجت ہوگی کہ جب اللہ تعالیٰ کا قول اور قرآن کی آیت معلوم ہوجائے اور معین ہوجائے کہ، ''یہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل ہوئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کا قول ہے، یہ قرآن ہی کی آیت ہے''، اور ''قول اللہ اور آیت اللہ'' کا معلوم ہونا اور معین ہونا ناممکن ہے، جب تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معلوم نہ کرائے اور معین نہ کرے اور جب نبی معلوم کرائے گا بتائے گا اور معین کرے گا، تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ قول جس سے اس آیت کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معلوم کرائے گا، اِس آیت اور اس قولِ الٰہی کی معلومیّت اور تعیّن پر حجت ہوگا، تب کہیں جا کے یہ آیت اور قولِ الٰہی حجت ہوگا اور یہ معاملہ بالکل الٹا ہوگیا۔

یعنی کہا یہ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا قول، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول پر حجّت ہے اور ثابت یہ ہوگیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول، اللہ تعالیٰ کے قول پر حجّت ہے، اور یہی حق ہے؛ لہٰذا تیسری شق کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بعض قول حجت ہے اور بعض حجت نہیں، باطل ہوگئی۔

اب رہی دوسری شق کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول حجّت نہیں'' یہ کہنا کفر وجنون، ہے اور پوری قوم کے اجماع کے خلاف ہے۔

نیز ہم کہتے ہیں، اگر نبی ﷺ کا کوئی بھی قول حجت نہیں ہوگا، تو خدا تعالیٰ کا قول بھی حجت نہیں ہوگا؛ کیونکہ نبی ﷺ جب یہ کہے گا کہ:

''آج مجھ پر ''قُلْ هُوَ اللهُ'' کی سورۃ نازل ہوئی'' اور جب نبی ﷺ کا کوئی بھی قول حجّت نہیں تو یہ قول بھی حجّت نہیں رہا اور جب یہ قول (یعنی کہ آج مجھ پر ''قُلْ هُوَ اللهُ'' کی سورۃ نازل ہوئی ہے) حجّت نہیں رہا، تو چونکہ یہ قولِ نبی ''قُلْ هُوَ اللهُ'' کو شامل ہے؛ اس لیے قولِ الٰہی ''قُلْ هُوَ اللهُ'' بھی حجت نہیں رہا، حالانکہ یہ (قُلْ هُوَ اللهُ) بالاتفاق خدا کا قول وحجّت ہے، تو لابدّ (یقیناً) نبی ﷺ کا قول بھی حجت ہوگیا، اور یہ شق کہ ''نبی ﷺ کا کوئی قول حجت نہیں ہے'' بالکل باطل ہوگئی اور جب پچھلی دونوں شقیں باطل ہوگئیں تو بالضرور پہلی شق (یعنی نبی کا ہر قول حجت ہے) ثابت ہوگئی، غور کرنا چاہیئے۔

اب قرآن شریف سے ہم ثابت کرتے ہیں کہ قولِ رسول ﷺ حجت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (1)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اور تم میں سے جو اُولِی الْاَمْرِ ہیں، ان کی اطاعت کرو، پھر اگر کسی شے میں تم کو اختلاف ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرلو، اگر تم اللہ اور روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اور کسی ذی شعور اور بااختیار کی اطاعت، اُس ذی شعور اور بااختیار کے حکم اور قول کی اطاعت ہوا کرتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے یہ معنی ہیں کہ اس کے قول کی اطاعت ہو، اور یہ اطاعت صرف قرآن کی اطاعت ہے۔

1- سورۃ النساء:59

یہاں سے معلوم ہوا کہ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ'' کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کی اطاعت کرو، اسی طرح ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کے بھی یہی معنی ہیں کہ رسول ﷺ کے قول کی اطاعت کرو۔

اب اگر کہو کہ رسول ﷺ کا قول اور قرآن دونوں ایک ہی چیز ہیں تو یہ بالکل غلط ہے، اور اگر رسول ﷺ کا قول اَور چیز ہے اور قرآن اَور چیز ہے (یعنی دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں) تو اس صورت میں اس آیت کے حکم کے مطابق، قولِ رسول ﷺ علاوہ قرآن کے حجّت ہو گیا۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ رسول ﷺ کی اطاعت کے یہ معنی ہیں کہ قرآن کی رُو سے، قرآن کی روشنی میں، رسول ﷺ جو اقوال اور احکام بیان کرے، وہ مانو اور اسی طرح ''اولی الامر'' قرآن کی روشنی میں جو احکام صادر کریں، وہ مانو۔

تو ہم کہتے ہیں کہ رسول ﷺ کے وہ اقوال و احکام اور ''اولی الامر'' کے وہ احکام جو ہرگز قرآن کی روشنی میں نظر نہیں آتے، وہ قطعاً اس وقت نا قابلِ اطاعت ہوں گے اور ان کی اطاعت واجب نہیں ہوگی۔

اس کی توضیح ایک مثال سے ہو سکتی ہے، رسول ﷺ نے فرمایا کہ: صبح کی نماز میں فرض دو رکعتیں ہیں اور مغرب کی نماز میں تین رکعتیں ہیں، باقی تینوں نمازوں میں چار چار رکعتیں ہیں، اور نبی ﷺ کا یہ قول تواتر سے ثابت ہے، اور نبی ﷺ کا یہ قول، نہ قرآن میں نظر آتا ہے، نہ قرآن کی روشنی میں نظر آتا ہے تو اب بولو کیا کہتے ہو؟

نبی ﷺ کا یہ قول واجبِ اطاعت ہے یا نہیں؟ اگر کہو: ہاں واجبِ اطاعت ہے، تو بے شک نبی ﷺ کے قول کے حجّت ہونے کے یہی معنی ہیں، اور اگر کہو کہ، نبی ﷺ کا یہ قول واجبِ اطاعت نہیں ہے، تو یہ کفر و جنون کا مجموعہ ہے۔

یعنی جو شخص صبح کے دو فرض اور مغرب کے تین فرض اور باقی نمازوں کے چار چار فرض نہ مانے، وہ کافر ہے اور مجنون ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن بغیر شرط کے حجّت ہے، اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ عقل کے

مطابق ہو یا نہ ہو، بالکل اسی طرح نبی ﷺ کا قول بھی حجت ہے، خواہ وہ نبی ﷺ کا قول قرآن سے ماخوذ ہو، خواہ ماخوذ نہ ہو، مستقل طور پر نبی ﷺ کا قول ہو، تب بھی حجت ہے، یعنی جس طرح ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ'' قرآن کے حجّت ہونے پر دلالت کر رہا ہے، اسی طرح ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' نبی ﷺ کے قول کے حجت ہونے پر دلالت کر رہا ہے، اسی طرح ''اُولِی الْاَمْرِ'' کا لفظ اجماع کے حجّت ہونے پر دلالت کر رہا ہے، اور یہ تینوں بلاشرط، مستقل حجّتیں ہیں، برخلاف حاکم وامام اور باپ وغیرہ کی اطاعتوں کے؛ کیونکہ یہ اطاعتیں مشروط ہیں، اگر قرآن اور حدیث یا دین کے مطابق ہوں تو اطاعت کی جائے گی، ورنہ نہیں کی جائے گی۔

حاصل یہ ہے کہ، اس وقت جو متفق علیہ دین ہے، وہ کُل کا کُل قرآن سے ثابت نہیں ہے بلکہ کچھ حدیث (یعنی قول رسول ﷺ) سے ثابت ہے، اور کچھ اجماع سے ثابت ہے، مثلاً: منکرِ فرضیّتِ صوم رمضان کافر ہے، یہ مسئلہ دین کا ہے، اگر چہ قرآن اور حدیث میں اس کی تصریح نہیں ہے، لیکن یہ اجماع سے ثابت ہے؛ لہٰذا یہ تینوں غیر مشروط حجتیں ہیں، اب رہا قیاس تو وہ مشروط حجّت ہے، اس میں شرط ہے کہ ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ'' بس اگر ان تینوں حجتوں کے بعد، کسی شرعی مسئلہ میں اختلاف ہو، تو اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی طرف رجوع کرلو (یعنی اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے، جو قرآن سے، حدیث سے، اجماع سے ثابت نہ ہو تو قرآن اور حدیث میں سے ملتا جلتا مسئلہ دریافت کرو، جو حکم قرآن وحدیث میں اُس مسئلہ کا ہے، وہی حکم اِس مسئلۂ مختلف فیہ کو دے دو، اِس کو قیاس کہتے ہیں۔)، اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اختلاف کے وقت قرآن کی طرف رجوع کرو؛ کیونکہ قرآن کی طرف اور حدیث کی طرف تو اوّلِ وَہلہ (پہلی دفعہ) میں رجوع ہوگا اور جب وہاں سے مسئلہ کا حکم نہ معلوم ہوگا تو پھر اختلاف ہوگا اور اختلاف کے بعد اُس مسئلۂ مختلف فیہ کی نظیر، قرآن وحدیث میں تلاش ہوگی اور جو حکم اُس کا ہوگا، وہی اِس کو دے دیا جائے گا، جیسا کہ تمام مجتہدین کرتے ہیں، لہٰذا اِس آیت میں چاروں حجّتوں کا بیان کر دیا، تین غیر مشروط ہیں،

ایک مشروط ہے۔

لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول حجت ہے اور یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ قرآن تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ہے ہی نہیں، قرآن تو خدا تعالیٰ کا قول ہے، جس کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نقل کیا ہے، لفظاً لفظاً قرآن کے علاوہ جتنی باتیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتا ہے (خواہ وہ باتیں قرآن سے ماخوذ ہوں، خواہ وہ باتیں (قرآن سے ماخوذ) نہ ہوں)، وہ سب باتیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول کہی جاتی ہیں اور ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُس قول کو حجت کہا ہے، جو نہ قرآن ہے، نہ قرآن سے ماخوذ ہے؛ کیونکہ اگر ہم (عام انسان) ایسا مضمون بیان کریں جو قرآن سے ماخوذ ہے تو اِس صورت میں ہمارا قول بھی حجّت ہوگا، قرآن کی ماخوذیت کے اعتبار سے، نہ یہ کہ ہمارا قول مستقل حجت ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول مستقل حجت ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کو تبلیغ کی تھی، تو اس وقت تورات نازل نہیں ہوئی تھی، تو اگر موسیٰ کا قول حجّت نہ ہوتا، تو فرعون مستوجبِ عتاب (عذاب کا مستحق) نہ ہوتا۔

غرضیکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول نزولِ کتاب سے قبل اور نیز نزولِ کتاب کے وقت اور نزولِ کتاب کے بعد، ہر وقت حجت ہے اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول (قطع نظر کتاب سے) حجّت نہ ہوگا، تو کثیر انبیاء کی نبوت باطل ہوجائے گی؛ کیونکہ کثیر انبیاء پر کتابیں نازل نہیں ہوئیں، تو اگر صرف کتاب ہی حجّت ہوتی تو بے کتاب نبی (یعنی وہ نبی جس کو کتاب نہ دی گئی ہو)، صاحبِ حجّت نہ ہوتا اور اس کا انکار کفر اور موجبِ عتاب (عذاب کا مستحق) نہ ہوتا، لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول حجّت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے دو قول ہیں، ایک قول کے ساتھ معجزہ متعلق ہے، دوسرے قول کے ساتھ معجزہ متعلق نہیں ہے، جس قول کے ساتھ معجزہ متعلق ہے، اس کو ''قرآن'' کہتے ہیں، (اور) جس قول کے ساتھ معجزہ متعلق نہیں ہے وہ قول ''قولِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کہلاتا ہے۔

توجس طرح ’’قول بالمعجزہ‘‘ حجت ہے، اسی طرح ’’قولِ بے معجزہ‘‘ بھی حجت ہے، جس طرح تمام سابقین انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے اقوال اور کتب، سب معجزہ سے خالی تھے اور باوجود معجزہ سے خالی ہونے کے، وہ سب کے سب حجت تھے، اسی طرح خاتم النبیین ﷺ کے جملہ اقوال حجت ہیں۔

اللہ تعالیٰ اگر کسی انسان کو بذریعہ وحی خطاب کرے تو یہ خطاب، ہی ’’نبوت‘‘ ہے اور یہ نبی عوام کو خطاب کرے تو یہ ’’خطابِ رسالت‘‘ ہے۔ اگر نبی کا خطاب عوام کے لیے حجّت نہ ہوگا تو رسالت حجت نہ رہے گی، تو اب کون سی چیز عوام پر حجت ہوگی؟ کیونکہ عوام کو تو خدا تعالیٰ کا خطاب، براہِ راست پہنچ نہیں سکتا، نبی کے ہی واسطے سے پہنچے گا، اس لیے بالضرور نبی کا خطاب جو خدا تعالیٰ کے خطاب کو متضمّن ہے، حجّت ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ معجزہ نبی ﷺ کی صداقت پر دلالت کر رہا ہے (یعنی معجزہ اس بات پر حجت ہے کہ مدّعیٔ نبوت، صادق ہے)، اور جو کچھ نبی ﷺ کہے گا، وہ سب صدق ہوگا، خواہ یہ کہے کہ، یہ قرآن ہے، یہ مجھ پر نازل ہوا، خواہ اس کے علاوہ کوئی اور بات کہے، تو جس طرح اس کے کہنے سے ’’قرآن‘‘ مانا جاتا ہے، اسی طرح اس کے کہنے سے قرآن کے علاوہ، دوسری بات مانی جاتی ہے اور وہ دوسری بات ’’نبی ﷺ کا قول اور نبی ﷺ کی حدیث‘‘ کہلاتی ہے۔

معجزہ نے نبی ﷺ کی مطلقاً صداقت ثابت کی ہے، معجزہ نے صرف یہ نہیں ثابت کیا کہ، اگر نبی ﷺ کوئی بات ’’من جانبِ اللہ‘‘ کہے تو وہ صادق ہے، بلکہ معجزہ نے مطلق صداقت نبی ﷺ کی، ثابت کی ہے، اب جب یہ ثابت ہوگیا کہ، نبی ﷺ صادق ہے تو اس صادق نے دو باتیں کہی ہیں، ایک کا نام ’’قرآن‘‘ ہے، دوسرے کا نام ’’حدیث‘‘ ہے تو جس طرح اس کی صداقت، قرآن پر حجت ہے، اسی طرح اس کی صداقت، حدیث پر بھی حجت ہے، یعنی ’’قرآن‘‘ کو نبی ﷺ کے کہنے سے مانا گیا ہے، تو گویا نبی ﷺ کا کہنا اور نبی ﷺ کا قول، قرآن کے قرآن ہونے اور قرآن کے حجت ہونے پر، حجت

ہے،تو قران کی حجیت کی علّت ، نبی ﷺ کا قول ہوا،اسی طرح نبی ﷺ کا قول،حدیث کے حجت ہونے پر اور حدیث کے قابلِ قبول ہونے پر، حجّت ہوا۔

بولو کیا کہتے ہو؟ قرآن کو قرآن کس کے کہنے سے،کس کے قول سے مانا؟ نبی ﷺ کے قول سے مانا، نبی ﷺ کے کہنے سے مانا،تو بے شک نبی ﷺ کا قول،حجتِ قرآن ہو گیا، بالکل اسی طرح نبی کا قول،تمام اقوالِ نبی ﷺ پر، حجت ہو گیا،یعنی معجزہ نے یہ بتادیا کہ، نبی ﷺ سچا ہے،اس کی بات مانو۔

قرآن شریف سے دوسرا ثبوت:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (1)

یعنی ”رسول،خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، اس لیے بھیجے ہیں کہ رسولوں کے آنے کے بعد،اللہ پر لوگوں کے لیے حجت باقی نہ رہے“۔

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ رسول لوگوں پر حجّت ہیں اور فرمایا:

وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (2)

”جب تک رسولوں کو نہیں بھیجتے،اس وقت تک ان کو عذاب نہیں کرتے“۔

یعنی رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں پر حجت قائم ہو جاتی ہے، پھر وہ لوگ رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اس انکار کے سبب،وہ مستحقِ عذاب ہو جاتے ہیں،اور فرمایا:

اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (3)

”بے شک تو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے“۔

اگر رسول ﷺ کا قول حجت نہ ہوتا تو اُس کی ہدایت،سیدھے راستے کی طرف نہ

1- سورۃ النساء:165

2- سورہ بنی اسرائیل:15

3- سورۃ الشوریٰ:52

ہوتی، اور فرمایا:

اِنَّكَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ (1)

''قطعی، تُو رَسول ہے اور سیدھے راستے پر ہے''۔

تو جو شخص سیدھے راستے پر خود ہو، اور سیدھے راستے کی ہدایت بھی کرے، اس کا قول حجت نہ ہو، یہ عجیب بات ہے، اور فرمایا:

لَقَدۡ كَانَ لَـكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ (2)

''تمہارے لیے رسول اللہ کا بہترین نمونہ ہے'' اور فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ فِيۡمَا شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ (3)

''قسم ہے تیرے پروردگار کی یہ مومن ہو ہی نہیں سکتے، جب تک کہ یہ اپنے تمام معاملات متنازعہ فیہ میں تجھ کو حکم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنالیں''۔

اور یہ نہیں فرمایا کہ، مجھے حکم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنالیں، بلکہ تجھ کو حکم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنالیں۔

اگر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول حجت نہ ہو تو پھر وہ کیوں کر حکم (فیصلہ کرنے والا) بن سکتا ہے، قرآن کی رُو سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم (فیصلہ کرنے والا) ہے اور حکم (فیصلہ کرنے والا) کا قول حجّت ہے، یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ حجّت کے معنیٰ ''موجبِ ایمان اور موجبِ عمل'' کے ہے، سو بعض حجت تو موجبِ ایمان و عمل ہے اور بعض صرف موجبِ ایمان ہے اور بعض حجّت صرف موجبِ عمل ہے۔

قرآن شریف کا وہ حصہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ ''اُمّ الکتاب'' اور ''آیاتِ محکمات'' ہیں، وہ موجبِ ایمان بھی ہے اور موجبِ عمل بھی، اور وہ حصہ جس کے

1- سورہ یٰس:3،4

2- سورۃ الاحزاب:21

3- سورۃ النساء:65

متعلق فرمایا ہے کہ متشابہات ہیں، وہ صرف موجبِ ایمان ہے، موجبِ عمل نہیں، اور اس کی پیروی (کھوج) کو زیغ (ٹیڑھا پن) اور کجی سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول کُل کا کُل موجبِ ایمان اور موجبِ عمل ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول میں تقسیم نہیں ہے، جس طرح خدا تعالیٰ کے قول میں تقسیم ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ قول جو بطریقِ ظنّ آیا ہے، وہ صرف موجبِ عمل ہے موجبِ ایمان نہیں ہے اور عنقریب اس کا بیان آتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قران بہر حال حجّت ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ، اس کے حجت ہونے کی کیا علّت ہے؟ اگر مِن جانبِ اللہ ہونا، حجّت ہونے کی علّت ہے، تو ہر وہ شے جو مِن جانبِ اللہ ہے، وہ حجّت ہو جائے گی؟ (جیسا کہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (1)

''کہئے کہ ہر چیز (حسنہ وسیئہ)، اللہ ہی کی جانب سے ہے''۔

اس صورت میں سیئہ، حجّت ہو جائے گی، نیز متشابہات بھی مِن جانبِ اللہ ہیں، لہٰذا وہ بھی حجّت ہو جائیں گے، حالانکہ ''سیئہ اور متشابہات'' دونوں ''حجّتِ عمل'' نہیں ہیں، بلکہ علّتِ حجّت احکام ہیں، جس کے متعلق فرمایا:

اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ (2)

''اس میں محکم آیتیں ہیں، جو اصلِ کتاب ہیں''۔

لہٰذا، اب محکم اور متشابہ میں تمیز کون کرے گا، جو تمیز کرے گا، اسی کا قول حجت ہوگا، اور یہ تمیز صرف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول سے ہوئی ہے؛ لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول حجت ہے، اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ (3)

1- سورۃ النساء:78

2- سورہ آل عمران:7

3- سورۃ النساء:61

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ، آؤ اس شے کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے اور رسول کی طرف''۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ، اگر رسول کا قول حجّت نہ ہوتا، تو رسول کی طرف بلانا بے سُود (بلا فائدہ) ہوتا، اور فرمایا:

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (1)

یعنی ''کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر صرف اس لیے کے باذنِ اللہ اس کی اطاعت کی جائے''۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (2)

یعنی ''جس نے رسول اللہ کی اطاعت کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی''۔

غرضیکہ بے شمار آیات ہیں، جن سے رسول کا مُطاع (جن کی بات کو تسلیم کر کے عمل کیا جائے) ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔

کتاب کے علاوہ کوئی اور چیز بھی حجّت ہے، اس کی دلیل یہ آیت ہے:

اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (3)

''اس سے پہلے کی کسی کتاب سے یا آثارِ علمی سے، اِن بتوں کی شرکت میرے ساتھ ثابت کرو، اگر تم سچے ہو''۔

یعنی اللہ تعالیٰ ان مشرکین سے حجّت مانگتا ہے کہ تم جو بتوں کو میرا شریک ٹھہرا رہے ہو، اس پر کیا حجت ہے؟ کتاب یا آثارِ علمی؟ بہرصورت ان دونوں میں سے کوئی چیز لاؤ۔

اس سے پتہ چل گیا کہ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ''آثارِ علمی'' حجّت ہیں، جس کا مطالبہ

1- سورۃ النساء:64

2- سورۃ النساء:80

3- سورۃ الاحقاف:4

اللہ تعالیٰ نے کیا، اور یہ ''آثارِ علمی'' کتاب سے علیحدہ چیزیں ہیں، جو حجت ہونے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہیں۔

کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو انبیاءِ سابقین پر نازل ہوئیں اور آثارِ علمی سے مراد، وہ احادیث اور آثار ہیں جو انبیاء سابقین سے بطور خبرِ واحد منقول ہیں اور بالکل یہ ''آثارِ علمی'' وہی چیزیں ہیں، جسے ہم آثار اور احادیث کہتے ہیں، اور فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (1)

''کچھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں بغیر علم وہدایت اور بغیر روشن کتاب کے مباحثہ کرتے ہیں''۔

اس سے ظاہر ہوگیا کہ علم وہدایت، روشن کتاب کے علاوہ حجت ہیں۔

علم تو بدیہی مقدمات کو کہتے ہیں، بداہت ان نظری مقدمات کو کہتے ہیں جو بدیہی مقدمات سے ثابت ہوتے ہیں، غرضیکہ قرآن شریف میں بےشمار آیات موجود ہیں، جن سے نبی ﷺ کے قول کا، حجّت ہونا ثابت ہے، اور اصلِ دلیل وہی ہے کہ، معجزہ نبی ﷺ کی صداقت پر حجت ہے، اور نبی ﷺ کی صداقت قرآن وحدیث دونوں پر حجت ہے، اور معجزہ حسی طور پر معلوم ہوا کرتا ہے، اس لیے معجزہ کے لیے حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ کلام اللہ اور کلام اللہ سے جو احکام اور معنی ثابت ہوتے ہیں، اُن کے علاوہ جو اقوال نبی ﷺ سے صادر ہوتے ہیں، وہ قطعاً حجت ہیں اور دلیل وہی ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔

منکرینِ حدیث نے کہا ہے کہ: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ(2) (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی) میں جس اطاعت کا بیان ہے، اس

1- سورۃ الحج: 8

2- سورۃ النساء: 80

اطاعت سے رسول کی ذات کی اطاعت مراد نہیں ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ: کسی نبی ﷺ کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ، وہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے؛ اس لیے خود رسول اللہ ﷺ سے کہہ دیا گیا کہ، آپ کو لوگوں کے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرنے ہیں:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (1)

''تم ان کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو''۔

اور منکرینِ حدیث نے کہا ہے کہ آیت: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (2) کے یہ معنی ہیں کہ: ''کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھور کر میری محکومی اختیار کرو، اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم ربانی بن جاؤ''۔

میں کہتا ہوں کہ یہ معنی غلط ہیں؛ کیونکہ آیت میں لفظ ہے: ''كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ'' کا، یعنی ''نبی ﷺ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ، تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ''۔

كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ کے معنی کسی لغت میں یہ نہیں ہیں کہ ''میری محکومی اختیار کرو''۔ عباد کے معنی بندے اور مخلوق کے ہیں، نہ محکوم کے، نہ مطیع کے اور ''عباد'' کا لفظ مومن، کافر، جاندار، بے جان سب کو شامل ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (3)

''بے شک اللہ کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو، وہ تمہارے ہی جیسے بندے ہیں''۔

1- سورۃ المائدہ:48

2- سورہ آل عمران:79

3- سورۃ الاعراف:194

اور فرمایا:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (1)

''اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے''۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ (2)

''ان دونوں نے، ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پالیا''۔

غرضیکہ ''عبد اور عباد'' کا لفظ جہاں بھی قرآن میں آیا ہے، ''مخلوق'' کے معنی میں ہے اور بندے کے معنی ہیں، نہ کہ محکوم کے معنی میں۔

(اسی طرح) آیت: ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ کے معنی یہ ہیں کہ ''پھر وہ لوگوں سے کہے کہ: اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ''۔ یعنی یہ نہیں کہہ سکتا کہ: ''میں خالق ہوں تم میری مخلوق ہو جاؤ، میں معبود ہوں تم میرے عباد ہو جاؤ''۔

یہ ترجمہ نہیں ہے کہ پھر وہ لوگوں سے کہے کہ: ''تم میرے محکوم بن جاؤ یا میری محکومی اختیار کرو''، مطلب یہ ہے کہ ''بد'' کو بھی بندہ کہا، ''نیک'' کو بھی بندہ کہا، بندے ہونے میں تمام مخلوق برابر ہے اور محکوم ہونا اور مطیع ہونا، ذوی العقول کے ساتھ خاص ہے یعنی ''مَآ اَنْزَلَ اللهُ'' کے ساتھ حکم کرنا ''ذی عقل'' ہی کے ساتھ خاص ہے اور ''عبد'' ذی عقل اور بے عقل دونوں میں مشترک ہے۔

اب اگر ''كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ'' کے معنی ''کونوا محکومین لی'' ہوں گے تو تمام جمادات اور نباتات، سب کے سب ''مَآ اَنْزَلَ اللهُ'' کے مخاطب ہوں گے، حالانکہ ان کو ''مَآ اَنْزَلَ اللهُ'' کے ساتھ خطاب نہیں کیا گیا، ان کو وہ احکام نہیں بتائے گئے جو انسانوں کو بتائے گئے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ''عباد'' کے معنی ''بندے اور مخلوق'' کے ہیں، نہ کہ محکومین اور مطیعین کے۔

1- سورۃ الزمر:53

2- سورہ کہف:65

اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ تم بتاؤ تو سہی کہ یہ آیت جس شخص نے سنائی تم نے اس آیت کو مانا یا نہیں مانا؟ اگر نہیں مانا تو کافر ہو گئے اور اگر مانا تو بغیر ''مَآ اَنْزَلَ اللہُ'' اور بغیر کتاب اللہ کے حکم کے مانا، تو قطعاً محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مستقل مُطاع ہو گئے، کتاب اللہ میں کہاں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے سے آیت کو مانو؟ اگر کوئی ایسی آیت پیش کرو گے، جس میں یہ مضمون ہو گا کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے سے اس آیت کو مانو''، تو اِس آیت کو کس کے کہنے سے مانا؟

مطلب یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے معنی، کتاب اللہ کی اطاعت کے ہیں ؛ کیونکہ رسول کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہے اور اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے، تو رسول کی اطاعت درحقیقت کتاب اللہ کی اطاعت ہے، لیکن یہ اطاعت، رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ جب رسول کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ٹھہری، تو بتاؤ کہ کتاب اللہ کی اطاعت کس کی اطاعت ہے؟ اللہ کی اطاعت ہے یا رسول اللہ کی اطاعت ہے؟ اگر کہو کہ کتاب اللہ کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہے، تو تم ابھی کہہ چکے ہو کہ، اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے تو یہ بالکل الٹ پلٹ ہو گیا، اور نیز تم کہتے ہو کہ: کتاب کی اطاعت بذریعۂ رسول ہے تو رسول کی اطاعت کتاب کی اطاعت سے مقدم ہوگئی اور جب رسول کی اطاعت کتاب سے مقدّم ہوگئی تو یہ رسول کی ذات کی اطاعت ہوئی، نہ کہ کتاب کی۔

حاصل یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ: رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہے، بلکہ اللہ کی (یعنی کتاب اللہ) کی اطاعت ہے، ہم کہتے ہیں کہ کتاب اللہ کو کتاب اللہ ماننے میں، کس کی اطاعت ہے؟ کتاب اللہ کی اطاعت ہے یا رسول اللہ کی؟ اگر کہو کہ اللہ کی اطاعت ہے یعنی اللہ کے کہنے سے کتاب اللہ کو کتاب اللہ مانا ہے تو یہ بالکل جنون ہے، اگر کہو کہ کتاب اللہ کو کتاب اللہ سے مانا ہے تو یہ حماقت ہے، اگر کہو کہ کتاب اللہ کو رسول اللہ کے کہنے سے مانا

1- سورۃ الزمر:53

2- سورہ کہف:65

ہے تو یہ حق ہے، اور اب رسول اللہ کی اطاعت، کتاب اللہ سے مقدم ہوگئی، اور یہی رسول اللہ کی ذات کی اطاعت کے معنی ہیں، لہٰذا رسول اللہ کی اطاعت مستقل ہوگئی، بالکل اسی طرح جس طرح کتاب اللہ کی اطاعت مستقل ہے، بلکہ کتاب کی اطاعت فرع ہے، رسول اللہ کی اطاعت مستقل حجّت ہوگئی۔

کتاب اللہ پر غور کیجیے، اس آیت: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (1) کے ترجمہ میں منکرِ حدیث نے ''حکم'' کے معنی ''حکومت'' کیے ہیں، یہ غلط ہے، حکم کے معنی ''فہم'' کے ہیں، باتفاقِ مفسرین اور نیز حضرت یحییٰ کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا(2)

''ہم نے بچپن ہی میں اس کو فہم عطا کیا تھا''۔

اگر ''حکم'' کے معنی ''حکومت'' کے ہوتے تو آیت کے معنیٰ یہ ہوتے کہ ''ہم نے بچپن ہی میں یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکومت دے دی تھی''، حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ یحییٰ کو حکومت نہیں ملی تھی۔

اور یہاں ایک نکتہ ہے، اس کو سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اگر اللہ کہے کہ میری اطاعت کرو تو اس کہنے کے بعد وہ مُطاع لیکن اللہ کی ذات ''بذاتہ مطاع'' ہونے کو نہیں چاہتی؛ کیونکہ اس کی ذات ''ازلی'' ہے اور تقاضائے ذات، ذات سے جدا نہیں ہوتا، تو اگر ذات کا تقاضا مُطاع ہونا ہو تو مُطاع ہونا بھی ازلی ہو جائے گا اور مُطاع کا تحقّق (وجود)، مطیع (اطاعت کرنے والا) کے بغیر نہیں ہوسکتا، (لہذا) مطیع بھی ازلی ہوجائے گا، حالانکہ عالَم اور مطیعین سب کے سب حادث ہیں، ازلی نہیں ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ اللہ کی عبادت اور اطاعت اس وقت ہوگی جب وہ حکم

1- سورۃ آل عمران: 79

2- سورہ مریم: 12

دے گا؛ لہٰذا اللہ کا معبود ہونا اور مطاع ہونا اللہ کے حکم سے ہوا ہے، نہ کہ اللہ کی ذات سے، یہی وہ دقیقہ ہے کہ جس پر لعین اوّل (شیطان) نہیں مطّلع ہوا، یعنی وہ لعین یہ نہیں سمجھا کہ، مسجود ہونے کی علّت، ذاتِ باری تعالیٰ نہیں ہے، بلکہ امرِ باری ہے، اسی طرح مطاع ہونے کی علت امرِ باری ہے، نہ کہ ذاتِ باری، جب اس نے یہ امر کیا: ''اَطِیْعُوا اللہَ'' اللہ کی اطاعت کرو۔ تو محض اس امر کی بنا پر اللہ تعالیٰ مُطاع ہو گیا، پھر اس نے امر کیا: ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' تو محض اس امر کی بنا پر رسول مطاع ہو گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو علّت مطاع ہونے کی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، وہی علّت مطاع ہونے کی نبی ﷺ کے لیے ہے، بس جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس امر کی بنا پر فرض ہے (یعنی اگر ''اَطِیْعُوا اللہَ'' کا امر نہ ہوتا تو اللہ کی اطاعت فرض و واجب نہ ہوتی)، بالکل اسی طرح ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا امر نہ ہوتا تو رسول کی اطاعت واجب نہ ہوتی۔

خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ فاعل بالذات نہیں ہے، فاعل بالارادہ ہے؛ کیونکہ یہ عقیدہ کفّار فلاسفہ کا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی ذات اگر مقتضی مسجودیت ہوتی تو دائماً مسجود ہوتی، حالانکہ اوقاتِ مکروہہ میں سجدہ ممنوع اور حرام ہے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ نبی کا مطاع ہونا اس آیت اور کتاب اللہ سے ثابت ہوا، اور تم اوپر بیان کر چکے ہو کہ نبی حجت ہے کتاب پر، نہ کہ کتاب حجت ہے نبی پر، اور یہاں تم نے یہ بیان کیا کہ امرِ الٰہی یعنی ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' نبی ﷺ کے مُطاع ہونے پر حجت ہے تو اس کی کیا توجیہ ہے؟

تو ہم کہیں گے امرِ الٰہی، حقیقت میں حجت ہے، (لہٰذا) امرِ الٰہی کبھی قول ہوتا ہے جیسے ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' میں کبھی فعل ہوتا ہے اور وہ فعلِ الٰہی معجزہ ہے، جس نے نبی کو مطاع بنایا، محض اس امرِ فعلی اعجازی کی بنا پر نبی مطاع بنا ہے اور یہ امرِ قولی ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' اِس امرِ فعلی اعجازی کی تاکید ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ معجزہ (یعنی امرِ فعلی اعجازی) نبی پر حجت ہوا اور نبی قرآن کے تعین پر

حجت ہوا، اور قرآن نے نبی کے مستقل مطاع ہونے پر مزید تاکید کردی، نبی کی صداقت قرآن پر موقوف نہیں ہے، بلکہ قرآن کا معین ہونا یعنی قرآن کا قرآن ہونا نبی کی صداقت پر موقوف ہے اور نبی کی صداقت، نبی کا مطاع ہونا، نبی کا حجت ہونا، یہ سب ''معجزہ'' پر موقوف ہیں، جو امرِ الٰہی فعلی ہے، یعنی اللہ کے اس فعلی معجزہ نے یہ حکم دیا کہ ''یہ مدعی نبوت سچا ہے''۔

بس غور کرو کہ نبی کا قول وفعل سب اس طرح حجت ہے، جس طرح خدا کا فعل حجت ہے، جس طرح خدا کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ عقل کے مطابق ہو، بالکل اسی طرح نبی کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ، وہ قرآن کے مطابق ہو؛ اس لیے کہ نبی کا قول بھی ''قولُ اللہ'' ہے اور قرآن بھی ''قولُ اللہ'' ہے اور دونوں اللہ کے قول ہیں (قرآن بھی اور حدیثِ رسول بھی) تو اللہ کے قول کے لیے ضروری نہیں ہے کہ، اس میں تنوّع (مختلف اقسام) نہ ہو، جس طرح کہ اس کے ایک فعل کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ، وہ دوسرے فعل کے مطابق ہو، مثلاً: ایک طرف پہاڑ کی چوٹی فلک تک پہنچ رہی ہے دوسری طرف کھڈ کی (گڑھے کی) گہرائی تحت الثریٰ تک پہنچ رہی ہے، جس طرح اس کے ایک فعل کا دوسرے فعل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح اُس کے ایک قول کا (یعنی حدیثِ رسول کا) اس کے دوسرے قول (یعنی قرآن) کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔

یہاں مغالطہ ہوا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نبی چونکہ بشر ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا قول، خدا کے قول کے مطابق ہو، حالانکہ یہ بات نہیں ہے، نبی کا قول درحقیقت خدا کا قول ہے، قرآن بھی وحی ہے اور نبی کا قول بھی وحی ہے، جیسا کہ پہلے صفحات میں ثابت کردیا گیا ہے کہ:

وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (1)

1- سورۃ النجم:3

''اس کا نطق اس کی خواہش سے نہیں ہے''۔

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى [1]

''وہ تو صرف وحی ہے جو وحی کی گئی''۔

اب اگر کوئی کہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ [2] کے کیا معنی ہیں؟ نبی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تو کتاب اللہ کے ساتھ، اِن کے درمیان حکم کر؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' کے معنی صرف کتاب اللہ کے نہیں ہیں بلکہ ''مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' کتاب اللہ بھی ہے اور حدیثِ رسول بھی ہے۔

غور کرو صبح کے دو فرض اور ظہر کے چار فرض اور عصر کے چار فرض اور مغرب کے تین فرض اور عشاء کے چار فرض، یہ سب نبی نے بتائے ہیں اور کتاب اللہ میں کہیں یہ تفصیل نہیں ہے اور نہ یہ تعداد ہے۔ تو اب یا تو یہ کہو کہ یہ پانچوں نمازیں اور ان کے اوقات و تعداد کا حکم نہیں؛ کیونکہ کتاب اللہ میں نہیں ہیں، تو اس صورت میں صرف کفر ہی نہیں بلکہ جنون بھی شامل ہے، اور اگر یہ کہو کہ ''یہ قطعی حکمِ الٰہی ہے'' تو ضرور بالضرور، قرآن کے علاوہ یہ حکم نبی پر نازل ہوا، اور نبی نے ''مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' کے ساتھ حکم کر دیا ہے۔

منکرِ حدیث نے رسالہ ''اطاعتِ رسول'' میں کہا:

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ [3] کے معنی یہ ہیں کہ ''اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو'' اور کہا ہے کہ، قرآن کی رُو سے خدا کی محکومیت اور خدا کی عبادت سے مراد ایک ہی ہے (یعنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت)۔

میں کہتا ہوں کہ، اس کا حاصل یہ ہے کہ عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں، اور اس کے نزدیک ''لَا تَعْبُدُوْٓا'' کے معنی ''لاتطیعوا'' کے ہیں، یعنی عبادت اور اطاعت ایک ہی چیز ہے۔

1- سورۃ النجم:4

2- سورۃ المائدہ:48

3- سورہ یوسف:40

میں کہتا ہوں کہ: عبادت کا اطاعت ہونا بالکل غلط ہے، عبادت بتوں کی ہوتی ہے، جنوں کی ہوتی ہے یَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ [1] یعنی ''وہ جنوں کی عبادت کرتے ہیں''۔ اور ملائکہ کی عبادت ہوتی ہے، مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عبادت ہوتی ہے، سورج کی عبادت ہوتی ہے، غرضیکہ متعدد عبادتیں ہوتی ہیں، لیکن اطاعتیں نہیں ہوتیں یعنی بتو ں کا کوئی مطیع (فرمانبردار، پیروکار) نہیں ہوتا، اسی طرح ملائکہ وعیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام وغیرہ کا کوئی مطیع نہیں ہے، لیکن عابد ہے، تو معلوم ہو گیا کہ مطیع اور چیز ہے اور عابد اور چیز ہے، اور نیز رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، لیکن رسول کی عبادت، اللہ کی عبادت نہیں ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اطاعت علیحدہ چیز ہے اور عبادت علیحدہ چیز ہے، یہ ایک زبردست مغالطہ ہے، جس میں لوگ پھنس گئے ہیں۔

❖❖❖❖❖

1- سورۃ السبا:41

حدیث کا جو معتبر مجموعہ ہمارے پاس ہے، وہ یقینی ہے یا نہیں؟

سوال: کیا احادیثِ رسول ﷺ کا جو معتبر مجموعہ ہمارے پاس ہے وہ یقینی ہے یا ظنی؟
جواب: وہ ظنی ہے، بخاری مسلم وغیرہ میں جو احادیث ہیں وہ ظنی ہیں۔

ظنّ (غالب) شرعاً حجّت ہے یا نہیں؟

سوال: کیا ظن شرعا حجّت ہے یا نہیں؟
جواب: ظن شرعا بھی حجّت ہے اور عقلا بھی حجّت ہے، ظن کے حجت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ، ظن عمل کو واجب کر دیتا ہے، یعنی ظن موجبِ عمل ہے، موجبِ ایمان نہیں ہے۔

ظن کے معنی:

پہلے ظن کے معنی سمجھ لینے چاہیں۔

جب حکایت ذہن میں آتی ہے تو اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ذہن اس کے صدق و کذب کی طرف ملتفت (توجہ کرتا) ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اگر حکایت کے ذہن میں آنے کے بعد، ذہن اِس کے صدق و کذب کی طرف ملتفت نہیں ہوا، تو اِس کو ''تخییل'' کہتے ہیں۔ اگر ملتفت ہوا تو کسی ایک طرف (یعنی فقط صدق یا فقط کذب کی طرف) ملتفت ہوا یا دونوں کی طرف ملتفت ہوا۔ اگر فقط ایک طرف التفات ہوا، تو یہ یک طرفہ التفات ''جزم'' یا ''قطع'' کہلاتا ہے۔

اس (جزم) کی تین صورتیں ہیں اور وہ یہ ہیں کہ: یہ یک طرفہ التفات، واقع (خارج) کے مطابق ہے یا واقع کے مطابق نہیں ہے۔ یعنی واقع میں یہ حکایت بالکل صادق تھی، ذہن نے اس کو بالکل کاذب جانا یا واقع میں بالکل کاذب تھی، ذہن نے بالکل صادق جانا۔ تو اگر یک طرفہ التفات، واقع کے خلاف ہے تو اس کو ''جہلِ مرکب'' کہتے

ہیں۔

اگر (یک طرفہ التفات) واقع کے مطابق ہے، تو اِس التفات اور اِس اعتقاد کا زوال یا تو ممکن ہے یا ناممکن ہے۔

اگر ممکنُ الزوال ہے تو (یہ یک طرفہ التفات جو واقع کے بھی مطابق ہے اور ممکن الزوال بھی ہے) ''تقلید'' کہلاتا ہے۔

اگر ناممکنُ الزوال ہے تو (یہ یک طرفہ التفات، جو واقع کے مطابق بھی ہے اور اس کا زوال بھی ناممکن ہے، اِس یک طرفہ التفات واعتقاد کو) ''یقین'' کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ، یک طرفہ التفات کی تین قسمیں ہیں:

1۔ جہلِ مرکب۔

2۔ تقلید۔

3۔ یقین۔

اسی طرح دو طرفہ التفات کی بھی تین قسمیں ہیں۔

یہ دو طرفہ التفات، دونوں طرف اگر برابر برابر ہے تو اس کو ''شک'' کہتے ہیں، اور اگر کم اور زیادہ ہے، تو جدھر کم ہے، اس کو ''وہم'' کہتے ہیں اور جدھر زیادہ ہے، اس کو ''ظن'' و ''گمان'' کہتے ہیں۔

مثلاً: فلاں حکایت ''ظنی الصدق'' ہے، اس کے معنی ہیں کہ 'صدق' کی طرف زیادہ التفات ہے اور 'کذب' کی طرف کم التفات ہے یا فلاں حکایت ''ظنی الکذب'' ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ 'کذب' کی طرف زیادہ التفات ہے 'صدق' کی طرف کم التفات ہے۔

اب جب کہ ''ظن'' کے معنی معلوم ہو گئے، تو اب یہ دیکھنا ہے کہ ظن عمل کو واجب کرتا ہے یا نہیں، سُو معلوم کرنا چاہیے کہ ''یقین'' میں ایسی زیادتی (اضافہ) ہے، جو بالکل یک طرفہ ہے اور دوسری طرف کی بالکل نہیں ہے، صرف ایک ہی طرف زیادتی ہی زیادتی

ہے، اور ''ظن'' میں ایسی زیادتی ہے کہ، دوسری طرف کچھ کمی ہے، بہر حال زیادتی میں اور رُجحان میں دونوں برابر ہیں، اور عمل کو واجب کرنے والی چیز، زیادتی ہے نہ کہ کمی، تو جس طرح ''یقین'' بوجہِ زیادتی کے موجبِ عمل ہے، بالکل اسی طرح ''ظن'' بوجہِ زیادتی کے موجبُ العمل ہے، یعنی ''یقین'' موجبِ عمل کیوں ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ، اس میں زیادتی ہے، ایسی زیادتی کہ جس میں کمی کا احتمال نہیں ہے تو ''یقین'' میں موجبِ عمل زیادتی ہے، نہ کہ کمی کا احتمال نہ ہونا؛ لہٰذا حجت صرف زیادتی ٹھہری اور یہ (زیادتی) ''ظن'' میں بھی موجود ہے، لہٰذا جس بنا پر ''یقین'' حجت ہے، وہی بنا ''ظن'' کے حجت ہونے کی بھی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ، عمل کرنے کے لیے، اُس عمل کے ''حسن (اچھا ہونا، Good)'' کا تصور ہونا چاہیے اور یہ تصور جس طرح ''یقین'' میں ہے، اسی طرح ''ظن'' میں ہے؛ کیونکہ ''ظن'' میں رُجحان موجود ہے اور یہ رُجحان ہی عمل کرانے کے لیے کافی ہے، لہٰذا ''ظن و یقین'' ایک بنیاد پر حجت ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ: اگر صرف ''یقین'' حجت ہوگا، نہ کہ ''ظن''، تو عالَم میں کہیں بھی ناکامی نہیں ہوگی اور ناکامی مفقود ہوجائے گی؛ کیونکہ جب انسان کو ''یقین'' ہوگیا کہ، یہ عمل نافع ہے تو نفع اور فائدہ اور کامیابی لازمی طور پر ہوگی، اور نقصان اور نامرادی مفقود ہوجائے گی، حالانکہ عالَم میں ناکامی اور کامیابی، نفع و نقصان دونوں متحقق ہیں، لہٰذا معلوم ہوگیا کہ، صرف ''یقین'' پر مدارِ عمل نہیں ہے، بلکہ ''ظن'' (بھی) عمل کے لیے کافی ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض صورتوں میں ناکامی ہوتی ہے۔

ظن کے حجت ہونے کی حسّی مثالیں:

دنیا کے تمام قسم کے معاملات اور کاروبار، مثلاً: تجارت کا عمل ''ظن'' پر موقوف ہے، ہر تجارت میں نفع نہیں ہوتا، اگر یقینی نفع تجارت کرنے کی علت ہوتا تو گھاٹا کسی کو نہ ہوتا، بلکہ ''ظنی نفع'' حجتِ عملِ تجارت ہے۔

(۱) اسی طرح مزدور کا معاملہ ہے، اگر مزدور کو ''یقین'' ہوتا کہ بازار جا کر مزدوری یقیناً مل

جائے گی تو کوئی مزدور بیکار نہ ہوتا، صرف مزدوری کا ''ظن'' ہی اس کو بازار لاتا ہے، اکثر اوقات مزدوری مل جاتی ہے، کبھی نہیں بھی ملتی۔

(۲) اسی طرح نوکری کا حال ہے، اسی طرح ڈاکٹری کا حال ہے، ڈاکٹر کو قطعاً یہ ''یقین'' نہیں ہوتا کہ، اُس کی دوا سے شفا ہوگی، اگر ایسا ہوتا تو تمام مریض شفایاب ہوتے، ڈاکٹر کو صرف ''ظن'' ہوتا ہے اور وہ اپنے ''ظن'' پر دوا دیتا ہے، کبھی شفا ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں؛ لہٰذا، ڈاکٹر کا عمل اور دوا کا عمل، دونوں ''ظنی'' ہیں۔

اب اگر ''ظن'' موجبِ عمل نہ ہو، تو معالجہ ہی ختم ہو جائے اور کوئی علاج ہی نہ کرے اور نہ کرائے، اسی طرح سفر (خواہ پیدل کرے یا سواری میں کرے، موٹر، ریل، ہوائی جہاز، گھوڑا گاڑی، غرض کسی طرح بھی سفر کرے) اس کو یہ ''یقین'' نہیں ہوتا ہے کہ، وہ بخیر وعافیت منزل پر پہنچ جائے گا، صرف ''ظن'' ہی ہے، اب اگر ''ظن'' موجبِ عملِ سفر نہ ہو، تو سفر ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اسی طرح ہوائی جہاز، ریلیں وغیرہ ہیں، کسی کو بھی ''یقین'' نہیں ہے کہ ان سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور فائدہ ہی فائدہ ہوگا، بلکہ ''ظنِ غالب'' ہے کہ فائدہ ہوگا، کبھی نقصان بھی ہو جائے گا، اب اگر ''ظن'' مفیدِ عمل نہ ہو، تو تمام صنعتیں باطل ہو جائیں گی۔

غرض یہ ہے کہ، دنیا میں کوئی عمل ایسا نہیں ہے کہ جس کا دارومدار ''ظن'' پر نہ ہو، سب کا ظن ہی پر دارومدار ہے، اب اگر ''ظن'' مفیدِ عمل اور موجبِ عمل اور حجّتِ عمل نہ ہوگا، تو نظامِ عالم تباہ ہو جائے گا؛ کیونکہ کسی کو کسی عمل کے حسنِ انجام کا ''یقین'' نہیں ہے، صرف ''ظن'' ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (1)

1- سورۃ المومنون:71

یعنی ''اگر ان کی رائے کے، حق تابع ہوگیا تو آسمان اور زمین اور جو اُس میں ہیں، سب تباہ ہوجائیں گے''۔

یعنی حق، اُن کی رائے کے تابع ہوا تو نظام درہم برہم ہوجائے گا۔

آیت سے یہ ثابت ہوگیا کہ عالَم کی بربادی کا سبب، حق کا، اُن کی رائے کے تابع ہونا ہے، اور مشاہدہ سے یہ ثابت ہوا کہ، عالَم کی بربادی کا سبب ''ظن'' کا حجّت نہ ہونا ہے، تو گویا ''ظن'' کا حجت نہ ہونا، حق کا اُن کی رائے کے تابع ہونا ہے، لہٰذا اِس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ ''ظن'' حق ہے اور موجبِ بقائے عالَم ہے اور اُن کی رائے کے تابع ہوکر (یعنی ظن حجّت نہ بن کر) موجبِ فسادِ عالَم ٹھہرا، غور کا مقام ہے۔

تم مجھے بتاؤ تو سہی کہ جہاں میں کون سا عمل ''یقین'' پر ہورہا ہے؟ سب کام ''ظن'' ہی پر چل رہے ہیں، اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ اعمالِ شرع صرف ''ظن'' ہی پر ہیں، ہاں بیشک ایمان ''یقین'' پر ہے، بلکہ ''یقین'' ہی ہے، دیکھو ہر شخص جو کہ نیک کام کرتا ہے اس کی غایت یہ ہوتی ہے کہ، عذاب سے رہائی ہو، جنت کی راحتیں اور ثواب حاصل ہو، تو بتاؤ کہ کسی شخص کو بھی ''یقین'' ہے کہ، وہ عذابِ جہنم سے بچ جائے گا اور جنت میں داخل ہوجائے گا، سب کو ''ظن'' ہی ہے، سب اس گمان اور ظن پر عمل کررہے ہیں کہ، شاید عذاب سے رہائی ہوجائے اور ثواب حاصل ہوجائے، سوائے انبیاء کے، سب کو ظن ہی ظن ہے۔

اب اعمالِ شرعیہ کی مثالیں لیجیے۔

اعمالِ شرعیہ کی مثالیں:

نکاح کا دارومدار دو آدمیوں کی شہادت) گواہی) پر ہے، اور دو آدمیوں کی شہادت ''ظنی'' ہے، شریعت نے اِس ''ظن'' کو حجت قرار دیا ہے، اسی طرح زنا کی سزا کی شہادت چار آدمیوں کی ہے، چار آدمیوں کی شہادت ''ظن'' ہے، شرع نے اِتنی سخت سزاؤں پر ''ظنی'' شہادت کو حجت قرار دیا، باپ کا باپ ہونا ''ظنی'' ہے، شرع نے اس کو حجت قرار دیا (یعنی نسب ظنی ہے) اور احکامِ میراث اِسی ''ظن'' پر ہیں، اسی طرح سجدہ کہ کعبہ کے سامنے

ہونا چاہیے اور موضعِ سجود سے جو خط (لائن) سیدھا کعبہ کو جائے، وہ ''ظنی'' ہے ''یقینی'' نہیں ہے، اسی طرح سحری اور افطاری دونوں ''ظنی'' ہیں، یہ نہیں معلوم کہ صحیح وقت پر سحری کھائی گئی اور صحیح وقت پر افطار کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ (1)

یعنی ''دو مردوں کو گواہ بنالو''۔

اور دو مردوں کی شہادت ''ظنی'' ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو حجت قرار دیا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ (2)

''جو لوگ پارسا عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، پھر چار شاہد (گواہ) نہیں لاتے''۔

اور فرمایا:

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ (3)

''کیوں نہیں چار گواہ اس پر لے آتے''۔

ان آیتوں میں چار گواہوں کی گواہی کو سزا کے لیے حجت قرار دیا، حالانکہ چار گواہوں کی گواہی یقینی نہیں ''ظنی'' ہے۔

الغرض! جتنے بھی اعمالِ صالحہ ہیں، اکثر و بیشتر پر قرآن نے ''ظن'' کو حجّت رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ (4)

''تاکہ تم کو سالوں اور برسوں کی گنتی اور حساب معلوم ہو جائے''۔

1- سورۃ البقرہ:282

2- سورۃ النور:4

3- سورۃ النور:13

4- سورہ یونس:5

مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ [1]

''اللہ نے اس کو (یعنی حساب کو) ناحق نہیں بنایا''۔

اور:

وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا [2]

''ہر چیز کو عدد سے گھیر لیا''۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حساب حق ہے، اور جبکہ حساب حق ہے تو وہ شے کہ جس پر حساب موقوف ہے، وہ حق ہے اور وہ علمِ ہندسہ کی یہ شکل ہے، اگر چار مقداریں متناسب ہوں یعنی پہلی مقدار کو دوسری مقدار سے وہی نسبت ہو، جو تیسری کو چوتھی سے ہے، تو پہلی اور چوتھی کا حاصلِ ضرب، دوسری اور تیسری کے حاصلِ ضرب کے برابر ہوگا، تمام قوانینِ حساب (سوائے جمع او تفریق کے) کُل کے کُل اِسی شکل کی فرع ہیں، ہم نے دوسری جگہ (دیگر اپنی تقاریر میں) اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ علمِ حساب، اشکالِ ہندسہ کا نتیجہ ہے اور جب کہ حساب، اشکالِ ہندسیہ پر موقوف ہے، تو لابُدّ (ضروری ہے کہ) جس طرح حساب حق ہے، بالکل ہندسہ جو موقوف علیہ حساب ہے، وہ بھی حق ہے اور جب ہندسہ حق ہے تو لابُدّ (ضروری ہے کہ) جس شے پر ہندسہ موقوف ہے، وہ بھی حق ہے اور وہ شے اصلِ موضوع ہے۔

یعنی (1) دو نقطوں میں خط ملا سکتے ہیں، (2) خط کو جتنی دور تک چاہیں بڑھا سکتے ہیں، (3) کسی نقطے کو مرکز فرض کر کے، جتنی دوری سے چاہیں، دائرہ بنا سکتے ہیں۔

یہ تین اصلِ موضوع ہیں، اِن پر تمام مقالات ہندسیہ موقوف ہیں اور یہ تینوں ''یقینی''، نہیں ہیں؛ کیونکہ اگر یہ بداہۃً ''یقینی'' ہوتے تو ''علومِ متعارفہ'' میں داخل ہوتے جو بداہۃً ''یقینی'' ہیں اور اگر یہ نظراً ''یقینی'' ہوتے تو دیگر مسائلِ نظریہ کی طرح، یہ بھی اَشکالِ نظریہ میں شامل ہوتے اور اشکالِ نظریہ کی طرح، اِن کو بھی ثابت کیا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا

1- سورہ یونس:5

2- سورۃ الجن:28

گیا، نہ تو بارہ (12) علومِ متعارفہ میں ان کا شمار ہے، نہ کسی مقالہ کی کسی شکل میں اِن کا بیان ہے، صرف معلّمِ ہندسہ کے ''حسنِ ظنّ'' سے ان کو تسلیم کرلیا گیا ہے، اور یہ ''ظنّی'' ہیں؛ لہٰذا، اگر ''ظن'' حجت نہ ہوتا تو اِس ''ظن'' پر جتنی چیزیں موقوف ہیں، وہ حجّت نہ ہوتیں، نہ ہندسہ کی شکل میں، نہ حساب کی شکل میں، مگر اللہ تعالیٰ نے حساب کو ''حق'' کہا ہے، تو لابُدّ (ضروری ہے کہ) ہندسہ بھی حق ہو! اور ہندسہ اِن تین اصلِ موضوع پر موقوف ہے؛ لہٰذا یہ تینوں ''اصولِ موضوعہ'' بھی حق ہوگئے اور یہ اصولِ موضوعہ ''ظنی'' ہیں؛ لہٰذا ''ظن'' حجت ہوگیا، قرآن کی روشنی میں۔

پس اگر ''ظن'' حجّت نہ ہوگا تو نظامِ عالَم دنیوی اور دینی، سب درہم برہم ہوجائے گا، لہٰذا ''ظن'' حجّتِ عمل ہے۔

اعتراض:

اب اگر یہ کہا جائے کہ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (1)

''بیشتر ظنوں سے بچو؛ کیونکہ بعض ظن گناہ ہیں''، اور فرمایا:

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (2)

''وہ صرف ظن اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتے ہیں''، اور فرمایا:

اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (3)

''وہ صرف اٹکل (ظن) ہی سے کام لیتے ہیں''، اور فرمایا:

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (4)

1- سورہ حجرات:12

2- سورۃ النجم:23

3- سورۃ البقرہ:78

4- سورہ یونس:36

یعنی ''ظن، حق سے بے نیاز نہیں کرتا اور اٹکل (ظن) سے صحیح بات کچھ بھی معلوم نہیں ہوتی''۔

اوراس کے علاوہ ''ظن'' کی مذمّت میں بے شمار آیات ہیں، اس کا کیا جواب ہے؟

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ ''ظن'' کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے، ایک ''ظن'' تو ''یقین'' کا مقابل ہے، جیسے کہتے ہیں: ''یہ ظنی علم ہے''، ''یہ یقینی علم ہے''، یہ ''ظن'' قسمِ علم ہے۔ ایک ''ظن'' عمل ہے یعنی عمل کی قسم ہے اور عملی ظن کی دو قسمیں ہیں: ایک ''سُوئےظن'' اور ایک ''حُسنِ ظن''۔

حسن ظن کی مثال:

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا [1]

''جب تم نے یہ سنا تھا تو مومن مردوں اور عورتوں نے، کیوں نہیں حُسنِ ظنّ کیا!''

اور سوئےظن کی مثال:

اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ [2]

''اکثر ظنوں سے بچو'' (یعنی سُوئےظن سے بچو)۔

لہٰذا عملی ظن کی دو قسمیں ہو گئیں، ایک ظن بمعنی ظنِّ خیر، جس کا حکم (امر) ہے، ایک ظن بمعنی سوئےظن، جس کی نہی ہے۔

ہم جس ''ظن'' کو حجّت قرار دے رہے ہیں، وہ نہ حُسنِ ظن ہے نہ سوئےظن، بلکہ وہ، وہ ''ظن'' ہے جو ''یقین'' کا مقابل ہے اور قسمِ علم ہے اور اس کے حجت ہونے کی، اس آیت میں بھی دلالت موجود ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ [3]

1- سورۃالنور:12

2- سورہ حجرات:12

3- سورہ حجرات:12

''اے ایمان والو! بہت سے ظنوں سے بچو؛ کیونکہ بعض ظن گناہ ہیں''۔

اس آیت میں ''بعض ظن'' کو گناہ بتایا اور اکثر سے بچنے کو فرمایا اور ظاہر یہ بات تھی کہ بعض گناہ ہیں، بعض سے بچنے کو فرمایا، لیکن اکثر سے بچنے کو یوں فرمایا کہ، اکثر ظنوں کے جو مراتب ہیں، اُن میں یہ بعض (جو گناہ ہے) کون سا ہے؟ لہٰذا، مراتبِ اکثر یہ سے بچو؛ کیونکہ اصل میں تو بچنا بعض سے ہے، جو گناہ ہے، اب ہوسکتا ہے کہ وہ بعض، یہ ہوں یا وہ یا وہ؛ کیونکہ ظن (گمان) ہے کہ وہ بعض جو اثم (گناہ) ہے، یہ ہیں یا وہ ہیں۔

لہٰذا اگر ''ظن'' حجّت نہ ہوتا اور صرف ''یقین'' حجّت ہوتا تو صرف بعض ظن سے (جو اثم تھا) بچنے کو فرماتا اور اس کی وضاحت مثال سے ہوجائے گی، مثلاً: ظنّوں کی تعداد سو (100) ہے، اس میں سے بعض گناہ ہیں، مثلاً: دس، تو فرمایا کہ ستّر (70) سے بچو، بچنا تو صرف دس (10) سے تھا، ستّر (70) سے بچنے کو اِس لیے فرمایا کہ، یہ دس (10) جو بچنے کے قابل ہیں، اُن ستّر (70) یعنی سات دہایوں میں سے کون سا دہایا ہے؟؟ کیونکہ یہ دہایا، ہر سات دہایوں میں سے کوئی سا ہوسکتا ہے، ممکن ہے کہ پہلا دہایا ہو، ممکن ہے دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں، غرضیکہ ہر دہایا ممکن ہے، جب ہر دہایا ممکن ہے تو ہر دہائے میں ظنّ ہوگیا، تو یہ ''ظنّ'' حجت ہوگیا اس بات پر کہ بعض سے بچنے کے بجائے اکثر سے بچا جائے، ورنہ تقاضائے یقین تو یہ تھا کہ جو اثم ہے صرف اُسی سے بچا جائے، لیکن اثم ہونے کا یقین تو بعض میں ہی ہے اور ظن اکثر میں (یعنی اثم اور گناہ ہونے کا ظن اکثر میں ہے) اور اللہ کے نزدیک چونکہ ''ظن'' حجّت ہے؛ اس لیے ''ظنّ'' کے حجت ہونے کی بنا پر، اُس نے جہاں تک ''ظنّ'' کا اثر تھا، سب کو (یعنی اکثریت کو) ممنوع قرار دے دیا۔

گویا آیت کا خلاصہ یہ ہوا، بعض ظن تو یقیناً اثم اور گناہ ہیں، لیکن کثیر ظن اثم اور گناہ، ''ظنّاً'' ہیں اور ''ظنّ'' حجّتِ عمل ہے؛ لہٰذا، تم ''ظنّاً'' جو ظنّ اثم ہیں، اُن سے بچو، نہ کہ صرف یقینی ظن سے؛ لہٰذا ظن حجت ہوگیا اور عقائد میں جو ''ظنّ'' کی مذمّت ہے، وہ صحیح ہے۔

عقائد میں ظنّ:

عقیدہ کی بنیاد ''یقین'' پر ہے، ظنّ سے یقین نہیں ہوتا، اِس لیے ظن کو برا کہا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ''ظنّ'' صرف موجبِ عمل ہے، موجبِ ایمان نہیں ہے؛ لہٰذا، مسائلِ ایمانیہ میں ''ظنّ'' حجّت نہیں ہوگا اور مسائلِ عملیہ میں ''ظنّ'' حجّت ہوگا۔

اعمال میں ظن:

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ، اگر ''ظنّ'' حجتِ عمل نہ ہوگا تو بیشتر آیات پر عمل ہی نہیں ہو سکے گا، مثلاً:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (1)

''کہہ دے، میں اس ہدایت پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، بجز محبت وقرابت کے''۔

اب اِس محبت وقرابت سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ، تم آپس میں اپنے اپنے قرابت دار سے محبت کرو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے قرابت دار سے محبت کرو، یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ مجھ سے بوجہ میری قرابت کے محبت کرو۔

اب اس آیت سے تین مرادیں ہوسکتی ہیں اور اس کا یقین نہیں ہے کہ، اللہ تعالیٰ کی کون سی مراد ہے یا سب مرادیں ہیں؟ بہرحال ہر معنیٰ ''ظنی'' ہیں، اگر ''ظنّ'' حجت نہ ہو تو کتاب (قرآن) پر عمل نہ ہو سکے گا، (اسی طرح):

وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (2)

''مطلقہ عورتوں کی عدت تین قرء ہے''۔

اور قرء ''حیض'' کو بھی کہتے ہیں، ''طہر'' کو بھی کہتے ہیں۔

حیض وطہر، ہر ایک پر قرء کی دلالت ''ظنی'' ہے، یہ یقین نہیں ہے کہ، اللہ کی مراد کیا

1- سورۃ الشوریٰ:23

2- سورۃ البقرہ:228

ہے، حیض ہے یا طہر ہے؟

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ(1)

''اس روز تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر آٹھ (8) اٹھائے ہوئے ہوں گے''۔

اب یہاں عدد ''آٹھ (8)'' کا ہے اور معدود ظنی ہے، پتہ نہیں کون سے آٹھ اٹھائے ہوئے ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے؟ آٹھ فرشتے مراد ہیں یا کوئی اور آٹھ مراد ہیں؟ یا سات آسمان اور ایک زمین مراد ہے؟

مطلب یہ ہے کہ اکثر آیات کی دلالت، اُن آیات کے معنی پر ظنی ہے، اگر ''ظن'' حجت نہ ہوگا تو بیشتر آیات پر عمل ہی نہیں ہو سکے گا۔

❖❖❖❖❖

1- سورۃ الحاقۃ:17

احادیث مسلّمہ، واجب العمل ہیں یا نہیں؟

سوال: کیا خبرِ واحد حجّت ہے یعنی موجبِ عمل ہے یا نہیں؟ یعنی مجموعہ احادیث، جو اِس وقت بخاری و مسلم وغیرہ میں موجود ہیں، یہ احادیث حجتیں ہیں یا نہیں؟

جواب: ہاں خبرِ واحد حجّت ہے اور موجبِ عمل ہے۔

ثبوت: اگر خبرِ واحد موجبِ عمل نہ ہوگی تو نظامِ عالَم درہم برہم ہوجائے گا، لیکن نظامِ عالَم باقی ہے، قائم ہے؛ لہٰذا، خبرِ واحد (یعنی حدیث) حجت ہے اور موجبِ عمل ہے اور حدیث پر عمل کرنا واجب ہے۔

پہلی دلیل:

اب اس بات کا ثبوت کہ، ''اگر خبرِ واحد حجت اور موجبِ عمل نہ ہوگی تو نظامِ عالم درہم برہم ہوجائے گا'' یہ ہے کہ، انسان مَدَنیُّ الطَّبع ہے یعنی اپنی زندگی باقی رکھنے میں دوسروں کا محتاج ہے اور اس احتیاج کو رفع کرنا اور دفع کرنا، اِس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کا دوسروں پر اظہار کرے، اور اظہار کا طریقہ (یعنی مافی الضمیر کا اظہار پوری طرح) صرف خبر اور حکایت ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، تو گویا انسان کی زندگی خبر اور حکایت پر ہی موقوف ہے۔

خبرِ متواتر: خبر کی دو قسمیں ہیں ایک متواتر جو یقینی ہے، جیسے: کہا جائے کہ، قاہرہ، دمشق، مکہ وغیرہ، یہ شہر ہیں تو جن لوگوں نے اُن کو نہیں دیکھا، اُن کو بھی یہ خبرِ متواتر، اُن کے شہر ہونے کا ایسا ہی یقین دلاتی ہے، جیسا کہ اُن کے دیکھنے والوں کو، اُن کے شہر ہونے کا ''یقین'' ہے۔

خبرِ واحد: خبر کی دوسری قسم خبرِ غیر متواتر (یعنی جو خبر متواتر نہیں ہے)، اِسی کو خبرِ واحد کہا جاتا ہے اور ہماری مراد ''واحد کی خبر'' سے وہ خبر ہے جو متواتر نہ ہو، بہرحال چونکہ انسان کی

زندگی کا دارومدار خبر پر ہے اور خبر یا متواتر یا غیر متواتر۔

خبرِ متواتر پر عمل دشوار بلکہ تقریباً محال ہے؛ کیونکہ خبرِ متواتر، اُس خبر کو کہتے ہیں کہ اتنی کثیر جماعت کہ جس کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً محال ہو، وہ واقعہ کو محسوس کرے یا مشاہدہ کرے پھر دوسروں کے سامنے اِس طرح نقل کرے کہ اس کی تعداد کم نہ ہونے پائے، تو ایسی خبر کا تحقّق (وجود) انسان کے اعمال میں تقریباً محال ہے، تو لابُدّ (لازماً) انسان کے عمل کرنے کے لیے صرف غیر متواتر (یعنی خبر واحد) ہی موجب ہوسکتی ہے؛ لہٰذا، اگر خبرِ واحد موجبِ عمل نہ ہوگی تو اعمالِ انسانی کا خاتمہ ہوجائے گا اور نظام درہم برہم ہوجائے گا۔

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ، انسان عمل کرنے میں خبر کا محتاج ہے اور خبرِ متواتر جو یقینی اور قطعی ہے، اس کا تحقّق (وجود) دشوار بلکہ تقریباً محال ہے تو لابُدّ (لازماً) خبرِ واحد جو غیر یقینی اور ظنی ہے، وہی موجبِ عمل ہوگی، مثلاً: ایک شخص نے، ایک شخص کو منع کیا کہ، آگے نہ بڑھنا، دیوار گرنے والی ہے۔ اب اگر وہ کہے کہ، تیری خبر تجھ اکیلے کی ہے (یعنی خبر واحد ہے) اور خبر واحد ''ظنّی'' ہے اور میں تو ''یقین'' پر عمل کروں گا اور ''یقین'' حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک دیوار کے گرنے کا مشاہدہ یا احساس جَمِّ غفیر اور ایسی کثیر جماعت نہ کرے، جس کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً محال ہو، ایسی جماعتِ کثیرہ کا تحقّق (وجود) اِس وقت محال اور ناممکن ہے؛ لہٰذا، یقین تو حاصل ہونے سے رہا اور اُس نے منع کرنے والے کی خبر پر عمل نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا اور دیوار کے نیچے دب کر مرگیا، لہٰذا خبر واحد پر عمل نہ کرنا، موجبِ ہلاکت ہوگیا۔

دوسری دلیل:

فائدہ حاصل کرنے سے، نقصان سے بچنا مقدّم ہے یعنی خبر واحد اگر واقع میں نبی ﷺ کا قول ہے تو اِس پر عمل کرکے، ترکِ عمل کے عذاب سے بچنا ہے اور اگر نبی ﷺ کا قول نہیں ہے تو عمل کرنا بے فائدہ ہے، بہر حال عمل کرنے میں دفعِ مَضَرَّت (نقصان سے بچنا) ہے۔

تیسری دلیل:

جب غور وفکر کر کے انسان اِس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ، خبرِ واحد حجّت نہیں ہے اور عمل کو واجب نہیں کرتی تو اب قصداِس بات کا کرے گا کہ خبر واحد پر عمل ترک کرے یعنی قصد ترکِ عمل کا ہوگا، اور قصدِ ترکِ عمل بھی عمل ہے تو اس عمل کا موجب ''وہم'' ہوگا، یعنی خبرِ واحد پر عمل تو ''ظن اور راجح'' کی بنیاد پر ہوتا اور یہ ترکِ عمل ظن اور راجح کے مقابل کی چیز ہے یعنی ''وہم اور مرجوح'' پر ہوا، جبکہ عمل ''وہم'' (جوظن سے کمزور ہے اس) پر رَوَا (جائز) ہوگیا تو ''ظنّ'' (جووہم سے بہت قوی ہے اس) پر بدرجۂ اولی ہونا چاہیے۔

چوتھی دلیل:

قولِ رسول ﷺ کا قطعی ہونا عمل کو واجب کررہا ہے اور عمل کے قطعی واجب ہونے کو حکمِ الٰہی ہونا لازم ہے، تو قولِ رسول کے ''ظنّی'' ہونے کو حکمِ الٰہی کا ''ظنّی'' ہونا لازم ہے اور حکمِ الٰہی کا ''ظنی'' ہونا قطعاً موجبِ عمل ہے: لہٰذا قولِ رسول جوظنی ہے، قطعاً موجبِ عمل ہوگیا۔

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کا وہ قول جس کا قطعاً علم ہے کہ وہ نبی ﷺ ہی کا قول ہے، اُس قول پر قطعی عمل واجب ہے اور عمل کا قطعی واجب ہونا، یہ بتارہا ہے کہ یہ قطعی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، تو قولِ رسول کو حکمِ الٰہی ہونا لازم ہوگیا، یعنی قولِ رسول ملزوم ہے اور حکمِ الٰہی ہونا لازم ہے اور قولِ رسول کے ''ظنّی'' ہونے کو حکمِ الٰہی کا ''ظنّی'' ہونا لازم ہے اور حکمِ الٰہی کے ''ظنّی'' ہونے کو قطعاً وجوبِ عمل لازم ہے، یعنی جب یہ علم ہوجائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ظناً، تو اس ''ظنّی''، حکمِ الٰہی پر عمل واجب ہے، قطعاً۔

پانچویں دلیل:

رسول کا قطعی قول، قطعی حکمِ الٰہی ہے اور قطعی واجب العمل ہے اور رسول کا ظنی قول ظنی حکمِ الٰہی ہے اور ''ظنّی''، حکمِ الٰہی بھی قطعی حکمِ الٰہی کی طرح واجب العمل ہے، لہذا رسول کا ظنی قول (یعنی خبرِ واحد) قطعی واجب العمل ہوگیا۔ اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ عمل کا

واجب ہونا، حکمِ الٰہی پر موقوف ہے، خواہ وہ حکمِ الٰہی قطعی ہو یا ظنی ہو، جیسا کہ ظاہر قرآن پر عمل واجب ہے اور بیشتر آیات کی دلالت اپنے معنی پر ''ظنّی'' ہے، لیکن عمل واجب ہے تو وجوبِ عمل کی علّت، صرف حکمِ الٰہی ہونا ثابت ہوئی، خواہ وہ حکمِ الٰہی قطعی طور پر معلوم ہو یا ظنی طور پر معلوم ہو، ہر صورت میں قطعاً واجب العمل ہے۔

اور قرآن کی آیات کے ''ظنّی'' ہونے کے یہ معنی ہیں کہ، آیات کا جو مفہوم اور معنی مجتہد یا عالم نے سمجھے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہ ہو، اگرچہ آیات کا ثبوت قطعی ہے، لیکن اِن کی دلالت اپنے معنی پر ''ظنّی'' ہے۔

توجس طرح قطعی الثبوت، ظنی الدلالت حکمِ الٰہی موجبِ عمل ہوگیا، بالکل اسی طرح ظنی الثبوت، ظنی الدلالت یا قطعی الدلالت (یعنی خبر واحد اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) موجبِ عمل ہوگیا اور کوئی فرق باقی نہ رہا۔

چھٹی دلیل:

تمام صحابہ علیہم الرضوان کا اِس بات پر اجماع ہے کہ، خبرِ واحد حجّت ہے اور اگر خبر واحد حجّت نہ ہوتی تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم خبرِ واحد پر عمل نہ کرتے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث بیان کی:

الائمة من القريش (1)

''امام قریش میں سے ہوگا''۔

نحن معشر الانبياء لا نرث ولا نورث (2)

''ہم انبیاء کی جماعت نہ وارث ہوتی ہے اور نہ کوئی دوسرا، اُن کا وارث ہوتا ہے''۔

والانبياء يدفنون حيث يموتون (3)

1- مسند احمد، مسند انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رقم:12307

2- صحیح بخاری، کتاب فرض خمس، رقم:3093

3- سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ذکر وفاتہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، رقم:1628

''اور انبیاء جہاں فوت ہوتے ہیں، وہیں دفن ہوتے ہیں''۔

یہ تمام حدیثیں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیں اور تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بالاجماع اِن احادیث کو قبول کرلیا اور اُن کا یہ اجماع، ہم تک بالتواتر منقول ہے۔

ساتویں دلیل:

تواتر سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک ایک (فقط ایک صحابی) کو احکام کی تبلیغ کے لیے بھیجا، اگر خبرِ واحد حجّت نہ ہوتی تو تبلیغ کا فائدہ حاصل نہ ہوتا، بلکہ گمراہی حاصل ہوتی۔

آٹھویں دلیل:

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (1)

''سب مومنوں کو نہیں چاہیے کہ وہ (دین حاصل کرنے کے لیے رسول کی طرف) کُوچ کریں پھر (جتنے فرقے اپنی اپنی بستیوں میں تھے ان میں سے) ہر فرقہ کے ایک ایک طائفہ (گروہ) نے کیوں نہیں کُوچ کیا، دین کو سمجھنے کے لیے، تاکہ وہ (دین کو سمجھ کر) جب (اپنے) وطن لوٹتا تو اپنی قوم کو ڈراتا اور وہ (یعنی اس کی قوم والے) ڈرتے''۔

''فرقہ'' کا لفظ تین پر بولا جاتا ہے، یعنی کم از کم تین (3) پر بولا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے واجب کیا کہ، ہر فرقہ (یعنی ہر تین) میں سے ایک طائفہ (گروہ) نکلتا اور تین میں سے جو نکلیں گے وہ یا تو دو ہوں گے یا ایک ہوگا، تو طائفہ یا ایک ہے یا دو ہیں، بہرحال اس طائفہ (گروہ) کے ڈرانے یعنی اس طائفہ کے خبر دینے پر عمل کو واجب کیا، یعنی جب یہ

1- سورۃ التوبہ:122

طائفہ اپنے وطن کو لوٹ کر جائے اور اپنی قوم کو ڈرائے اور خبر دے تو اُس کی قوم کو، اِس طائفہ کی خبر پر عمل کرنا واجب ہے۔

آیت کا حاصل یہ ہے کہ، یہ طائفہ (گروہ) تفقّہ فی الدین (دین کی سمجھ) کے لیے کُوچ کرے پھر تفقّہ حاصل کر کے، اپنے وطن جب لوٹے تو اپنی قوم کو ڈرائے (یعنی خبر دے) اور خبر دار کر دے کہ: ''اے قوم! رسول ﷺ کی نافرمانی اور مخالفت سے ڈرو''، اور اُس کی قوم پر واجب ہے کہ، وہ اِس طائفہ کے ڈراوے کی خبر سن کر، ڈرے اور اس طائفہ کی خبر پر عمل کرے۔

چونکہ طائفہ ایک کو اور دو کو شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا[1]

''اگر مسلمانوں کے دو طائفہ لڑیں تو ان میں صلح کراؤ''۔

اور صلح جس طرح دو بڑی جماعتوں کی لڑائی میں واجب ہے، اسی طرح دو فردوں کی لڑائی میں بھی واجب ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ، ایک فرد بھی طائفہ ہے؛ لہٰذا، طائفہ کا اطلاق ایک اور دو پر بھی صحیح ہے اور طائفہ کے ڈراوے پر اور ڈرانے کی خبر پر، جب اللہ تعالیٰ نے عمل واجب قرار دیا تو اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ، قوم کے لیے خبرِ واحد شرعاً حجّت ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے واحد کی خبر کو قوم کے لیے حجّت قرار دیا)۔

نویں دلیل:

اعمال، حرکات وسکنات کو کہتے ہیں اور حرکات وسکنات لامحدود ہیں (یعنی کسی حد پر نہیں ٹھہرتے، یعنی انسان بے شمار عمل کرتا ہے) نیز عمل، حالات کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں اور عمل، مختلف احوال میں مختلف احکام چاہتا ہے، لہٰذا، احکام لا انتہا (یعنی بے شمار) ہو گئے اور نصوصِ قرآنی جو موجبِ احکام ہیں، وہ محدود ہیں؛ لہٰذا، اگر صرف نصوصِ قرآنی پر عمل کیا جائے گا تو بیشتر اعمال، بے احکام کے رہ جائیں گے، یعنی بہت سے ایسے

1- سورہ حجرات:9

اعمال ہوں گے کہ، جن کی حرمت علّتِ جواز اور عدمِ جواز کے لیے، کوئی ثبوت قرآن سے نہیں مل سکے گا اور اس وقت انسان کی زندگی، اِن اعمال کی موجودگی میں بیکار اور لغو ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا(1)

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار بنایا ہے''۔

اب اگر حدیث پر عمل نہ ہوگا اور خبرِ واحد پر عمل نہ ہوگا تو انسان کی بیشتر خلقت عبث ہوجائے گی؛ لہٰذا حدیث پر عمل واجب اور ضروری ہے۔

دسویں دلیل:

جھوٹی حدیث وضع (گھڑنا) کرنی، حدیث کے حجّت ہونے پر حجّت ہے، یعنی جعلی سِکّہ جب ہی ڈھالا جائے گا، جبکہ ٹکسالی سکّہ چالو (رائج) ہو اور جبکہ اصلی سکّہ چالو نہ ہو تو جعلی بنانا، بالکل بے سُود (بے فائدہ) ہوگا، چونکہ حدیث کی حجّیت چالو (رائج) تھی، اِس لیے جعلی حدیث وضع کی (گھڑی) گئی، اگر حدیث کی حجّت تمام مسلمانوں میں چالو (رائج) نہ ہوتی تو وضّاعین (حدیث گھڑنے والوں) کو جعلی اور نقلی حدیث وضع کرنے سے، کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

گیارہویں دلیل:

اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡعٰى قَالَ يٰمُوۡسٰٓى اِنَّ الۡمَلَاَ يَاۡتَمِرُوۡنَ بِكَ لِيَقۡتُلُوۡكَ فَاخۡرُجۡ اِنِّىۡ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيۡنَ (2)

''ایک شخص شہر کے پرلے کنارے سے دوڑتا ہوا آیا اور کہا، اے موسیٰ! اہل دربار تیرے قتل کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں، سو تو نکل جا، میں تیرا خیر خواہ ہوں''۔

1- سورۃ المومنون:115

2- سورۃ القصص:20

اگر واحد کی خبر، قابلِ قبول اور موجبِ عمل نہ ہوتی تو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کی خبر سے باہر نہ جاتے اور اسی طرح جب عورت بلانے آئی تھی اور اس نے کہا تھا:

اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا (1)

''میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے، تاکہ تجھ کو پانی پلانے کا بدلہ دیوے''۔

اس ایک عورت کی خبر اگر قابل قبول نہ ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس کے ساتھ نہ جاتے، پھر جب اُس عورت کے باپ کے پاس پہنچے اور اُن سے سارا واقعہ بیان کیا تو عورت کا باپ یہ نہ کہتا کہ فکر نہ کر تو ظالم لوگوں سے بچ نکلا۔

یعنی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سارا واقعہ بیان کیا اور اُنھوں نے اُن کی خبر سن کر تصدیق کی اور ان کو مطمئن کیا اور فرعون والوں کو ظالم قرار دیا، تو اگر خبرِ واحد قابل قبول نہ ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جو ابھی نبی نہیں ہوئے تھے، ان کی خبر حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام قبول نہ کرتے اور اسی طرح فرعون والوں میں سے، جو مومن مرد اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا، اس نے کہا:

وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ (2)

''اے میری قوم! میری پیروی کرو، میں تم کو بھلائی کا راستہ دکھلاتا ہوں''۔

اُس ایک شخص کی اتبّاع ہدایت ہے، اگر اس کی اتبّاع، اس کا قول، قابلِ قبول نہ ہوتا تو کس طرح سیدھے راستے کی ہدایت ہو سکتا تھا؟

پھر اس شخص نے کہا:

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ (3)

''عنقریب تم کو میرا کہنا اور میرا قول یاد آئے گا (تم میری بات یاد کرو گے)''۔

1- سورۃ القصص:25

2- سورۃ المومن:38

3- سورۃ المومن:44

اگر اس کا قول حجت نہ ہوتا تو کیوں کر یاد آتا؟ اور اس کا قول حجت نہ ہوتا تو اس کے نہ ماننے سے آلِ فرعون کو عذاب نہ گھیرتا، اِس سے معلوم ہو گیا کہ خبرِ واحد قابلِ قبول اور حجت ہے، قرآن کی رُو سے۔

بارہویں دلیل:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ جَآءَ مِنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ رَجُلٌ يَّسۡعٰى (1)

''شہر کے پرلے کنارے سے، ایک شخص دوڑتا ہوا آیا''۔

قَالَ يٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِيۡنَ (2)

''اس نے کہا، اے میری قوم! رسولوں کی پیروی کرو''۔

اگر اس شخص کا قول، اس کی قوم پر حجت نہ ہوتا تو اس شخص کی نافرمانی پر، اُس کی قوم عذاب کی مستحق نہ ہوتی اور عذاب کی ایک ہی چنگھاڑ میں، وہ جل بجھ کر راکھ نہ ہو جاتی، اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ خبرِ واحد (قرآن کی رُو سے) حجت ہے۔

تیرھویں دلیل:

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا (3)

''اگر تمہارے پاس فاسق خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو''۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ فاسق کی خبر قابلِ تحقیق ہے، نہ کہ قابلِ ردّ، یعنی اگر عادل خبر لائے تو قبول کر لو اور فاسق خبر لائے تو بلا تحقیق قبول نہ کرو، یعنی فاسق کی خبر بھی قابلِ ردّ نہیں ہے، بلکہ قابلِ تحقیق ہے؛ لہٰذا عادل کی خبر، بغیر تحقیق قابل قبول ہے، قرآن کی رُو سے۔

1- سورہ یٰس:20

2- سورہ یٰس:20

3- سورہ حجرات:6

چودھویں دلیل:

خبرِ واحد حجّت نہیں ہے، یہ بات قرآن سے ثابت نہیں ہے، خبرِ واحد حجت ہے، یہ بات قرآن سے ثابت ہے، حدیث سے ثابت ہے، عقل سے ثابت ہے، اجماع سے ثابت ہے، تمام محدثین سے ثابت ہے، تمام مجتہدین سے ثابت ہے، تمام ائمۂ محققین سے ثابت ہے۔

اب بتاؤ کہ، جو بات کسی ذریعہ سے ثابت نہیں ہے، وہ قابلِ قبول ہے یا وہ بات جو ہر ذریعہ سے ثابت ہے، وہ قابل قبول ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ[1]

''جس چیز کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو''۔

لہٰذا ''خبر واحد حجت نہیں ہے''، یہ ایسی بات ہے کہ جس کا کسی ذریعہ سے علم نہیں ہے، اس لیے اس کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔

❖❖❖❖❖

1- سورہ بنی اسرائیل:36

منکرینِ احادیث کے جوابات

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سوال: یہ ثابت ہو چکا کہ نبی ﷺ کا قول حجت ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ، اگر کوئی قولِ نبی ﷺ قرآن کے خلاف ہو یعنی قرآن سے کسی چیز کا جواز نکلے اور نبی ﷺ کے قول سے عدم جواز، یا نبی ﷺ کا قول قرآن سے زائد ہو یعنی قرآن میں اختصار ہو اور نبی ﷺ کے قول میں تفصیل ہو، یا قرآن میں مذکور ہی نہ ہو، صرف نبی ﷺ کے قول میں مذکور ہو تو ایسی صورت میں نبی ﷺ کا قول حجت ہے یا نہیں؟

جواب: ہر صورت میں نبی ﷺ کا قول حجت ہے، نبی ﷺ کا قول مستقل حجت ہے، غیر مشروط حجت ہے، نبی ﷺ کے قول کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ، وہ قرآن کے مطابق ہو تب تو حجت رہے، اگر مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے، یہ شرط غیرِ نبی کے لیے ہے، اگر غیرِ نبی کا قول قرآن کے مطابق ہے تو بے شک ہر غیرِ نبی کا قول بھی حجت ہے، اگر مطابق نہیں ہے تو ہر غیر نبی کا قول حجت نہیں ہے، بلکہ جس طرح قرآن کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ، وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو، اِسی طرح نبی ﷺ کے قول کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ، وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ، قرآن کا حجت ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ من جانبِ اللہ ہے، صرف من جانبِ اللہ ہونا قرآن کے حجت ہونے کی وجہ ہے، بالکل اِسی طرح نبی ﷺ من جانبِ اللہ ہیں؛ کیونکہ اس کی تصدیق معجزہ کرتا ہے اور معجزہ ''من جانبِ اللہ'' ہوتا ہے،

لہٰذا نبی ﷺ اور نبی ﷺ کا قول بھی معجزہ کے بعد ''من جانبِ اللہ'' ہوگیا، اور من جانبِ اللہ ہونا ہی حجت ہے، لہٰذا نبی ﷺ کا قول اور نبی، مستقل حجت ہیں۔

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ، نبی ﷺ اور قولِ نبی ''من جانبِ اللہ'' ہیں، اور ہر وہ شے جو ''من جانبِ اللہ'' ہے، قابلِ قبول اور حجتِ عمل ہے؛ لہٰذا نبی اور قولِ نبی حجت عمل ہے۔

نبی کا قول، قولِ الٰہی ہے اور ''من جانبِ اللہ'' ہے، اِس آیت سے بھی ثابت ہے:

قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ (1)

''کہہ دیں کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی طرف سے تبدیل کردوں، میں تو صرف وحی کا پیرو ہوں''۔

صاف ظاہر ہوگیا کہ، نبی ﷺ کا قول وحی ہے، قولِ الٰہی ہے، من جانبِ اللہ ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ ''قرآن من جانبِ اللہ ہونے کی حیثیت سے حجّت ہے، نہ کہ قرآن اور کتاب ہونے کی حیثیت سے''، یہ ہے کہ متشابہات قرآن ہیں اور حجت نہیں ہیں، متشابہات پر عمل کرنے کو ''زیغ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ (2)

''جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں''۔

غرضیکہ قرآن کا وہ حصہ جو متشابہات ہیں، باوجود قرآن ہونے کے حجّتِ عمل نہیں ہے، اور قرآن کا حجت ہونا صرف ''من جانبِ اللہ'' ہونے کی حیثیت سے ہے، لہٰذا، علّتِ حجت ''من جانبِ اللہ'' ہونا ہے، اور فرمایا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ (3)

1- سورہ یونس:15

2- سورہ آل عمران:7

3- سورہ طٰہٰ:114

''قرآن کو، جب تک اس کے متعلق پوری وحی تمہارے پاس نہ آجائے، جلدی نہ بیان کرو۔''

یعنی خالی قرآن نازل ہوتے ہی مت بیان کرو، جب تک اس قرآن کے متعلق تمام وحی تم پر نازل نہ ہوجائے، یہ وہی وحی ہے جو''غیرِ قرآن'' ہے قرآن کی تفصیل اور اس کے متعلقات، اِس وحی کے ذریعہ بتائے جاتے ہیں اور اِسی وحی میں یہ بتایا جاتا ہے کہ، یہ قرآن محکم ہے اور حجت ہے اور یہ قرآن متشابہ ہے اور حجت نہیں ہے، اِس بیان سے صاف ظاہر ہوگیا کہ نبیؐ ''من جانبِ اللہ'' ہے اور نبی کا قول ''من جانبِ اللہ'' ہے، لہٰذا یہ دونوں مستقل حجتیں ہیں۔

اب اگر کوئی کہے کہ، متشابہ ''من جانبِ اللہ'' ہے، اور من جانبِ اللہ ہونا (بقول تمہارے) قابلِ قبول اور حجتِ عمل ہے، تو چاہیے کہ متشابہ بھی قابلِ قبول اور حجتِ عمل ہو؟

اس کا حل یہ ہے کہ، متشابہ قابلِ قبول اور قابلِ ایمان ضرور ہے، لیکن قابلِ عمل نہیں ہے، دوسری آیت نے متشابہات پر عمل کرنے کی ممانعت کردی ہے، اور وہ آیت یہ ہے:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ[1]

''جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ اس کتاب کے متشابہات پر عمل کرتے ہیں''۔

اس آیت کی بنا پر، متشابہات نا قابلِ عمل ہو گئے۔

رہی یہ بات کہ قولِ رسول ﷺ، قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ[2]

''تمہارے اوپر والدین کے لیے وصیت فرض ہے، اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اسے موت آئے''۔

1- سورہ آل عمران:7

2- سورۃ البقرہ:180

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لاوصیۃ لوارث[1]

''وارث کے لیے وصیت نہیں ہے''۔

اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اِسی حدیث پر رہا ہے (یعنی وارث کے لیے وصیت ناجائز قرار دی گئی) حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی آیت کے خلاف حجّت اور موجبِ عمل رہا ہے اور اس حدیث کا موجبِ عمل اور حجت ہونا، تواتر سے ثابت ہے، نیز اکثر دینی مسائل کا ثبوت قرآن سے نہیں، حدیث سے ہے، لہٰذا قولِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجّتِ مستقلّہ اور غیر مشروط حجّت ہے۔

علی ہذا، اجماع بھی غیر مشروط حجت ہے، یہ ہی وجہ ہے کہ ''اولی الامر'' کا عطف ''رسول'' پر ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ[2]

اعتراض:

اب اگر کہا جائے کہ، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول، قرآن کے خلاف ہو اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول، قرآن کو نسخ کر دے؟؟

جواب:

تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول اس کا اپنا نہیں ہوتا، وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے، جس طرح قرآن خدا کا قول ہے، اِسی طرح رسول کا قول بھی خدا کا قول ہے اور جس طرح قرآن کی ایک آیت، قرآن کی دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے، اِسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسول) دوسرے قول (یعنی قرآن) کو منسوخ کر دیتا ہے، استعجاب (تعجب) کا باعث صرف یہ ہے کہ، رسول کے قول کو رسول کا قول سمجھا جا رہا ہے،

1- جامع ترمذی، ابواب الوصایا، باب ماجاء لا وصیۃ لوارث، رقم:2120

2- سورۃ النساء:59

رسول کے قول کو بشر کا قول سمجھا جا رہا ہے، یاد رکھو! رسول کا قول، خدا ہی کا قول ہے:

وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (1)

''وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، اس کا بولنا صرف وہ وحی ہے، جو اس پر کی گئی ہے''۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ نبی کا ہر قول وحی ہے، اس کی وضاحت یوں بھی ہوسکتی ہے کہ:

نبی کا یا تو ہر قول وحی ہے یا کوئی قول وحی نہیں ہے یا بعض وحی ہیں اور بعض قول وحی نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کا کوئی بھی قول، وحی نہیں ہے تو شروع مسئلہ میں ہم نے اس خیال کو باطل کر دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن کے علاوہ، نبی پر وحی ہوئی، لہٰذا یہ کہنا کہ نبی کا کوئی قول وحی نہیں، قطعی غلط ہے۔

اب دوسری صورت، نبی کے بعض قول وحی ہیں اور بعض قول وحی نہیں ہیں، تو یہ بھی باطل ہے؛ اس لیے کہ بعض اقوال کا وحی ہونا اور بعض کا وحی نہ ہونا، تخصیص بلا مخصص ہے، یہ محال اور باطل ہے۔

پھر بعض اقوال کا وحی ہونا، آخر کسی قول سے معلوم ہوا؟

اگر نبی کے ایسے قول سے معلوم ہوا، جو وحی ہے تو یہ قولِ الٰہی بعض میں شامل ہے، اگر ایسے قول سے معلوم ہوا، جو وحی نہیں ہے تو نبی کا ایسا قول، جو وحی نہیں ہے، ایسے قول پر حجت ہو گیا، جو وحی ہے اور تم غیر وحی کو حجت ہی نہیں مانتے، لہٰذا یہ شق بھی باطل ہو گئی۔

اور جب دونوں شقیں باطل ہو گئیں (یعنی نبی کا قول وحی نہیں ہے اور یہ بھی باطل ہو گیا کہ نبی کے بعض قول وحی ہیں اور بعض قول وحی نہیں ہیں) تو لامحالہ یہ تیسری شق ثابت ہو گئی کہ، ''نبی کا ہر قول وحی ہے'' اور جب ہر قول وحی ہے تو نبی کا ہر قول حجّت ہے اور قابلِ قبول ہے۔

1- سورۃ النجم: 3، 4

بولو کیا کہتے ہو، جب نبی نے پہلی بار کہا: ''میں اللہ کا رسول ہوں، میرا کہنا مانو'' اور ابھی کتاب نازل نہیں ہوئی یا نازل ہوئی تو ایک دو آیتیں (جس میں نبی کی پیروی کا ذکر نہیں ہے) اِس وقت اُس (نبی ﷺ) کا قول ماننے کے قابل ہے یا نہیں؟

اگر کہو کہ ماننے کے قابل نہیں ہے تو قطعی کافر ہو گئے اور اگر کہو کہ ماننے کے قابل ہے تو قطعاً نبی کا قول مطلقاً حجت ہو گیا، قطع نظر کتاب کے۔

اگر نبی کا قول بغیر کتاب کے حجت نہ تھا تو گویا فرعون کو بے حجّت عذاب دیا گیا، حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا[1]

''ہم جب تک رسول نہیں بھیج لیتے، اس وقت تک عذاب نہیں کرتے''۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ نبی کا قول (کتاب سے قطع نظر کر کے) حجت ہے۔

سوال: نبی کی طرف بے حیائی کی نسبت، جھوٹ کی نسبت، غیر معقولیت کی نسبت، ناواقفیت کی نسبت، جن احادیث سے ظاہر ہو، اُن احادیث کو اِن نقائص کی بنا پر حدیث رسول سے خارج کر دینا چاہیے یا نہیں؟

جیسا کہ بعض احادیث سے ثابت ہے کہ، حضرت عائشہ اور حضور ﷺ ایک ظرف (برتن) میں غسل کرتے تھے اور جیسا کہ بعض احادیث میں ہے کہ، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تین جھوٹ بولے اور جیسا کہ مذکور ہے کہ، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملک الموت کو تھپڑ مارا، اور جیسا کہ کھجور کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ: زیادہ پھل آئے گا اور زیادہ پھل نہیں آیا۔

ان احادیث سے بے حیائی، جھوٹ، نامعقولیت اور ناواقفیت، نبی کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

جواب: محض اِن نسبتوں سے حدیث ناقابلِ قبول نہیں ہوتی، مثلاً: بے حیائی کی جو نسبت کی

1- سورہ بنی اسرائیل: 15

گئی ہے، وہ محض نسبت کرنے والے کا خیال ہے، میاں بیوی کی برہنگی سے، اگر بے حیائی مقصود ہوتو نظامِ نسل باطل ہوجائے گا، بے حیائی تو وہ ہے جسے نبی بے حیائی بتائے، نبی نے کہیں میاں بیوی کے غسل کو بے حیائی نہیں بتایا، نہ کتاب اللہ نے اس فعل کو بے حیائی بتایا اور اگر اس قسم کی باتوں کو بے حیائی سے تعبیر کیا جائے گا تو اللہ نے جو ''کواعب'' کا لفظ عورتوں کی تعریف میں فرمایا ہے، یہ بے حیائی ہوگی۔ ''کواعب'' کاعبہ کی جمع ہے اور ''کاعب'' اس عورت کو کہتے ہیں جس کے پستان ابھرے ہوئے ہوں، اگر عورت کے پستان کی تعریف بے حیائی ہے تو اس کو بھی قرآن سے خارج کردینا چاہیے اور اگر بے حیائی نہیں ہے تو عورت مرد (یعنی میاں بیوی) کا باہم غسل بھی بے حیائی نہیں ہے۔

ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف جو جھوٹ کی نسبت ہے، اس نسبت سے بھی حدیث کو حدیث ہونے سے خارج نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر اس نسبت سے حدیث کو خارج کیا جائے گا تو قرآن کو بھی خارج کیا جائے گا، فرمایا:

جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ (1)

''اس (یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے) اپنے بھائی کے سامان میں، پانی پینے کا برتن رکھ دیا اور پھر یہ کہلوا دیا کہ تم چور ہو''۔

ظاہر میں یہ فعل، جھوٹ سے بھی بدتر ہے اور فرمایا:

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (2)

''ہم نے یوسف کو یہ تدبیر سکھائی''۔

بہرحال قرآن میں یہ نقص نبی کی طرف منسوب ہے، تو چاہیے کہ اس آیت کو قرآن سے نکال دیا جائے۔

1- سورہ یوسف:70

2- سورہ یوسف:76

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملک الموت کو تھپڑ امارا، یہ بھی خلافِ عقل اور غیر معقول نہیں ہے کہ، جب انسان کی فرشتہ سے ہم کلامی مان لی، جو بظاہر غیر معقول ہے تو پھر ہاتھا پائی ماننے میں کیا غیر معقولیت ہے، دونوں ایک ہی درجہ کی باتیں ہیں، یعنی جو شخص کسی سے بات چیت کر سکتا ہے، وہ اس کو تھپڑ بھی مار سکتا ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ [1]

''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ہیں، ان کو مردہ مت کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم کو شعور نہیں''۔

شہید کو زندہ کہنا، صرف عقل ہی کے خلاف نہیں بلکہ حِس کے بھی خلاف ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کہا اور مزید تاکید کر دی کہ، تم بے حِس ہو، بے شعور ہو، تم کو پتہ نہیں، شہید کی زندگی قطعی عقل میں نہیں آتی، تو اگر حدیث کا خلافِ عقل ہونا، حدیث کو خارج کر دیتا تو قرآن کا خلافِ عقل ہونا، قرآن کو خارج کر دیتا؟

یعنی جو اعتراض حدیث پر ہے، بالکل وہی اعتراض قرآن پر ہے اور جس طرح قرآن پر اعتراض، قرآن کو قرآن ہونے سے خارج نہیں کرتا، اسی طرح حدیث پر اعتراض، حدیث کو حدیث ہونے سے خارج نہیں کرتا۔

اور کھجور کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا ویسا نہیں ہوا تو یہ بالکل قرآن کے مطابق ہے:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا [2]

''اور کسی کے کام کے بارے میں یہ نہ کہا کرو کہ کل اس کو کروں گا''۔

جیسا روح اور ذوالقرنین اور اصحابِ کہف کے سوال کے موقع پر حضور نے کہہ دیا تھا کہ، کل جواب دے دوں گا اور پھر کل جواب نہیں دیا، اس آیت سے وہی بات ظاہر ہو رہی

1- سورۃ البقرہ:154

2- سورہ کہف:23

ہے، جو حدیث سے ظاہر ہو رہی ہے اور جس طرح یہاں یہ بات نبوت کے منافی نہیں ہے، اِسی طرح وہاں بھی نبوت کے منافی نہیں ہے۔

اس سارے بیان کا حاصل یہ ہے کہ حدیث پر جتنے اعتراضات ہیں، اسی نوعیت کے اعتراضات قرآن پر وارد ہوتے ہیں، تو جس طرح قرآن کو قرآن ہونے سے، ان اعتراضات کی بنا پر، خارج نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ان اعتراضات کی بنا پر حدیث کو حدیث ہونے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

تم کہتے ہو حدیث میں یہ بات ہے، اس بات کی وجہ سے ہم نہیں مانتے، ہم کہتے ہیں یہی بات قرآن کی آیت میں بھی ہے تو چاہیے کہ اس کو بھی نہ مانو اور یہ بیان تمام اعتراضاتِ حدیث کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

ضروری وضاحت:

حدیث کو اس وقت نہیں مانا جائے گا جب خبرِ واحد کو قبول کرنے کے شرائط مفقود ہو جائیں، قرآن کو اس وقت نہیں مانا جائے گا، جب خبر متواتر کے شرائط مفقود ہو جائیں۔

خبر کے صحیح ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ، وہ فی نفسہٖ مستحسن ہو، اچھی ہو، معقول ہو، بلکہ خبر کے صحیح ہونے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ، جس کی طرف سے خبر دی جا رہی ہے، اُس تک اسے ثابت کر دیا جائے، خبر کی ذمہ داری قائل پر ہے، جو شخص نقل کر رہا ہے، اُس کی ذمّہ داری صرف نقل کی صحت پر ہے اور نقل کی صحّت پر بارہ سو سالہ (1200) اجماع بالکل کافی اور وافی ہے۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک بات فی نفسہٖ حسن ہے، اچھی ہے، واقعہ کے مطابق ہے، حق ہے لیکن جس شخص کی طرف سے اُس کو نقل کیا جا رہا ہے، درحقیقت اس کا قول نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ایک بات ہماری عقل میں معقول ہو اور قائل کا قول نہ ہو، ہو سکتا ہے کہ ایک بات ہماری عقل میں نہ آئے اور وہ قائل کا قول ہو۔

تو یہ کہنا کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہے، اُسے مانیں گے اور جو قرآن کے مطابق

نہیں ہے اُسے نہیں مانیں گے، (یہ) غلط ہے، ہوسکتا ہے کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہے وہ فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ ہو اور ہوسکتا ہے کہ، جو حدیث قرآن کے مطابق نہ ہو، وہ قولِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہو۔

سوال: جب کہ یہ ثابت ہو چکا کہ قولِ رسول حجت ہے اور احادیث شرعاً حجت ہیں اور دین یا دین کا جزء ہیں، تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جس طرح قرآن کو لکھوا کر قوم کو دے دیا، اِسی طرح احادیث کے مجموعہ کو بھی لکھوا کر دینا چاہیے تھا، لکھوا کر کیوں نہیں دیا؟

جواب: احادیث کے مجموعہ کو اس لیے نہیں لکھوا کر دیا کہ احادیث کا مجموعہ وحیِ غیرِ کتاب ہے، کسی زمانے کے نبی نے وحیِ غیرِ کتاب کو لکھ کر نہیں دیا، حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام کی طرف وحی کی:

وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ [1]

اور اس وحی کے متعلق تمام واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا:

مَا کُنۡتَ تَعۡلَمُہَاۤ اَنۡتَ وَ لَا قَوۡمُکَ مِنۡ قَبۡلِ ہٰذَا [2]

''تو اور تیری قوم اس سے پہلے، اِن واقعات کو نہیں جانتی تھی''۔

نبی (حضرت نوح) کی قوم، سارا عالَم ہے اور جب کہ سارا عالَم حضرت نوح والی وحی سے ناواقف ہے تو ضرور بالضرور، وہ وحیاں جو غیرِ کتاب تھیں وہ لکھی نہیں گئیں، اگر لکھی جاتیں تو یہود یا نصاریٰ، کوئی نہ کوئی قوم، اِن لکھی ہوئی وحیوں پر مطلع ہوتی۔

اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ، احادیث میں زیادہ تر اعمال کا ذکر ہے، اعمال ایسی چیز ہیں، جو پڑھنے پڑھانے سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے، اعمال تو کرنے کی چیز ہیں، اس لیے عمل کو نہیں لکھوایا بلکہ عمل کی پریکٹس (مشق) کرادی، عمل کو یاد کرانا یا پڑھوانا لکھوانا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ عمل کو تو کرانا مقصود ہوتا ہے؛ اس لیے حدیث پر عمل کرایا اور اس کی مشق کرادی، فرمایا:

1- سورہ ھود:36

2- سورہ ھود:49

صَلُّوا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ أُصَلِّیْ (1)

''جس طرح میں نماز پڑھتا ہوں، اسی طرح تم بھی نماز پڑھو''۔

یعنی عمل کی مشق کرائی، یہ نہیں کہا کہ صرف اس حدیث کو یاد کر کے لکھو، لیکن بعد میں زمانہ ایسا آیا کہ، بدعملی بڑھی تو نصیحت کی باتیں جن لوگوں کو یاد تھیں، انھوں نے لکھ لیں تا کہ نصائح مفقود نہ ہو جائیں اور قرآن میں قصصِ اوّلین اور جملہ عقائد ہیں، وہ یاد نہیں رہ سکتے تھے، اس لیے اُن کو لکھنے کا حکم دیا۔

اس کے علاوہ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کو لکھوا کر دیا تو یہ لکھ کر دینے کا حکم کہیں قرآن میں نہیں ہے، جہاں ہے:

وَ اتْلُ مَآ اُوْحِیَ۔ (2)

''پڑھ جو وحی کی گئی''۔

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ۔ (3)

''جب قرآن پڑھا جائے تو سنو''۔

کہیں یہ نہیں کہ قرآن کو لکھو، پھر جو نبی ﷺ نے قرآن کو لکھوا کر دیا یہ کس وجہ سے دیا؟ یا تو وحی کے ذریعہ ان کو حکم ہوا کہ ''قرآن لکھوا دو''، اگر ایسا ہے تو وحیِ غیرِ قرآن اور وحی غیرِ متلو ثابت ہو گئی اور اگر بغیر وحی کے کیا تو اُن کی رائے حجت ہو گئی، لہٰذا اُن کی رائے سے قرآن لکھا گیا اور اُن ہی کی رائے سے حدیث نہیں لکھی گئی، دونوں جگہ ایک ہی چیز کارفرما ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ وحی ہوئی کہ ''قرآن لکھوا دو''، اِسی طرح یہ وحی ہوئی کہ ''حدیث نہ لکھواؤ'' اور اگر ذاتی رائے یہ ہوئی کہ ''قرآن لکھواؤ'' تو بے شک ذاتی رائے

1- صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر، رقم: 631

2- سورہ کہف: 27

3- سورۃ الاعراف: 204

یہ بھی ہوئی کہ ’’حدیث نہ لکھواؤ‘‘۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۔ (1)

’’ہم نے نصیحت نازل کی اور ہم ہی اِس کے نگہبان اور محافظ ہیں‘‘۔

اور ظاہر ہے کہ قرآن محفوظ ہے اور حدیث محفوظ نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، اِسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، بس وہی چیز دین ہے اور وہ چیز محفوظ ہے اور حدیث چونکہ محفوظ نہیں ہے؛ اس لیے نہ خدا اس کا محافظ ہے، نہ یہ ذکر (نصیحت) ہے، نہ دین۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے ’’ذکر‘‘ یعنی نصیحت کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے اور اُس کا وعدہ سچا ہے، وہ ذکر اور نصیحت کا محافظ ہے اور ذکر اور نصیحت قرآن اور حدیث دونوں میں ہے، لہٰذا دونوں محفوظ ہیں، قرآن بھی محفوظ ہے اور حدیث بھی محفوظ ہے، بلکہ قرآن کے حافظ تو ایک فی صد (1٪) مشکل سے ملیں گے اور حدیث کے معانی کے حافظ، ساری قوم ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ مسواک سنت ہے، عید کے دن روزہ حرام ہے، زنا کی سزا رجم ہے، صبح کی نماز کی دو سنتیں ہیں، ظہر کی چھ سنتیں ہیں، قبر میں نکیرین سوال کریں گے، عذابِ قبر و ثوابِ قبر حق ہے، غرض یہ کہ معاملات اور عبادات کے جو طریقے حدیث نے بتائے ہیں، وہ ہر جاہل اور عالم کے حافظہ میں محفوظ ہیں، اللہ کا وعدہ سچا ہے، اس نے دین کو محفوظ کر دیا ہے، ہر شخص حافظِ سنّت ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ حدیث غیر محفوظ ہے، بالکل غلط ہے، حدیث عملاً محفوظ ہے، قرآن تلاوتاً محفوظ ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

1- سورۃ الحجر:9

منکرِ حدیث کے ترجمہ کی غلطی

سوال: منکرینِ حدیث نے اللہ تعالیٰ کے اس قول یعنی:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ۔ (1) کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ:

''کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اس کو کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ، اللہ کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو''۔ اُسے یہی کہنا چاہیے کہ تم سب ربّانی بن جاؤ، سوال یہ ہے کہ، یہ معنی صحیح ہیں یا غلط ہیں؟

جواب: یہ معنی غلط ہیں، یعنی حکم کے معنی حکومت کے اور کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ کے معنی ''میری محکومی اختیار کرو'' کے غلط ہیں۔

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں ''حکم'' کے معنی ''فہم'' کے ہیں اور نیز اگر ''حکم'' کے معنی حکومت کے ہوں گے، تو آیت اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا۔ (2) کے یہ معنی ہوں گے کہ ''ہم نے یحییٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو بچپن میں حکومت دی تھی'' اور یہ بالکل غلط ہے اور جن بندوں کو ''حکم'' اور نبوت ملی ہے، اُن میں اکثر صاحب حکم اور صاحبِ نبوت، کو حکومت نہیں ملی، اگر ''حکم'' کے معنی حکومت کے ہوں، تو ہر وہ شخص جس کو حکم و نبوت ملے، وہ صاحبِ حکومت ہو، حالانکہ بیشتر انبیاء صاحب حکومت نہ تھے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ، ہر نبی صاحبِ حکم ہے اور صاحبِ حکومت نہیں ہے، اب اگر حکم اور حکومت ایک ہی چیز ہو تو ہر نبی صاحبِ حکومت ہو، حالانکہ ہر نبی صاحب حکومت نہیں ہے، کیونکہ اکثر انبیاء کو تکلیفیں دی گئیں اور قتل بھی کیے گئے، اگر صاحب حکومت ہوتے تو

1- سورہ آل عمران:79

2- سورہ مریم:12

تکلیف زدہ نہ ہوتے اور نہ مقتول ہوتے، لہٰذا یہاں ''حکم'' کے معنی حکومت کے نہیں ہیں۔

دوسری غلطی اس ترجمہ میں یہ ہے کہ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ کے معنی ''میری محکومی اختیار کرو''، کے نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ ''میرے بندے ہوجاؤ''۔

''عباد'' کے معنی بندے کے ہیں، ''عباد'' کے معنی محکومی کے نہیں ہیں؛ اس لیے کہ ''عباد'' کا لفظ جس طرح انسانوں کے لیے آیا ہے اسی طرح قرآن شریف میں غیر انسانوں کے لیے بھی آیا ہے، جیسے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (1)

''بے شک اللہ کو چھوڑ کر جن کو تم پکارتے ہو، وہ تم ہی جیسے بندے ہیں''۔

یہاں بتوں کو اللہ تعالیٰ نے ''عباد'' سے تعبیر کیا ہے۔

فرشتوں کے متعلق فرمایا:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (2)

''بلکہ وہ معزز بندے ہیں''۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ۔ (3)

''کیا پھر بھی کافر اس خیال میں ہیں کہ، مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا حمایتی بنائیں''۔

اور جن بندوں کو ان کافروں نے حمایتی اور اولیاء بنایا ہے، وہ بت ہیں، شمس وکواکب ہیں، جن ہیں، ملائکہ ہیں، مسیح ہیں۔

غرضیکہ ''عباد'' کا لفظ مخلوق کے لیے مستعمل ہے اور جگہ جگہ قرآن میں ''عباد'' کا لفظ مخلوق ہی کے معنی میں آیا ہے، محکوم کے معنی میں نہیں آیا، اور ظاہر ہے کہ مخلوق کی اِن مشرکوں

1- سورۃ الاعراف:194

2- سورۃ الانبیاء:26

3- سورۃ الکہف:102

نے عبادت تو کی ہے، مگر محکومی اور اطاعت نہیں کی ہے؛ اس لیے کہ نہ ملائکہ نے، نہ جنوں نے، نہ شمس وکواکب نے، نہ مسیح نے، نہ بتوں نے، اُن کو حکم دیا کہ ''ہماری عبادت کرو''۔ یعنی یہ بغیر ان کے حکم کے، ان کی عبادت کررہے ہیں، تو یہ مشرک ان کی عبادت تو کررہے ہیں، مگر ان کی اطاعت اور محکومی نہیں کررہے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ، عبادت اور چیز ہے، اطاعت اور محکومی اور چیز ہے تو یہ معبودانِ باطل معبود تو ہیں لیکن مُطاع اور حاکم نہیں ہیں۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصنام اور جن وغیرہ معبود (مشرکوں نے ان کی عبادت کی ہے) ہیں اور اصنام وجن وغیرہ مُطاع نہیں ہیں، نتیجہ صاف برآمد ہوا کہ معبود مُطاع نہیں ہے اور جب معبود مُطاع نہیں ہے تو عبادت اطاعت نہیں رہی اور جب عبادت، اطاعت نہیں تو عِباد (بندے) مطیع، فرمانبردار، محکوم نہ ہوئے تو کُوْنُوْا عِبَاداً لِّیْ کے یہ معنی کہ ''میرے فرمانبردار مطیع محکوم ہوجاؤ'' غلط ہوئے اور یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔

اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ ''نبی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تمھارا خالق ہوں، تم میری مخلوق ہو، میں تمھارا معبود ہوں، تم میرے عابد ہو اور میری پوجا کرو اور میری پرستش کر''، بلکہ وہ یہ کہے گا کہ ''رب پرست ہوجاؤ، ربّانی ہوجاؤ''۔

میں کہتا ہوں کہ اطاعت کے معنی امتثالِ امر (یعنی حکم کی تعمیل) کے ہیں اور امر وحکم کے مطابق کام کرنا تو اطاعت کے لیے یہ ضروری ہے کہ، اطاعت کرانے والا، امر کرنے والا ہو، اور اِن معبودانِ باطل نے کوئی حکم نہیں دیا، کوئی امر نہیں کیا تا کہ ان کے حکم کی تعمیل، اُن کی اطاعت سمجھی جاتی، لہٰذا یہاں اطاعت قطعاً متحقق نہیں ہے اور عبادت قطعاً متحقق ہے تو معلوم ہوگیا کہ عبادت، اطاعت نہیں ہے، عبادت حکم نہیں ہے، تا کہ عباد اور عابدین، مطیع اور محکوم کہلاتے، غور کرو۔

سوال: منکرینِ حدیث نے اپنے رسالہ ''اطاعتِ رسول'' میں کہا ہے کہ، اطاعت صرف اللہ کی ہے، یہ صحیح ہے یا غلط؟

جواب: یہ غلط ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، حتیٰ کہ ایمان بھی غیرُ اللہ (یعنی انبیاء اور رسل اور ملائکہ پر لانا فرض) ہے، لیکن عبادت انبیاء وملائکہ اور رسل کی حرام ہے، عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے اور اطاعت اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہیں ہے، جس طرح ایمان اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہیں ہے، فرمایا:

اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ ۔[1]

''مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ''۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ۔[2]

''اللہ اور رسول کی اطاعت کرو''۔

اطاعت میں اشتراک اور ایمان میں اشتراک واجب ہے، عبادت میں اشتراک حرام ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ایمان بھی عبادت سے الگ چیز ہے اور اطاعت بھی عبادت سے الگ چیز ہے۔

❖❖❖❖❖

1- سورۃ المائدہ:111

2- سورہ آل عمران:32

رسالہ ''طلوعِ اسلام'' جون 1957ء کے باب المراسلات کے جوابات

سوال: طلوع اسلام بابت ماہ جون 1957ء میں چھپا ہے کہ ''ہر نبی صاحبِ کتاب تھا''، یہ صحیح ہے یا غلط؟

جواب: یہ بالکل غلط ہے، ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں تھا۔

اگر ہر نبی صاحبِ کتاب ہوتا تو موسیٰ وہارون علیہما الصلاۃ والسلام کو دو کتابیں ملتیں، حالانکہ دونوں کو ایک ہی کتاب ملی تھی اور وہ ''تورات'' تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ۔ (1)

''ہم نے ان دونوں کو (یعنی موسیٰ وہارون علیہما الصلاۃ والسلام کو) روشن کتاب دی''۔

اس کے علاوہ فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا۔ (2)

''ہم نے توریت اتاری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، اسی توریت سے متعدد انبیاء (جو اپنے رب کے مطیع تھے) یہودیوں کو حکم دیا کرتے تھے''۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ، متعدد انبیاء ایک ہی کتاب کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے اور احکام نافذ کرتے تھے، اب اگر ہر نبی صاحبِ کتاب ہوتا تو یہ متعدد انبیاء یہود کو اپنی اپنی کتاب کے ذریعہ سے حکم دیتے، حالانکہ یہ انبیاء توریت کے مطابق حکم دیتے تھے، جو اِن انبیاء پر قطعاً نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔

1- سورۃ الصّٰفّٰت: 117

2- سورۃ المائدہ: 44

آپ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ، اس بحث کا مقصد کیا ہے؟
اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ''تورات'' کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی ہوئی، انجیل کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی ہوئی، قرآن مجید کے علاوہ حضرت محمد ﷺ پر وحی ہوئی، دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً۔ (1)

''اور جب موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم سے کہا کہ، اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ، گائے ذبح کرو''۔

اس آیت سے لے کر فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا تک، پانچ قول، اللہ تعالیٰ کے ہیں۔
اگر یہ اقوالِ الٰہی ''توریت'' میں مذکور ہوتے، تو سوال و جواب کی نوبت نہ آتی، ''توریت'' میں قوم (یہود) دیکھ لیتی اور گھڑی گھڑی (بار بار) سوال و جواب نہ کرتی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ (2)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تم پر خوان نازل کروں گا، پھر اس کے بعد تم میں سے جس نے کفر کیا، اس کو ایسی سخت سزا دوں گا کہ، تمام عالَم میں سے کسی کو اتنی سخت سزا نہیں دی ہوگی''۔

اب اگر انجیل میں یہ اللہ کا قول ہوتا تو حواری یہ نہ کہتے کہ: کیا تیرا رب، آسمان سے ہم پر خوان اتار سکتا ہے؟ قرآن میں ہے:

هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ (3)

1- سورۃ البقرہ:67

2- سورۃ المائدہ:115

3- سورۃ المائدہ:112

اورحضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ نہ فرماتے کہ ''اللہ سے ڈرو'':

قَالَ اتَّقُوا اللّٰہَ ۔ (1)

بالکل اسی طرح ہمارے حضرت محمد ﷺ پر قرآن نازل ہوا اور اِس کے علاوہ وحی نازل ہوئی، حضرت محمد ﷺ جب تک مکّہ شریف میں تشریف رکھتے تھے، اُس وقت تک کعبہ کی طرف سجدہ کرتے رہے، حالانکہ اُس زمانے کے متعلق قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ ''کعبہ کی طرف سجدہ کرو''، علیٰ ہذا قرآن کی تنزیلی ترتیب کی تبدیلی اور تعدادِ ازدواج، بغیر وحی محال ہے، تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی جاچکی ہیں۔

سوال: جب یہ ثابت ہوگیا کہ ''ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں ہے'' تو پھر اس آیت کی کیا توجیہ ہے:

فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْکِتٰبَ (2)

''اللہ نے انبیاء کو خوشخبری دینے کے لیے اور ڈرانے کے لیے بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی''۔

جواب: پوری آیت یہ ہے کہ:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْکِتٰبَ (3)

''دنیا میں لوگوں کی ایک ہی جماعت تھی (یعنی دو گروہ نہ تھے) پھر اللہ نے انبیاء ڈرانے اور خوشخبری دینے کو بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی''۔

یہاں لفظ ''کتاب'' کا ہے، ''کتابوں'' کا نہیں ہے۔ ''اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی''، کے یہ معنی نہیں ہیں کہ، اِن میں سے ہر ایک کے ساتھ کتاب نازل کی، یعنی

1- سورۃ المائدہ:112

2- سورۃ البقرہ:213

3- سورۃ البقرہ:213

''مَعَهُمْ'' کے معنی ''مَعَ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ'' نہیں ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا[1]

''ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور ان کو خشکی وتری میں سواری دی اور ان کو پاکیزہ روزی دی اوران کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی''۔

''ان کو خشکی اور تری میں سواری دی'' کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ، ان میں سے ہر ایک کو سواری دی، اسی طرح پاکیزہ روزی، ان میں سے ہر ایک کو نہیں دی گئی، نیز ان میں سے ہر ایک کو اکثر مخلوق پر فضیلت نہیں دی گئی؛ کیونکہ ان میں سے کافر کے لیے فرمایا:

أُولَٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ[2] ''کافر بدترین خلائق ہیں''۔

کسی مخلوق سے افضل نہیں ہیں۔ بالکل اسی طرح ''ان کے ساتھ کتاب نازل کی'' کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کتاب نازل کی؛ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جتنے نبی ہوتے، اتنی ہی کتابیں ہوتیں اور اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ، موسیٰ اور ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام دونوں کو ایک ہی کتاب ملی تھی۔

بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ، اِن انبیاء میں سے کسی ایک جماعت یا فرد کے ساتھ کتاب نازل کی اور یہ طریقۂ تکلم ہر زبان میں ہوتا ہے، مثلاً: فوج کے ساتھ توپ خانہ بھیج دیا، برات کے ساتھ جہیز بھیج دیا، فلاں پارٹی کے ساتھ کھانا بھیج دیا، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ، ہر فوجی، ہر براتی، ہر فرد کے ساتھ توپ خانہ یا جہیز یا کھانا بھیج دیا۔

بالکل اسی طرح انبیاء کے ساتھ ''کتاب'' بھیجنے کے یہی معنی ہیں کہ، ان میں سے کسی ایک جماعت یا ایک فرد کے ساتھ کتاب بھیج دی اور اس معنی پر لفظ کتاب کا واحد لانا دلالت کر رہا ہے،

1- سورہ بنی اسرائیل:70

2- سورۃ البینہ:6

اگر کتاب کی جگہ ''کُتُب'' کا لفظ ہوتا تو ممکن تھا کہ، ہر ہر واحد کے ساتھ کتاب ہوتی۔

سوال: منکرِ حدیث نے (صفحہ 58 پر) لکھا ہے کہ غلام احمد قادیانی نے اس خیال کو پھیلایا تھا کہ، نبی بے کتاب کے بھی ہوتا ہے؟

جواب: مسلمانوں کا بالا جماع اور بالاتفاق یہ عقیدہ ہے کہ ''نبی صاحبِ کتاب بھی ہوتا ہے اور بے کتاب بھی''۔

اسی عام عقیدے کے پیشِ نظر قادیانی نے دعویٰ کیا، اگر یہ عام عقیدہ نہ ہوتا تو دعویٰ کرتے ہی لوگ اس کی فوراً تکذیب کرتے اور اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔

مطلب یہ ہے کہ قادیانی نے اس خیال کی تعمیم نہیں کی، بلکہ اس سے قبل تمام مسلمانوں میں یہی عقیدہ تھا، یعنی نبی بے کتاب کے بھی آیا کرتا تھا۔

سوال: صفحہ 58 پر کہا ہے ''جو وحی کتاب کے علاوہ تھی وہ وحی کتاب کی طرح کیوں نہیں محفوظ رکھی گئی؟''

جواب: محفوظ رکھنے کے دو طریقے ہیں۔

ایک ''لکھنا'' دوسرے مشق کرانا، چونکہ وحی غیر کتاب میں اعمال کی تفصیل تھی؛ اس لیے ان کو لکھوایا نہیں، بلکہ ان کی مشق کرادی؛ کیونکہ اعمال کا لکھنا اتنا مقصود نہیں ہے جتنا ان کا کرنا مقصود ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتا ہوا دیکھو''۔

اسے صرف لکھ کر دے جاتے تو نماز کی مشق نہیں ہو سکتی تھی، ہر شخص کو روزے نماز اور اکثر ضروری اعمال کی مشق ہوگئی؛ اس لیے وحیِ غیرِ کتاب عملاً محفوظ ہے اور اللہ کا وعدہ سچا ہے، جو اس نے کہا کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (1)

''ہم ہی نے نصیحت اور ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔

1- سورۃ الحجر:9

تو جس طرح سے قرآن تلاوتاً محفوظ ہے، اِسی طرح سے وحیِ غیرِ کتاب (یعنی حدیث) عملاً محفوظ ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ صبح کے فرضوں سے قبل دو سنتیں ہیں، مغرب کے بعد دو ہیں، ظہر سے پہلے پیچھے چھ سنتیں ہیں، عشاء کے بعد دو سنتیں اور تین وتر ہیں، مسواک سنت ہے، نکیرین کا سوال جواب حق ہے، وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ وحیِ غیرِ کتاب کے مضامین عملی طور پر اب تک محفوظ ہیں، قرآن کے حافظ تو ایک فی صدی بھی نہیں ملیں گے، لیکن حدیث کو عملاً محفوظ رکھنے والے حفّاظِ قرآن سے بہت زیادہ ہیں، اس کے علاوہ وحیِ غیرِ کتاب کو نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ، وحیِ غیرِ کتاب انبیاء سابقین میں نہیں لکھی جاتی تھی، اس کی دلیل یہ ہے:

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (1)

''نوح پر یہ وحی ہوئی کہ اب تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا، جو لانے تھے وہ لا چکے''۔

یہ وحیِ غیرِ کتاب ہے؛ کیونکہ ''کتاب'' اصلاحِ قوم کے لیے ہوتی ہے اور یہ وقت اصلاح کا نہیں مایوسی کا ہے (اب کوئی ایمان نہیں لاسکتا) ایسی صورت میں ایمان اور نیک عمل کے لیے کتاب بھیجنا بےسُود تھا؛ لہٰذا یہ وحیِ غیرِ کتاب ہے اور اس آیت کے بعد اور بھی وحی ہوئی اور آخر میں کہا کہ:

مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (2)

''اس سے پہلے نہ تو جانتا تھا، ان خبروں کو، نہ تیری قوم جانتی تھی''۔

اور نبی چونکہ سارے عالَم کی طرف بھیجا گیا ہے، اس وقت نبی اور سارا جہاں ان وحیوں سے بےخبر تھا اور اس سے قبل بھی سب لوگ بےخبر تھے، اگر یہ وحی لکھی ہوئی ہوتی تو، اس سے قبل کوئی نہ کوئی قوم باخبر ہوتی، اس سے پتہ چل گیا کہ متقدمین انبیاء کا دستور نہ تھا کہ،

1- سورہ ھود:36

2- سورہ ھود:49

وہ وحیِ غیر کتاب کو لکھواتے ۔

اس کے علاوہ ہم پوچھتے ہیں کہ، قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس وجہ سے لکھوایا؟ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا وحی ہوئی تھی کہ، قرآن کو لکھوادو یا انھوں نے اپنی رائے سے لکھوایا؟ بس یہی دو صورتیں ہیں کہ یا وحی سے لکھوایا یا اپنی رائے سے لکھوایا۔ قرآن میں کسی جگہ بھی یہ حکم نہیں ہے کہ'' قرآن کو لکھو''، جہاں ہے یہی ہے کہ'' پڑھو سنو'' کہیں یہ نہیں ہے کہ ''لکھو''۔ لہٰذا اگر وحی سے لکھوایا تو یہ وہی وحی ہے، جو غیرِ قرآن ہے، قرآن کے لکھوانے کی وحی ہوئی، قرآن کو لکھوادیا، حدیث کے لکھنے کی وحی نہیں ہوئی، حدیث کو نہیں لکھوایا اور اگر اپنی رائے اور مرضی سے قرآن کو لکھوایا تو بے شک اپنی رائے اور اپنی مرضی سے حدیث کو نہیں لکھوایا، دونوں جگہ رائے کارفرما ہے۔ (اس کی تفصیل پچھلے صفحات میں موجود ہے)

نیز ممکن ہے کہ قرآن کو اس وجہ سے لکھوایا ہو کہ اس کے الفاظ کے ساتھ معجزہ متعلق تھا اور چونکہ وہ دعویٰ دائم ہے؛ لہٰذا دلیل اور معجزہ بھی دائم ہونا چاہیے، حدیث کے الفاظ کے ساتھ معجزہ متعلق نہیں ہے اس وجہ سے اُس کو نہیں لکھوایا۔

سوال: صفحہ 58 پر منکرِ حدیث نے کہا کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کے یہ معنی نہیں ہیں کہ'' جو کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بولتے تھے وہ سب وحی ہوتا تھا'' بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کچھ بولنا وحی تھا اور کچھ بولنا وحی نہیں تھا، منکرِ حدیث نے اس آیت سے ثابت کیا ہے:

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ (1)

(ترجمہ:) ''ان سے کہہ دو کہ میں اگر غلطی کرتا ہوں تو یہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے (یا اس کا وبال میرے اوپر پڑتا ہے) اور اگر میں سیدھے راستے پر ہوتا ہوں تو یہ اس وحی کی بنا پر ہوتا ہے، جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے''۔

1- سورہ سبا:50

سوال یہ ہے کہ یہ کہنا کہ نبی کا کچھ نطق (گفتگو) وحی ہے اور کچھ وحی نہیں ہے اور اس پر اس آیت سے استدلال صحیح ہے یا نہیں؟

جواب: یہ استدلال بالکل غلط ہے اور یہ ترجمہ بھی غلط ہے، ترجمہ صحیح یہ ہے ''ان سے کہہ دو کہ، اگر میں غلطی کروں اور گمراہ رہوں تو اس غلطی کرنے اور گمراہ ہونے کی صورت میں اس غلطی اور گمراہی کا ضرر میری ہی جان پر پڑے گا''۔

غلطی کرنے اور گمراہ ہونے کی تقدیر (فرض) پر یہ کہلوایا جا رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعی غلطی تو نہیں کرتے تھے اور گمراہ نہیں ہوتے تھے، ''تقدیر'' کے معنی یہ ہیں کہ: ''فرض کرو میں گمراہ ہو جاؤں تو اس صورت میں میری گمراہی کا ضرر میری ہی جان پر پڑے گا''۔

یہاں ''اِنْ'' کا لفظ ہے جو تقدیر اور فرض کے لیے ہے، تحقیق نہیں ہے یعنی گمراہی مفروض اور فرضی اور تقدیری ہے، نہ کہ تحقیقی، جیسے: فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ [1] اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ''تو شک میں واقعی ہے''، بالکل اسی طرح ''اِنْ ضَلَلْتُ'' کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ''میں واقعتاً گمراہی میں ہوں'' بلکہ معنی یہ ہیں کہ ''بفرضِ محال، اگر میں گمراہی میں ہوں، تو اس تقدیر پر میری گمراہی کا وبال میری جان پر پڑے گا''۔ لہٰذا، اس آیت کا یہ مطلب لینا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کا کوئی حصہ گمراہی کا بھی تھا، کفرِ صریح ہے اور اس کی مثال سورہ مؤمن میں ہے:

وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ ۔

''اگر وہ (موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام) جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا''۔

وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ [2]

''اور اگر وہ سچا ہے تو جس عذاب کا اس نے وعدہ کیا ہے، وہ کچھ نہ کچھ تم کو پہنچ کر رہے گا''۔

1- سورہ یونس:94

2- سورۃ المؤمن:28

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام (معاذ اللہ) کچھ جھوٹا ہے اور کچھ سچا ہے۔

بالکل اسی طرح: قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِىٓ اِلَىَّ رَبِّىْ (1) ہے۔

جس طرح وہاں تقسیم صدق و کذب میں نہیں ہے، اسی طرح یہاں ہدایت و ضلالت میں تقسیم نہیں ہے، تو یہ ترجمہ کرنا کہ ''اگر میں غلطی کرتا ہوں تو یہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے''، یہ بالکل غلط ہے اور اس سے یہ معنی نکالنے کہ، نبی غلطی کرتا ہے تو اپنی طرف سے کرتا ہے اور سیدھے راستہ پر چلتا ہے تو وحی سے چلتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، کفر ہے، جہالت ہے۔

بلکہ مطلب یہ ہے ''جو کچھ میں کہتا ہوں، اگر یہ میری اپنی طرف سے ہے تو اس کا وبال مجھ پر ہے اور اگر یہ میری اپنی طرف سے نہیں ہے (اور قطعاً میری اپنی طرف سے نہیں ہے) تو پھر قطعاً یہ میرے رب کی وحی سے ہے''، یہ ہے مطلب اس آیت کا، نہ یہ کہ کچھ میری اپنی طرف سے ہے اور کچھ وحی سے ہے۔

اب ہم کہتے ہیں، بولو کیا کہتے ہو؟ تمہارے کہنے کے مطابق، نبی اپنی وجہ سے غلطی کرتا ہے۔ آیا تمہارے نزدیک نبی نے غلطی اپنی طرف سے اپنی وجہ سے کی یا نہیں کی؟

اگر کی تو قطعی (اِس آیت کی رُو سے) نبی پر اِس غلطی کا وبال ہے اور ایسا کہنا قطعی کفر ہے اور اگر نبی نے اپنی وجہ سے غلطی نہیں کی تو سارا کا سارا معاملہ، تمام اقوال و افعال نبی کے بالوحی ہیں اور یہی ہم کو ثابت کرنا ہے۔

اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (2)

1- سورہ سبا:50

2- سورۃ النجم:2

''تمھارا سردار نہ گمراہ ہے نہ کج راہ ہے''۔

اب اس آیت یعنی: اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اَضِلُّ کے کیا معنی ہوئے، جب کہ صاف طور پر قرآن نے کہہ دیا کہ: ''تمھارا سردار ضال (گمراہ) نہیں ہے''۔

پھر نبی اپنی وجہ سے یا اپنی طرف سے کون سی ضلالت کرتا ہے؟! لہٰذا، اگر نبی ضلالت کرے گا تو تمام نظامِ شریعت باطل ہوجائے گا اور مسلمان کے منہ سے (نعوذ باللہ) یہ کلمہ کیونکر نکل سکتا ہے کہ نبی ضلالت کرتا ہے؟!

نبی کے متعلق فرمایا:

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (1)

''سیدھے راستے پر ہے''۔

بس مطلب یہ ہے ''جو کچھ بھی میں کہتا ہوں اگر یہ میری اپنی طرف سے ہے تو قطعاً اُس کا وبال میری جان پر ہے''، یعنی وبال معلّق ہے میری اپنی طرف سے کہنے پر۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ ''اگر زید پتھر ہوگا تو وہ بے جان ہوگا اور زید کا پتھر ہونا محال ہے''، اس شرطِ محال پر جزاء مرتّب ہے، اسی طرح یہ بات ہے کہ، اگر میں غلطی کرتا ہوں یعنی میرا غلطی کرنا محال ہے؛ کیونکہ یہ محال وبال جان ہے اور میرے اوپر کوئی وبال نہیں ہے، لہٰذا میرا غلطی کرنا محال ہے۔

ایسی غلطی وہ لوگ کیا کرتے ہیں، جو ابتدائی قوانینِ علم سے بھی بے خبر ہوتے ہیں، لہٰذا آیتِ شریفہ کے یہ معنی ہوئے ''جو کچھ بھی میں کہتا ہوں، اگر یہ میری اپنی طرف سے ہے اور میں نے غلط طریقے پر، اِس کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے تو بیشک اس کا وبال میری جان پر ہے اور اگر جو کچھ میں کہتا ہوں میری اپنی طرف سے نہیں ہے تو یہ قطعاً اللہ کی وحی سے ہے''، غور کرو۔

سوال: (صفحہ 59) اسی مقام پر منکرِ حدیث نے کہا ہے کہ، اس حقیقت (یعنی نبی کی ہر گفتگو وحی نہیں ہے) کی تشریح میں قرآن میں کئی واقعات ایسے مذکور ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ

1- سورہ یس: 4

نے حضور سے کہا ہے کہ، آپ نے ایسا کیوں کہا؟ مثلاً: سورہ توبہ میں ہے:

عَفَا اللّٰہُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (1)

''اللہ تجھے معاف کرے تو نے انہیں کیوں اجازت دی؟''۔

اب سوال یہ ہے کہ، حضور کی جب ہر بات وحی سے تھی تو پھر یہ تادیب کیسی؟ یعنی پہلے خود ہی وحی کی اور پھر پوچھا ایسا کیوں کیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ کو ہر وقت حق ہے کہ جو چاہے کہے اور جو چاہے کرے، اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تثلیث کی تبلیغ نہیں کی اور پھر ان سے پوچھا کہ ''کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو بھی اللہ کے علاوہ معبود قرار دو؟''، اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ، انھوں نے یہ بات ہرگز نہیں کہی، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اُن سے پوچھا، اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا:

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (2)

''بے شک تو رسولوں میں سے ہے، سیدھے رستے پر ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى (3)

''تمہارا صاحب نہ گمراہ ہے، نہ کج راہ ہے''۔

ان دونوں آیتوں سے ظاہر ہوگیا کہ، نبی نے کوئی گناہ نہیں کیا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (4)

1- سورۃ التوبہ:43

2- سورہ یس:3،4

3- سورۃ النجم:2

4- سورۃ الفتح:2

''تاکہ تیرے اگلے پچھلے گناہ معاف کردے''۔

اللہ کو حق ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ ''اس نے تیرے گناہ معاف کردیے'' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود اوپر کی آیتوں میں نبی کی بے گناہی بیان کردی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ (1)

''سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے''۔

یعنی اس کے دل تک ایمان کو آنے نہیں دیتا اور پھر خود کہتا ہے:

فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ (2)

''کہاں چلے جاتے ہو''۔

كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ (3)

''کیوں کفر کررہے ہو''۔

خود ہی ان کے دل تک ایمان کو پہنچنے نہیں دیتا اور خود ہی کہتا ہے:

مَا ذَا عَلَیْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا (4)

''ان کا کیا جاتا، جو ایمان لے آتے''۔

خود کہتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ (5)

''اللہ جس کو چاہتا ہے، گمراہ کرتا ہے''۔

اور پھر کہا ہے:

1- سورۃ الانفال:24

2- سورۃ التکویر:26

3- سورۃ البقرہ:28

4- سورۃ النساء:39

5- سورۃ الرعد:27

اَنّٰی یُصۡرَفُوۡنَ[1] فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ[2]

''کہاں پھرے جاتے ہو۔ کہاں بہکے جاتے ہو''۔

خود کہتا ہے:

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِهِم[3]

''ان کے دلوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے''۔

اور پھر خود کہتا ہے:

فَمَا لَهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ[4]

''ان کو کیا ہوگیا، جو ایمان نہیں لاتے''۔

خود کہتا ہے:

وَ جَعَلۡنَا مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ سَدًّا وَّ مِنۡ خَلۡفِهِمۡ سَدًّا[5]

''ہم نے ان کے آگے اور پیچھے روک لگادی ہے''۔

اور پھر خود کہتا ہے:

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا[6]

''لوگوں کو ایمان لانے سے کس نے روکا''۔

خود کہا:

فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ[7]

1- سورۃ المؤمن:69

2- سورۃ الانعام:95

3- سورۃ البقرہ:7

4- سورۃ الانشقاق:20

5- سورہ یس:9

6- سورۃ الکہف:55

7- سورہ طہ:85

''ہم نے تیرے بعد میں تیری قوم کو (یعنی موسیٰ کی قوم کو) بچلا دیا (آزمائش میں مبتلا کیا)''۔

خود کہتا ہے:

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ (1)

''تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا''۔

خود کہا:

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ (2)

''بخدا، وہ مسلمان ہی نہیں شمار کیے جائیں گے، جب تک وہ تم کو حَکَم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنائیں گے''۔

یہاں نبی کو حَکَم بنا دیا، خود کہتا ہے:

لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (3)

''تو نے کیوں اجازت دے دی''۔

براہینِ قاہرہ عقلیہ سے ثابت ہوگیا کہ، بندہ کے ہر فعل کا خالق خدا ہی ہے اور نص سے بھی:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ (4)

''اللہ تمھارا اور تمہارے اعمال کا خالق ہے''۔

اس کے باوجود بندے کو برا کہہ رہا ہے کہ، تم نے یہ کیوں کیا؟

غرضیکہ بے شمار آیات موجود ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ، بندہ کے ہر عمل کا خالق

1- سورۃ البقرہ:51

2- سورۃ النساء:65

3- سورۃ التوبہ:43

4- سورۃ الصٰفٰت:96

خدا ہی ہے اور بے شمار آیات ایسی ہیں، جن میں بندہ سے کہتا ہے تو نے یہ کیوں کیا؟

اب اور دیکھیے، فرماتا ہے:

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ [1]

"اے جن وانس! ہم تم سے سُلٹنے (سیدھا کرنے) کے لیے تیار ہو گئے ہیں"۔

اس آیت میں انتہائی ڈانٹ ہے۔

آگے کہتا ہے:

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ [2]

"تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

پھر فرمایا:

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ [3]

"تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا اور کوئی تمھارا مددگار نہیں ہوگا"۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ [4]

"تم دونوں (جن وانس)، اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ [5]

"مجرمین جہنم اور گرم پانی کے درمیان پھرتے پھریں گے"۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نعمتیں نہیں ہیں بلکہ یہ عذاب ہیں، لیکن ان کو نعمتوں کی فہرست میں بیان کر رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ، جو چاہے

1- سورۃ الرحمن:31

2- سورۃ الرحمن

3- سورۃ الرحمن:35

4- سورۃ الرحمن

5- سورۃ الرحمن:44

سو کہے اور جو چاہے سو کرے، اس کے فعل سے سوال نہیں کیا جا سکتا:

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ (1)

اب ذرا غور کرو کہ، جن لوگوں کو اجازت دی تھی، اگر وہ اس اذنِ نبی و اجازتِ نبی پر عمل نہ کرتے تو یہ سب مجرم ہو جاتے، اب اگر عمل کر لیا تو نبی کی اطاعت ہو گئی اور نبی کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہے:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (2)

تو گویا نبی نے ان کو اجازت دے کر اللہ کی اطاعت کرائی، اب خود ہی اپنی اطاعت پر وہ کہہ رہا ہے کہ، تو نے کیوں میری اطاعت کرائی؟ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ، وہ جو چاہے سو کرے اور جو چاہے کہے، کُل کلاں (مکمّل) اس کو حق ہے۔

اہم نکتہ:

اب یہاں ایک نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ، جب گمراہی کرانے کی اور اضلال کی نسبت اللہ اور رسول کی طرف ہو تو اضلال کی نسبت اللہ کی طرف کرنے یا ماننے سے ایمان میں کوئی خرابی نہیں آئے گی، البتہ رسول کی طرف ایسی نسبت کرنی کفر ہوگی؛ کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے اضلال کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور نبی کی طرف کسی جگہ بھی اضلال کی نسبت نہیں کی، بلکہ ہدایت کی نسبت کی ہے:

اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (3)

''بے شک، تو سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے''۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (4)

1- سورۃ الانبیاء:23

2- سورۃ النساء:80

3- سورۃ الشوریٰ:52

4- سورہ یٰس:3،4

''بے شک تو رسولوں میں سے ہے، سیدھے رستے پر ہے''۔

خود سیدھے راستے پر ہے، اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ، جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے سیدھے رستے دکھاتا ہے تو اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف غلط نہیں ہے اور نبی کی طرف غلط ہے، کفر ہے۔

سوال: اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ [1] ''اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے''۔

اگر یہ وحی تھی تو پھر زید نے کیوں اس پر عمل نہیں کیا؟

جواب: یہ وحی تھی، لیکن صیغۂ امر جس طرح وجوب کے لیے آتا ہے، اِسی طرح اور بہت سے معنیٰ کے لیے آتا ہے، یہاں وجوب کے لیے نہیں ہے، اس کی ایسی مثال ہے، جیسے:

وَاِذَا حَلَلۡتُمۡ فَاصۡطَادُوۡا [2]

''جب تم احرام سے باہر ہو جاؤ تو شکار کرو''۔

یہ صیغۂ امر ہے، مگر وجوبِ شکار کے لیے نہیں ہے۔

وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ [3]

یہ صیغۂ امر ہے، وجوب کے لیے نہیں ہے، یعنی جو چاہے کفر کرے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ، کفر واجب ہے، بلکہ تہدید (ڈرانے کے لئے) ہے:

اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ [4]

''جو چاہو کرو''۔

یہ سب امر کے صیغے ہیں، مگر وجوب کے لیے نہیں ہیں۔ اسی طرح اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ کا صیغۂ امر وجوبی نہیں ہے، جو اس پر عمل نہ کرنے سے مخالفتِ رسول لازم آئے۔

1- سورۃ الاحزاب:37

2- سورۃ المائدہ:2

3- سورۃ الکہف:29

4- سورہ فصلت:40

سوال: منکرینِ حدیث نے اسی صفحہ 59 پر کہا ہے: مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (1) کے کیا معنی ہیں؟

جواب: اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارا صاحب اپنی خواہش سے نہیں بولتا، جو کچھ بولتا ہے یعنی اس کا بولنا صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن اپنی خواہش سے نہیں بولتا؛ کیونکہ ''اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ'' میں هُوَ کی ضمیر کا مرجع اوپر لفظاً مذکور نہیں ہے؛ کیونکہ اوپر صرف تین لفظ ہیں نجم، صاحب اور ھویٰ، اور یہ تینوں وحی نہیں ہیں؛ لہٰذا ''ھو'' کا مرجع معناً ینطق میں ''نطق'' ہے، لہٰذا آیت ''اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ'' کے معنی ہوئے کہ'' تمہارے صاحب کا نطق، صرف وحی ہی ہے''، یعنی نہیں ہے تمہارے صاحب کا نطق مگر وحی۔

یہاں نطقِ نبی کو وحی کہا ہے اور قرآن نطقِ نبی نہیں ہے اور جو کوئی قرآن کو نطقِ نبی کہے، وہ کافر ہے؛ کیونکہ قرآن تو نطقِ باری تعالیٰ ہے اور اس آیت میں وحی نطقِ نبی کے لیے ثابت ہے، لہٰذا نطقِ نبی وحی ہے، نبی کے تمام اقوال وحی ہیں، اس کے بعد میں کہتا ہوں، ذرا آگے چل کر فرمایا:

فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى (2)

''اس نے اپنے بندے کو وحی کی، جو وحی کرنی تھی''۔

آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ، جو وحی اپنے بندے کو کی تھی (یعنی مَاۤ اَوْحٰى) یہ قرآن کی کونسی آیت ہے؟ اب اگر وحی صرف قرآن ہی ہوگا تو بتاؤ کہ یہ مَا اَوْحٰى کی وحی قرآن میں کس جگہ ہے؟ کیونکہ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى یہ آیت حکایت ہے اس وحی سے جس کو مَا اَوْحٰى کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، بولو کیا کہتے ہو؟ یہ وحی قرآن میں ہے تو بتاؤ کہ کون سی آیت ہے؟ یا کون سی آیتیں ہیں؟ آج تک کوئی مفسّر کوئی عالم یہ نہیں بتا سکا اور نہ بتا سکتا

1- سورۃ النجم:3، 4

2- سورۃ النجم:10

ہے کہ، یہ وحی فلاں آیت یا آیتیں ہیں؛ کیونکہ قرآن معین ہے اور یہ وحی مبہم ہے، لہٰذا معلوم ہو گیا، یہ وحی قرآن سے باہر ہے اور یہی وحی، غیر قرآن ہے۔

ہم پوچھتے ہیں، نبی کا قول وحی ہے یا نہیں؟ اگر کہو کہ وحی ہے تو بے شک حق ہے، یہی ہماری مراد ہے، اگر کہو کہ نہیں ہے، تو بولو کیا کہتے ہو؟ جس وقت نبی نے کہا کہ، یہ کتاب یا یہ آیات یا یہ سورت مجھ پر نازل ہوئی ہے، آیا یہ قول نبی کا ماننے کے قابل ہے یا نہیں؟ اگر کہو ماننے کے قابل ہے تو ٹھیک ہے، بس یہی معنی نبی کے قول (نبی کی حدیث) کے حجت ہونے کے ہیں، لہٰذا حدیثِ نبی حجّت ہوگئی، اگر کہو کہ یہ قول ماننے کے قابل نہیں ہے تو حدیث کے ساتھ قرآن بھی گیا، نہ حدیث رہی نہ قرآن رہا، نہ دین، نہ اسلام، کافر ہونے کے ساتھ ساتھ مجنوں بھی ہو گئے، خدا کے قہر سے ڈرو، کیوں دین کو تباہ کر رہے ہو۔

سوال: منکرینِ حدیث نے صفحہ 60 پر کہا ہے:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (1)

"اور جب نبی نے چپکے سے اپنی کسی بیوی سے ایک حدیث (بات) بیان کی، پھر اس بیوی نے اس کو کسی اور سے کہہ دیا اور اللہ نے آپ کو اس سے آگاہ کر دیا، آپ نے کچھ بات اس بیوی سے کہی اور کچھ سے اعراض کیا، پھر جب نبی نے بیوی کو اس بات پر آگاہ کیا تو بیوی بولی: آپ کو اس کی کس نے خبر دی، آپ نے فرمایا: مجھے علیم و خبیر نے خبر دی"۔

اس آیت کے دونوں ٹکڑے "وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ" اور "نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ" اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ، قرآن شریف سے علاوہ بھی نبی ﷺ پر وحی ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ منکرِ حدیث نے کہا ہے کہ "اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ" (یعنی اللہ نے نبی پر

1- سورۃ التحریم:3

اس کو ظاہر کر دیا)، اور ''نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ'' (علیم وخبیر نے مجھے آگاہ کر دیا)۔

ان دونوں ٹکڑوں میں یعنی اللہ کے ظاہر کرنے اور علیم وخبیر کے آگاہ کرنے میں، اس بات پر دلالت نہیں ہے کہ، یہ اظہار اور آگاہی وحی کے ذریعہ ہو، بلکہ یہ اظہار اور آگاہی ایسی ہے کہ، جیسے اللہ نے تم کو کتوں کے سدھانے کی تعلیم دی ہے اور جس طرح تم کو کتوں کو سدھانے کی تعلیم دینا وحی نہیں ہے، اسی طرح نبی پر اس واقعہ کا اظہار اور انباء، وحی نہیں ہے اور جس طرح اللہ نے فرمایا:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (1)

''انسان کو وہ کچھ سکھایا، جو وہ نہیں جانتا تھا''۔

اور جس طرح یہ انسان کی تعلیم وحی نہیں ہے، اسی طرح نبی پر اللہ کا اس واقعہ کو ظاہر کرنا اور علیم وخبیر کا نبی کو آگاہ کرنا بھی وحی نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟

جواب: بالکل غلط ہے۔

انسان کو دو چیزیں دی گئی ہیں، ایک تو علم کی فعلیت اور ایک علم کی قابلیت۔

فعلیت کے یہ معنی ہیں کہ جس وقت انسان اپنے حواس کو محسوسات کی طرف متوجہ کرے تو فوراً اُس کو اِن محسوسات کا شعور، ادراک، احساس، علم ہو جائے، اس کو بدیہی علم کہتے ہیں۔

دوسری چیز قابلیت ہے، استعداد ہے، صلاحیت ہے، یہ چیز صرف حواس کی توجہ سے حاصل نہیں ہوتی، یعنی جس علم کی قابلیت دی ہے، وہ صرف حواس کی توجہ سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد، کوشش، اکتساب، غور وفکر کرنا پڑتا ہے، اس علم کو ''نظری علم'' کہتے ہیں۔

ہر انسان کی فطرت میں ''نظری علم'' کی قابلیت اور ''بدیہی علم'' کی فعلیت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اور انبیاء کو جو علوم دیے جاتے ہیں، وہ ان دونوں علموں سے ممتاز ہوتے ہیں،

1- سورۃ العلق:5

انہی کو ''وحی'' کہا جاتا ہے؛ اس لیے نبی (من حیث النبی) کا علم عام انسانوں جیسا نہیں ہوتا، نبی کا علم، خدا کا کلام، خدا کی خبر، خدا کا قول سننا ہوتا ہے اور خدا کا بشر سے کلام کرنا ہی ''وحی'' ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (1)

''اللہ تعالیٰ بشر سے جب کلام کرتا ہے تو صرف ان تین طریقوں سے، وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا اپنا ایک پیغمبر بھیجتا ہے، وہ اللہ کی اجازت سے، اللہ کی منشاء کے مطابق وحی کر دیتا ہے''۔

اور یہ تینوں طریقے وحی ہیں، پہلی وحی یعنی وَحْيًا ''ظاہر وحی ہے''، اور مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ ''جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پسِ پردہ کلام کیا تھا''، یہ بھی وحی ہے،

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (2)

''اے موسیٰ جو وحی ہو رہی ہے، اس کو سن''۔

تیسرے طریقہ میں بھی یوحیٰ کا لفظ موجود ہے۔

الغرض! نبی کا علم، اللہ کا کلام کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا، نبی سے کلام کرنا، یہ ''وحی'' ہے، لہٰذا نبی کا علم ''وحی'' ہے، لہٰذا جب بھی اللہ تعالی، نبی کو کوئی بات بتائے گا، وہ ''وحی'' ہوگی اور وہ ''وحی'' کے ذریعہ ہوگی، بدیہی اور نظری علوم کے ذریعہ نہیں ہوگی؛ کیونکہ ان دونوں کے ذریعہ تو عام انسانوں کو تعلیم کر دی ہے اور اگر نبی کو بھی ان ہی دونوں ذریعوں سے تعلیم کرتا تو عام انسانوں سے نبی فائق نہ ہوتا، نیز نبی اور غیر نبی کا فرق اس طرح بتایا:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (3)

1- سورۃ الشوریٰ:51

2- سورہ طہٰ:13

3- سورۃ الکہف:110

''میں تمہارے جیسا آدمی ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ، مجھ پر وحی ہوتی ہے''۔

تو وحی عام انسانوں کے علومِ بدیہیہ اور نظریہ سے ممتاز چیز ہوگئی، لہٰذا جب بھی اللہ، نبی کو خبر دے گا، وہ ''وحی'' ہوگی، جب بھی اللہ نبی پر کوئی شے ظاہر کرے گا وہ ''وحی'' ہوگی، جب بھی اللہ نبی کو آگاہ کرے گا وہ ''وحی'' ہوگی، ورنہ عام انسانوں سے نبی ممتاز نہیں ہوگا اور پھر نبوت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

اس کے علاوہ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا(1)

''یہ غیب کی خبریں ہیں، جن سے ہم نے وحی کے ذریعہ تجھے آگاہ کیا، اس سے پہلے نہ تو جانتا تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی''۔

اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ غیب کی خبریں، بغیر وحی کے نہیں معلوم ہوسکتیں اور یہ جو بیوی نے افشاء راز کیا اور نبی نے فوراً ہی بیوی کو آگاہ کیا، یہ نبی کا آگاہ کرنا غیب کی خبر ہے اور غیب کی خبر بغیر وحی کے نہیں ہوسکتی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جو ظاہر کیا نبی پر اور علیم وخبیر نے جو آگاہی نبی کو دی، یہ وحی تھی۔

دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ، نبی کا اپنی بیوی کو آگاہ کرنا غیب کی خبر ہے اور غیب کی خبر ''دینی وحی'' ہے، لہٰذا نبی کا اپنی بیوی کو آگاہ کرنا ''وحی'' ہے، دیکھو نبی نے اپنی بیوی سے ایک بات کہی، پھر جب اُس بیوی نے وہ بات دوسرے سے کہہ دی، یہ شرط ہے اور اس کی جزا ہے عَرَّفَ بَعْضَهٗ یعنی ''کچھ حصہ بات کا، نبی نے بیوی کو جتلایا''، اور اس شرط وجزا کے بیچ میں وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ آگیا ہے، یعنی ''اللہ نے نبی پر ظاہر کردیا''، یعنی اِدھر بیوی نے افشائے راز کیا، اُدھر نبی نے بِاظہارِ الٰہی بیوی کو جتلایا یعنی بیوی کے افشاء راز کرتے ہی نبی نے بیوی کو جتلایا، اب اللہ کہتا ہے: فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ ''جونہی نبی نے بیوی کو آگاہ کی''، بیوی کو سخت

1- سورہ ھود: 49

تعجب ہوا کہ، ابھی راز فاش کرتے کچھ دیر نہیں گزری، ان کو کیسے معلوم ہو گیا اور کہا کہ آپ کو کس نے بتایا؟ آپ نے فرمایا، علیم وخبیر نے۔

اس آیت کے اگلے پچھلے ٹکڑے کو ملاتے ہی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ، اِدھر افشاء راز ہوا، اور اُدھر بَاظہارِ الٰہی، نبی نے بیوی کو جتلایا، لہٰذا بیوی کے افشاء راز کی خبر، بیوی کو دینی، ''غیب'' کی خبر ہے اور غیب کی خبر، بغیر وحی، ناممکن ہے، لہٰذا اظہارِ الٰہی ''وحی'' ہے۔

سوال: کیا علیم وخبیر، غیرُ اللہ ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ منکرِ حدیث نے کہا ہے۔

جواب: ہرگز نہیں؛ اس لیے کہ واقعہ ایک ہی ہے، ایک ہی واقعہ کے لیے ''اَظْهَرَ'' آ گیا اور اسی واقعہ کے لیے ''نَبَّاَ'' آیا، تو آ گاہ کرنے والا اور ظاہر کرنے والا ایک ہوا، اور ظاہر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو آ گاہ کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہوا، اور آیت میں آ گاہ کرنے والا علیم وخبیر ہے، تو معلوم ہو گیا کہ علیم وخبیر اللہ ہی ہے۔

سوال: منکرینِ حدیث نے جو اپنے رسالہ طلوع اسلام بابت جون 1957ء صفحہ 62 کے شروع میں کہا ہے کہ، یاد رکھیے! حضراتِ انبیاء کرام کی طرف جو ''وحی'' آتی تھی اس کا تعلق انسانوں کی ہدایت سے ہوتا تھا، سوال یہ ہے کہ، کیا یہ بات صحیح ہے یا غلط؟

جواب: غلط ہے دیکھو، وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (1) نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف یہ وحی ہوئی کہ تیری قوم میں سے اب کوئی ایمان نہیں لائے گا، بجز ان کے جو ایمان لا چکے۔

اب دیکھو یہ وحی ہے اور کوئی تعلق اس وحی کو ہدایت سے نہیں ہے؛ کیونکہ اس وحی کے وقت تو ہدایت سے مایوسی ہو چکی، لہٰذا یہ کہنا کہ وحی (صرف) ہدایت کے لیے ہوتی ہے یہ غلط ہے، بلکہ وحی کبھی ہدایت سے مایوسی کے لیے بھی ہوتی ہے اور ذرا آگے بڑھو:

وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا (2)

1- سورہ ھود: 36

2- سورۃ المؤمنون: 27

''ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی سے، کشتی بنا''۔

یہ وحی لوگوں کی ہدایت کے لیے نہیں تھی، بلکہ کشتی بنانے کے لیے تھی اور اس وحی کو ''کتاب'' کہنا بھی جہالت ہے۔

سوال: منکرِ حدیث نے صفحہ 62 پر کہا ہے، چونکہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا قرآن میں کہیں حکم نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحیِ غیرِ قرآن سے بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا۔

اس کا تحقیقاتی جواب منکرِ حدیث نے دیا ہے کہ، بیت المقدس کو اس آیت کی رُو سے قبلہ بنایا گیا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ[1]

''ان حضراتِ انبیاء کو اللہ نے ہدایت کی ہے، اے نبی! ان کی ہدایت کی اقتداء کر''۔

اور چونکہ بیت المقدس، ان حضرات کا قبلہ رہا ہے؛ اس لیے آپ ﷺ نے بحکم اس آیت کے، اس کو قبلہ بنایا تھا۔

سوال یہ ہے کہ یہ جواب صحیح ہے یا غلط ہے؟

جواب: یہ جواب بالکل غلط ہے، کیونکہ یہ آیت اور سورۃ مکی ہے، اگر یہ آیت بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا سبب ہوتی، تو نبی ﷺ مکہ ہی میں نماز کے وقت بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے، لیکن جب تک حضور ﷺ مکہ میں رہے ''کعبہ'' ہی کو قبلہ بنایا، دیکھو:

اَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى[2]

''کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو بندہ کو (یعنی تجھ کو) نماز پڑھنے سے روکتا ہے''۔

1- سورۃ الانعام:90

2- سورۃ العلق:9،10

یعنی ابوجہل، حضور کو جب وہ "کعبہ" کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے، روکتا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ، مکہ میں آنحضرت ﷺ کعبہ کی طرف رُخ کیا کرتے تھے اور آیت أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ مکی ہے، اگر یہ آیت قبلہ بنانے کی موجب ہوتی تو مکہ ہی میں "بیت المقدس" قبلہ بن جاتا، لہٰذا ظاہر ہوگیا کہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کے لیے مدینہ جا کر کوئی اور وحی ہوئی، جس کی رُو سے بیت المقدس قبلہ بنایا گیا اور وہ وحی، قرآن میں قطعاً مذکور نہیں ہے۔

یہاں ایک اور بات سمجھو کہ، نبی ﷺ کافی مدّت مکّہ میں مقیم رہے اور شروع ہی سے کعبہ کو قبلہ بنایا، بتاؤ کہ کعبہ کو قبلہ شروع میں کس وحی سے بنایا تھا، قرآن سے یا وحیِ غیرِ قرآن سے؟ قرآن میں تو شروع میں قبلہ بنانے کا کوئی حکم ہے ہی نہیں، لہٰذا وحیِ غیرِ قرآن سے بنایا تھا۔

یادرکھو! شروع میں وحیِ غیرِ قرآن سے قبلہ بنا، پھر وحیِ غیرِ قرآن سے بیت المقدس بنا، پھر تیسری مرتبہ قرآن سے کعبہ قبلہ بنا، لہٰذا منکرِ حدیث کا جواب بالکل غلط اور غیر تحقیقی ہے۔

اس کے علاوہ اس بات کو غور سے سمجھ لو کہ آیت أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ میں جو نبی کریم ﷺ کو انبیاء کی ہدایت کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے، وہ شرائع میں نہیں ہے؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ تو تمام شرائع کے ناسخ ہیں، اقتداء ایمانیات اور اخلاقیات میں ہے۔

سوال: منکرینِ حدیث نے صفحہ 62 پر کہا ہے، سورۂ حشر میں ہے کہ، تم نے جو درخت کاٹ دیے، وہ باذنِ الٰہی کاٹے اور قرآن میں یہ اذن (اجازت) نہیں ہے، قرآن سے علیحدہ یہ اذن (اجازت) ہوا تھا اور یہی وحی، غیرِ قرآن ہے۔

اس کا جواب منکرینِ حدیث نے یہ دیا ہے کہ اذنِ خداوندی قرآن میں موجود ہے اور وہ یہ ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (1)

1- سورۃ الحج: 39

"جن لوگوں پر ظلم کیا گیا ہے، انھیں جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے"۔

سوال یہ ہے کہ، یہ جواب صحیح ہے یا غلط ہے؟

جواب: یہ جواب بالکل غلط ہے؛ کیونکہ آیت سے صرف لڑائی کی اجازت ثابت ہوتی ہے، کھیتی اور ہرے بھرے باغوں کے کاٹنے کی اجازت ثابت نہیں ہوتی اور اگر درختوں کے کاٹنے کی بھی اجازت، اِس آیت سے ثابت ہوتی تو تمام درخت کاٹ دیئے جاتے، حالانکہ ایسا نہیں ہوا کچھ کاٹے گئے، کچھ چھوڑے گئے، نیز کھیتی کے برباد کرنے کی اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے:

وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ (1)

"کھیتی کو وہ ہلاک کرتا ہے"۔

یہ کھیتی کے برباد کرنے کی مذمت ہے، اب اگر درخت برباد کیے جائیں گے تو جدید وحی سے ہی کیے جائیں گے، لڑائی کی اجازت، درختوں کے کاٹنے کی اجازت ہرگز نہیں بن سکتی۔

سوال: منکرینِ حدیث نے بالآخر اسی رسالہ میں اس بات کو تسلیم کر لیا (طلوع اسلام بابت جون 1957ء ص 61) کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن کے علاوہ ایسی "وحی" ہوتی تھی جس کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے ہوتا تھا، ہدایت سے نہیں ہوتا تھا اور یہ وحی ایسی ہوتی تھی، جیسے نحل (شہد کی مکھی) کی طرف ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی، قرآن کے علاوہ جو ہوتی تھی، وہ مثلِ شہد کی مکھی کے ہوتی تھی۔

جواب: یہ بات غلط ہے کہ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مثلِ شہد کی مکھی کے وحی ہوتی تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ

1- سورۃ البقرہ:205

رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ(1)

اللہ بشر سے صرف ان تین ہی طریقوں سے کلام کرتا ہے۔

(1) وحی سے ''وحی سے'' کے یہ معنی ہیں کہ نبی کے دل میں معنی ڈال دیتا ہے اور نبی اپنے الفاظ میں ان معنیٰ کو ادا کر دیتا ہے۔

(2) وحی پسِ پردہ سے، یہ اس طرح ہوتی ہے کہ الفاظ نبی کو سنائی دیتے ہیں اور اللہ دکھائی نہیں دیتا۔

(3) يُرْسِلَ رَسُوْلًا سے مراد یہ ہے کہ اللہ کا فرشتہ اللہ کا پیغام لے کر آتا ہے اور وہ نبی کے سامنے پڑھتا ہے۔

اس کے پڑھنے کے بعد پھر نبی پر وحی ہوتی ہے جو اِلَّا وَحْيًا میں وحی ہے، اس وحی کے ذریعہ اس فرشتہ کی وحی کی تفسیر اور تشریح کی جاتی ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے:

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ(2)

''جب ہم اس کی قرأت کریں تو اس کی اتباع کر (یعنی سنتا رہ)''۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ(3)

''پھر ہمارے ذمہ ہے اس کا بیان کرنا اور واضح کرنا''۔

یہ بیانِ قرآن من جانبِ اللہ ہے اور یہ بیانِ قرآن، قرآن نہیں ہے؛ کیونکہ اگر یہ بیانِ قرآن، قرآن ہوگا تو پھر اس قرآن کے لیے بیان ہوگا اور اسی طرح سلسلہ لامتناہی جائے گا اور تسلسل محال ہے، لہٰذا یہ بیان، غیرِ قرآن ہے، جس کو اللہ فرماتا ہے کہ ہمارے ذمہ ہے، یعنی ہم بعد میں وحیِ غیرِ قرآن سے قرآن کو بیان کر دیں گے اور سمجھا دیں گے،

1- سورۃ الشوریٰ:51

2- سورۃ القیامہ:18

3- سورۃ القیامہ:19

گذشتہ صفحات میں اس کی تفصیل لکھی جا چکی ہے۔

لہٰذا انبیاء کو صرف انہی تین طریقوں سے وحی ہوتی ہے، شہد کی مکھی کی طرح نہیں ہوتی؛ کیونکہ شہد کی مکھی کی فطرت ایسی کر دی ہے، جس طرح وہ تمام امور کو انجام دیتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس کو باشعور طور پر ''وحی'' ہوتی ہو اور وہ اپنے شعور سے ان چیزوں کو انجام دے؛ کیونکہ وہ ایسی ایسی عجیب وغریب اور محکم اشکال ہندسیہ بناتی ہے کہ بڑے سے بڑا مہندس، ریاضی دان حیران رہ جاتا ہے، اگر اس کا یہ فعل بالشعور ہوگا تو وہ انسان سے افضل ہو جائے گی، لہٰذا اس کی وحی بالشعور نہیں ہے اور نبی اکرم ﷺ کی ''وحی بالشعور'' ہے، لہٰذا حضور ﷺ کو کوئی وحی شہد کی مکھی جیسی نہیں ہوئی، اب تم اس مثال سے سمجھ لو:

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗءِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ(1)

''کہہ دے، مجھ سے کیسے ہوسکتا ہے کہ، میں اپنی طرف سے اس میں تبدیلی کر دوں، میں تو صرف وحی کا تابع ہوں جو میری طرف ہوتی ہے''۔

اب نبی اکرم ﷺ نے جو سورتیں مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور پہلے نازل ہوئی تھیں، ان کو قرآن میں پیچھے اور آخر میں اور بعد میں لکھوایا اور جو مدینہ میں بعد میں نازل ہوئی تھیں، جیسے: سورۂ بقرۃ وغیرہ، ان کو اوّل میں لکھوایا اور نبی اکرم ﷺ اپنی طرف سے تبدیلی نہیں کر سکتے، وہ تو صرف ''وحی'' کے تابع ہیں اور وحیِ قرآن میں کہیں تبدیل کرنے کا حکم نہیں ہے، اس سے صاف واضح ہوگیا، یہ وحی کہ، جس وحی کے ذریعہ ان سورتوں کی تقدیم تاخیر ہوئی ہے، یہ قطعاً قرآن سے علیحدہ ہوئی اور چونکہ یہ قرآن جو ہمیں پہنچا ہے، اس میں قطعاً تقدیم وتاخیر ہے اور یہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے، اس سے پتہ چل گیا کہ، وحیِ غیرِ قرآنی بھی ہدایت کے لیے ہے، ہم گذشتہ صفحات میں اس کی کافی

1- سورہ یونس:15

تشریح کر چکے ہیں۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ یہ جو دو فرض صبح کو مسلمان پڑھتے ہیں اور چار ظہر کے وقت اور چار عصر کے وقت اور تین مغرب کے وقت اور چار عشاء کے وقت، یہ تعداد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی ہے یا انہوں نے مقرر نہیں کی؟

اگر کوئی کہے کہ انہوں نے مقرر نہیں کی تو وہ کافر ہی نہیں، مجنون بھی ہے اور اگر کہے کہ نبی نے مقرر کی ہے تو بولو نبی نے اپنی رائے سے مقرر کی ہے یا وحی سے مقرر کی ہے؟ اگر کہو اپنی رائے سے تعداد مقرر کی ہے تو ساری دنیا کا مسلمان ہر زمانہ کا مسلمان یہ جانتا ہے کہ نبی نے قوم سے یہ کہا کہ، نماز اللہ نے فرض کی ہے تو اس صورت میں نبی: (اس آیت)

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (1)

کی وعید میں آجائے گا، تو سارے عالَم کے مسلمان متفق ہیں کہ نبی نے اللہ کی طرف کوئی بات ایسی منسوب نہیں کی، جو اللہ نے اس سے نہ کہی ہو اور اگر وحی سے یہ تعداد مقرر کی ہے تو یہی وہ وحی ہے، جس کو ہم نے ثابت کیا، یہی وحیِ غیر قرآن احادیث ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ نبی بغیر وحی کے نمازوں کی تعداد مقرر نہیں کر سکتا تھا اور یہ تعداد قرآن میں مذکور نہیں ہے، تو لَابُدّ (ضروری ہے کہ) قرآن کے علاوہ وحی ہوئی اور اس وحی سے یہ تعداد مقرر ہوئی۔

سوال: منکرِ حدیث نے ص 63 پر کہا ہے کہ کتاب اور حکمت ایک ہی چیز ہے، کیا یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟

جواب: یہ بات غلط ہے، کتاب اور حکمت ایک چیز نہیں ہے؛ اس لیے کہ کتاب یقینی اور قطعی طور پر صرف نبی ہی کو ملی، یعنی جس انسان کو اللہ نے کتاب دی وہ یقیناً نبی ہے اور جس انسان کو حکمت دی ضروری نہیں ہے کہ وہ قطعاً نبی ہو؛ کیونکہ تمام مسلمانوں کا اجماع

1- سورۃ الحاقۃ: 44-46

ہے کہ لقمان کی نبوت مقطوع نہیں ہے (یعنی لقمان کی نبوت قطعی اور یقینی نہیں ہے) حکمت لقمان مقطوع ہے اور قطعی ہے: (جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:)

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ(1)

''ہم نے لقمان کو حکمت دی''۔

اس دلیل کا حاصل یہ ہے کہ، اگر کتاب اور حکمت ایک ہی چیز ہوگی، تو جس کو حکمت ملی قطعاً اس کو کتاب ملی اور جس کو کتاب ملی، قطعاً وہ نبی اور رسول ہے اور لقمان کو حکمت ملی تو گویا کتاب ملی اور جس کو کتاب ملی، وہ قطعاً نبی ہے تو لقمان قطعاً نبی ہونے چاہیے، حالانکہ قوم کا اجماع ہے کہ، وہ نبی مقطوع نہیں ہے۔

اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ کتاب ہدایت ہے، نور ہے اور خیرِ محض یعنی خیر ہی خیر ہے، لہٰذا کتاب اللہ خیر ہی خیر ہے، خیرِ محض ہے اور حکمت خیرِ محض نہیں ہے، بلکہ خیرِ کثیر ہے:

وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا(2)

''جس کو حکمت ملی، اس کو خیرِ کثیر ملا''۔

تو معلوم ہو گیا کہ حکمت خیرِ کثیر ہے اور کتاب خیرِ محض اور کُل کا کُل (مکمل) خیر ہے اور خیرِ محض، خیرِ کثیر کا غیر ہے، لہٰذا کتاب وحکمت میں عینیت نہیں ہے۔

سوال: منکرِ حدیث نے ص64 پر کہا ہے کہ:

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ(3)

''یہ جو کچھ اوپر قرآن بیان کیا گیا ہے، یہ حکمت ہے''۔

اس آیت سے کتاب اور حکمت کی عینیت ثابت کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس آیت سے عینیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

1- سورہ لقمن: 12

2- سورۃ البقرہ: 269

3- سورہ بنی اسرائیل: 39

جواب: نہیں؛ کیونکہ مِمَّآ اَوْحٰی میں جو "مِن" ہے وہ تبعیض کا ہے اور مِنَ الْحِكْمَةِ میں مِمَّآ اَوْحٰی کا بیان ہے، اس کے یہ معنی ہوئے کہ:

"یہ حکمت میں سے ہے اور حکمت کا بعض ہے"۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ حکمت قرآن کے باہر بھی، وحیِ غیرِ قرآن میں ہے؛ کیونکہ ذٰلِكَ مِنَ الْحِكْمَةِ اور چیز ہے اور ذٰلِكَ الْحِكْمَةِ اور چیز ہے اور نیز اس آیت میں بھی اشارہ وحیِ غیرِ قرآنی کی طرف موجود ہے، یعنی جو وحیِ غیرِ قرآنی تیری طرف، تیرے رب نے کی ہے، اس کا یہ (یعنی وحیِ قرآنی) بعض ہے؛ کیونکہ "ذٰلک" کا اشارہ اوپر، وحیِ قرآنی کی طرف ہے۔

سوال: منکرِ حدیث نے ص 64 پر کہا ہے، کتاب اور حکمت کے ایک ہونے پر، اس آیت سے استدلال کیا ہے:

وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (1)

اگر کتاب اور حکمت دو چیزیں ہوتیں تو بجائے بِہٖ کے بِہما ہوتا، چونکہ واحد کی ضمیر لائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ، کتاب اور حکمت ایک چیز ہے، سوال یہ ہے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا غلط ہے؟

جواب: غلط ہے، بِہٖ کی ضمیر کل واحد منہما کی طرف پھر رہی (راجع) ہے، جس طرح وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (2) میں واحد کی ضمیر کل واحد منہما کی طرف لوٹ رہی ہے۔ (یعنی اللہ اور رسول میں سے ہر ایک کو خوش رکھیں)۔

اب اگر واحد کی ضمیر سے دونوں کے ایک ہونے پر استدل کیا جائے گا تو اللہ اور رسول ایک ہو جائیں گے، لہٰذا يَعِظُكُمْ بِهٖ کے معنی يَعِظُكُمْ بِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ کے ہیں اور بالکل اس کی ایسی ہی مثال ہے، اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ (3)

1- سورۃ البقرہ:231

2- سورۃ التوبہ:62

3- سورۃ الانفال:24

یہاں بھی واحد کی ضمیر ہے اور مراد یہ ہے کہ، اللہ اور رسول میں سے ہر ایک بلائے؛ کیونکہ اللہ بھی داعی ہے۔

وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ [1]

تمت

❖❖❖❖❖

1- سورہ یونس:25

انوارِ حدیث

تعارفِ مصنف
سید محمد ہاشم فاضل شمسی رحمۃ اللہ علیہ

خاندانی پسِ منظر:

سید محمد ہاشم فاضل شمسی کے جدِ اعلیٰ خواجہ سید عبد اللہ چشتی بکھری ہیں، جن کا سلسلۂ نسب سات واسطوں سے حضرتِ خواجہ سید قطب الدین مودود چشتی علیہ الرحمۃ سے ملتا ہے۔

فاضل شمسی کے جدِّ امجد، خواجہ سید محمد واجد حسین نے آپ کا نام ''سید منظور نبی'' عرف ''محمد ہاشم'' رکھا، آپ کا سلسلۂ نسب اکتیس (31) واسطوں سے سیدنا امام حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک پہنچتا ہے۔

پیدائش:

آپ 9 رمضان المبارک 1332ھ بمطابق 2 اگست 1914ء بروز اتوار محلہ چاند پورہ موضع کاندھا (صوبۂ بہار) ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

تعلیم وتربیت:

ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی، پھر 1922ء میں آٹھ سال کی عمر میں، الحاج سید نور الہدیٰ بانی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ (ہندوستان) کے کہنے پر مدرسے میں داخلہ لیا۔

مدرسے کا نصابِ تعلیم پندرہ سال پر محیط تھا، جسے فاضل شمسی نے گیارہ سال میں 1932ء میں مکمل کرلیا، نیز اسی دوران پٹنہ یونیورسٹی سے ''بی۔اے'' کا امتحان بھی پاس کیا۔

مادرِ علمی کی نسبت سے ''فاضل شمسی'' کہلائے، آپ دورانِ تعلیم مدرسے میں ممتاز طلبہ میں شمار کیے جاتے تھے۔

اساتذہ:

مولانا سیدعبد اللہ قادری، مولانا محمد سہول بھاگلپوری، مولانا دیانت حسین اور ملک العلماء مولانا سیدظفرالدین بہاری (صاحب صحیح البہاری) وغیرہم۔

درس وتدریس:

تحصیلِ علم کے بعد ابتداء مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد، صوبہ بہار، میں ادب اور حدیث کے استاد مقرر ہوئے۔ 1936ء میں مادرِ علمی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں تفسیر و حدیث کی تدریس پر فائز ہوئے۔

تقسیمِ ہند کے بعد، کلکتہ سے ہجرت کر کے (اہل وعیال کے ساتھ) کراچی آئے، یہاں مختصر قیام کرنے کے بعد حیدرآباد منتقل ہوئے۔ 1970ء میں مولانا مفتی محمد خلیل خان برکاتی، آپ کو دارالعلوم احسن البرکات حیدرآباد میں بحیثیت شیخ الحدیث لے گئے، جہاں آپ نے چار سال تک درسِ حدیث دیا، فاضل شمسی کم وبیش پچیس سال (25) حیدرآباد کی نئی عیدگاہ کے خطیب وامام رہے۔

1974ء میں الجامعہ العلیمیہ الاسلامیہ، ناظم آباد، کراچی، تشریف لائے اور تاحیات 1988ء تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔

محترم سیدمنیراحمد (حیدرآباد، سندھ) کا کہنا ہے:

> ''فاضل شمسی کو لطیف آباد (حیدر آباد) میں عیدِ میلاد النبی ﷺ کی تقریبات کے انتظامات کے سلسلے میں بڑی فکر رہتی تھی، ایک مرتبہ مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے، آپ نے اپنے احباب کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ اگر وسائل میسّر نہ آئیں تو پریشان نہ ہوں، میرا بنگلہ فروخت کر کے عیدمیلادالنبی ﷺ کی تقریبات ضرور منعقد کرنے کا اہتمام کرلیں۔''

بفضلہٖ تعالیٰ مالی وسائل کا بندوبست ہوگیا اور عیدِ میلادالنبی ﷺ کی تقریبات میں کسی قسم کا تعطل نہیں ہوا۔

اولاد:

آپ کی دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے تھے۔

صاحبزادوں کے نام یہ ہیں: سید محمد عبد الرحمن شمسی، سید محمد عبد الرب شمسی اور سید محمد منور احمد شمسی۔

تصنیف وتالیف:

آپ نے پاکستان آنے کے بعد باقاعدہ تصنیف وتالیف کے کام کا آغاز کیا، یہ سلسلہ تادمِ آخر جاری رہا، اس دوران آپ نے مختلف موضوعات پر کتب، رسائل اور مضامین قلم بند کیے۔

1۔ انوارِ حدیث (جو آپ کے ہاتھوں میں ہے)
2۔ ایصالِ ثواب (عقلی اور نقلی دلائل کا مجموعہ)
3۔ تنشیط الاذہان یعنی تنقیدِ حفظ الایمان (تاریخی نام: اکتسابِ فیض 1374)
4۔ صلوۃ وسلام (درود وسلام کی برکات وفوائد)
5۔ عالمگیر نبوت (عقیدۂ ختمِ نبوت پر قرآنی آیات، احادیث، عقلی دلائل اور منکرین کے شبہات کا مدلّل رد)
6۔ فلسفۂ نماز (نماز کی اہمیت، فضائل، برکات وفوائد)
7۔ وثیقۂ خلافت (سیدنا ابوبکر صدیق کے خلیفۂ بلافصل ہونے پر لاجواب تحریر)
8۔ تفسیرِ ہاشمی، 1976ء کے ایک اشتہار میں یوں لکھا ہوا ہے کہ:

''قرآن پاک کی اب تک جو تفاسیر متقدمین ومتاخرین نے لکھی ہیں، ان کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے، علامہ سید ہاشم فاضل شمسی نے موجودہ دور کے مسائل کے مطابق جدید انداز میں تفسیرِ قرآن کا آغاز کر دیا ہے، جس میں عقلی دلائل سے بھی بحث کی گئی ہے، ابتدائی پانچ پاروں کی تفسیر لکھی جا چکی ہے، پہلا پارہ عنقریب منظرِ عام پر آرہا ہے۔ ناشر ادارہ، تفہیمِ دین، حیدرآباد۔''

9۔ اسلام، عقل اور تجربہ کی روشنی میں۔

10۔ اسلام میں نظامِ اطاعت۔

11۔ توحید یا تثلیث۔(نصاریٰ کے نظریۂ تثلیث کا رد)

12۔ جہاد وقتال، غلام اور کنیزیں۔

13۔ کیا نبی کے لیے معجزہ ضروری ہے؟ (ایک تحقیقی بحث)

14۔ دہریت اور اس کی آئیڈیالوجی۔

15۔ تصورِ شیخ۔

16۔ جذب، سکر، استغراق۔

17۔ آزاد جنسی اختلاط۔

وصال:

آپ کا وصال یکم محرم الحرام 1409ھ بمطابق 15 اگست 1988ء بروز پیر کراچی میں ہوا۔ مفتی قاری محبوب رضا خان رضوی (سابق رئیس دارالافتاء دارالعلوم امجدیہ کراچی) نے المرکز الاسلامی، ناظم آباد میں نمازِ جنازہ پڑھائی، پھر وہاں سے آپ کو حیدرآباد لایا گیا، جہاں لطیف آباد نمبر 9 کے قبرستان میں تدفین کی گئی۔

❖❖❖❖❖

افتتاحِ کتاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تمہید

عہدِ حاضر تمدنی ارتقاء کا زمانہ ہے، انسانی اذہان اور عملی صلاحیتیں کھل کر میدان میں آگئے ہیں۔ فطرت کے اسرارِ نہفتہ پر خاکی نژادوں کا دسترس روز بروز اس تیزی سے بڑھتا جارہا ہے کہ کم علموں اور کوتاہ بینوں کی نگاہیں خیرہ ہورہی ہیں)[۔مشکل الفاظ کے معانی: (1) نہفتہ (پوشیدہ)، (2) خاکی (گردآلود)، (3) نژادوں (خاندان)، (4) کوتاہ بینوں (کم نظر)، (5) خیرہ (حیران)۔](۔ان حالات میں قطعاً خلافِ توقع نہیں ہے، اگر ایک بڑا گروہ انسان کی خدائی سے مسحور ومتاثر ہوکر حقیقی خدا کو بھول جائے اور دنیاوی عیش وتنعّم کی رنگینیوں میں مست ہوکر جنّاتِ عدن کے تصور سے منہ موڑ لے۔ انسان کا آغاز ایک قطرۂ آب اور انجام موت کا پنجۂ آہنی نہ ہوتا، تو عوام ہی نہیں خواص بھی اپنی اُلوہیت کا ڈنکا بجانے میں ایک دوسرے کے حریف نظر آتے، مگر آسمان وزمین کی کامیاب پیمائش کے بعد بھی ہر انسان اپنے وجود وبقا اور قیام وفنا کے معاملہ میں اسی طرح بے بس ونا چار ہے، جس کا رُخ آج سے ہزاروں سال پیشتر کسی پہلے انسان کو سامنا کرنا پڑا تھا، بلکہ اگر طبعی زندگی کا موازنہ نہ کیا جائے، تو آج کا انسان اپنے اسلاف کے مقابلے میں قلیل الامداد اور کوتاہ ہوتا جارہا ہے۔ ہماری ساری ترقیاں صفحۂ ہستی پر نئے پھول تراش رہی ہیں، مگر اپنی ذات جوں کی توں عاجز ومجبور ہے۔ اندرونی حقیقت تو کیا بدلتی! ظاہری رنگت میں بھی کوئی فرق نہیں آیا، کالی، گوری، لال، پیلی چمڑیاں بدستور قائم ہیں۔

اسلام سے اعراض:

اب سوال یہ ہے کہ انسان جب اپنی ذات کے لحاظ سے اس قدر ناتواں و مجبور ہے، تو پھر خدائے توانا وقادر کی طرف سے اس کی نگاہیں کیوں پھر گئیں اور دین کے سرچشمے کی سیرابی کے لیے اس کی روح کیوں آگے نہیں بڑھتی، وہ مذاہب جو عقل و خرِد کے مخالف تھے، اگر انسانوں نے ان کا جُوا[1] گردن سے اُتار پھینکا تو مقامِ تعجب نہیں ہے، مگر امتِ مسلمہ کیوں پیچھے کی طرف تیزی سے ہٹ رہی ہے! حالانکہ قرآن وسنت نہ تو انسانی افکار کو معطل کرتے ہیں اور نہ قوائے عملی کو، بلکہ بنی نوعِ انسان کی ان دونوں اعلیٰ صلاحیتوں کو اُبھار کر صحیح راستہ پر لگاتے ہیں۔

گمراہی کا سبب:

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی صف میں آج کچھ لوگ ایسے نظر آرہے ہیں، جن کی زبان مذہب کے خلاف بے لگام ہے۔ یہ اسلام کے زیرِ سایہ پروان نہیں چڑھے، بلکہ انہوں نے ماحولِ غیر میں تربیت پائی اور اسلام کو غیر مسلموں کی نگاہ سے دیکھا اور جو کچھ دیکھا، اپنی زبان سے دُہرارہے ہیں، ان کے افکار کا منبع قرآن وسنت نہیں ہے، بلکہ یورپ کے مستشرقین ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ جو شخص اپنی پاک دامنی کھو بیٹھے، وہ طعنِ خلق سے بچنے کے لیے دوسروں کو بھی اپنا ہم رنگ بنانا چاہتا ہے۔ شیطان بارگاہِ الٰہی سے مردود و رجیم ہو کر نکلا تو اب اس کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ ساری اولادِ آدم کو رجیم و مردود بنا دے۔

دنیا کے دوسرے تمام اہلِ مذاہب اپنے ادیان کی بے بضاعتی (مفلسی) سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ الہامی کتابوں کے تغیّر و تحریف کے قائل ہیں۔ ایک لے دے کر صرف اسلامی تعلیمات ہیں، جن میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا، قرآن مجید آغازِ نزولِ وحی سے لے کر آج تک علیٰ حالہ غیر محرّف اور اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ ضعیف و موضوع روایتوں کے

1- ہَل چلانے والی بیلوں کے گلے میں ڈالا جانے والا حصہ۔

امتزاج کے بعد بھی صحیح روایتوں کا نقد وانتخاب آسان ہے، انتہا یہ ہے کہ ائمہ کبار وسلف صالحین کے اقوال وفتاویٰ بھی ہماری دسترس سے باہر نہیں ہوئے، ایشیائی اقوام تو خیر مغلوب ومغضوب ہیں، ابھی ان کو اپنی قیامِ بقا ہی کی فکر سے نجات نہیں ملی ہے، مگر یورپ کے سامراجی (حکمران) اپنے دنیاوی اقتدار کو سامنے رکھتے ہوئے جب اپنی مذہبی کتابوں کی طرف نظر اٹھاتے ہیں، تو انہیں بڑی مایوسی ہوتی ہے اور حاسدانہ جذبات سے متأثر ہوکر اس کے درپے ہوجاتے ہیں کہ دنیا کی محفوظ الہامی کتاب اور یکتا پیغمبر کی زندگی کے مکمل نقوش کسی طرح متغیر ہوجائیں، تاکہ اس حمامِ عالم میں کوئی جامہ پوش نظر نہ آئے اور اس طرح دنیاوی سربلندی کے ساتھ دینی امور میں بھی علمبرداری کا مقام حاصل ہو۔ توریت اگرچہ عبرانی زبان میں موجود ہے، مگر عبرانی خود بول چال کی زندہ زبان نہیں۔

نیز اہلِ توریت کے اقرار کے مطابق موجودہ توریت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتاب سے ماخوذ ہے، اصلی توریت نہیں ہے کیونکہ اس میں موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات اور اس کے بعد کے حالات درج ہیں۔ عرصۂ دراز تک توریت گم رہی، یہاں تک کہ سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہزاروں سال بعد حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو ربّیوں (یہودی عالموں) اور کاہنوں کی مدد سے دوبارہ مرتب کیا۔

انجیل مقدس تو روزِ اوّل ہی حواریوں کے تَشَتّت (انتشار) و پراگندگی کا شکار ہوگئی، یہاں تک کہ آج دنیا میں اصل انجیل مفقود ہے اور ہر علاقائی زبان میں صرف تراجم پر دینِ مسیحی کا بے بنیاد محل کھڑا کیا ہے، صرف اس پر بس نہیں، بلکہ یہود ونصاریٰ کے مختلف فرقے توریت وانجیل کے مختلف نسخوں کو "كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ"[1] (ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اُس پر نازاں وخوش ہے) کے مصداق اپنی مُحرّف کتابوں پر خوش ہیں۔

حیرانی ہے کہ تمام انسانوں کو اس پر خوش ہونا چاہیے تھا کہ بہرحال ان کی نوعی میراث میں ایک الہامی کتاب بھی موجود ہے، جو تغیراتِ زمانہ سے آج تک محفوظ رہی۔ دین کے

1- سورۃ المؤمنون:53

اس تاریخی ریکارڈ کا کتابی شکل میں ڈیڑھ ہزار سال تک غیر متبدل رہنا خود انسانیت کے لیے دلیلِ رفعت وعظمت ہے اور مسلمانوں کو اس پر فخر کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ ورسول ﷺ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ عظمتِ انسانی کا جوہرِ بے بہا (انمول) ان کے پاس ہے، مگر ان مغرب پرست نادانوں کو کون سمجھائے جو غلامانہ ذہنیت میں مبتلا ہوکر عزت وناز کے احساسات سے بھی ناآشنا ہو چکے ہیں اور کعبۂ یورپ کے شوقِ طواف میں لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ سچ ہے کورچشمی (اندھے پن) سے کورِ باطنی (منافقت) زیادہ تباہ کن ہے۔ شیدائے مغرب ہونے کے بعد یہ غریب، مشرقیت سے تو محروم ہو ہی گئے، مگر اہلِ مغرب میں بھی ان کو کوئی مقام نہیں ملا، نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔

دعویٰ قرآن فہمی:

انجیل ترجموں سے پڑھی جاتی ہے اس لیے کہ انجیل کا Original text ناپید ہے، چند مغرب زدہ حضرات بھی قرآن مجید کو اس کے تراجم سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بزعمِ خود اس کے دعویدار ہیں کہ قرآن فہمی کا حق ادا ہو رہا ہے، جو کچھ انھوں نے سمجھا ہے وہی حقیقت ہے دنیا کے تمام مسلمانوں کو ان کی سمجھ پر ایمان لانا چاہیے:

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

(عقل حیرت سے جل گئی کہ یہ کتنی عجیب بات ہے!)

اس قسم کی کج فہمیاں اُسی سے ظاہر ہو سکتی ہیں، جو حقیقت سے دور جا پڑا ہے۔ اگر ترجموں کا سہارا اتنا کامیاب ہوتا تو آپ یقین مانیں کہ مشرقِ اوسط (شمالی افریقہ) کے تمام باشندوں کی قرآن فہمی غیرِ عرب کے مقابلے میں زیادہ قابلِ قبول ہوتی، کیونکہ وہ عربی زبان سے آشنا ہی نہیں بلکہ عربی ان کی زبان ہے اور حیدر آباد دکن کا ہر باشندہ ڈاکٹر، انجینئر، فلسفی، سائنسدان اور ماہرِ اقتصادیات ہوتا، کیونکہ اردو اس کی اپنی زبان ہے اور یہ علوم وفنون وہاں کی تعلیم گاہوں کے اندر اردو میں پڑھائے جاتے تھے، انگلستان وجرمنی، فرانس اور امریکہ کا ہر فرد دنیا کے تمام فنون میں کامل واکمل ہوتا، کیونکہ ہمارے سائنسدان ان زبانوں کی مدد

سے سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان ممالک کے باشندے تو انھیں زبانوں کے ساتھ گویا پیدا ہوتے ہیں اور ہمارے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے مقابلے میں اپنی زبانیں زیادہ سمجھتے اور جانتے ہیں۔لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے، نہ تو ہر عرب عالمِ دین ہے اور نہ ہر انگریز سائنسدان وفلسفی،حقیقت یہ ہے کہ زبان دانی وفن دانی دو جداگانہ اُمور ہیں۔فن دانی کے لیے زبان دانی بنیادی شرط ہے۔لیکن محض زبان دانی سے فن دانی نہیں ہوتی اور جو لوگ کسی فن سے متعلق اساسی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں، وہ اس مخصوص فن سے بھی ناآشنا و نابلد رہتے ہیں۔اگر ترجموں کی مدد سے کچھ فہم وادراک میسر بھی آ جائے،تو ان کی حیثیت محض اس نمی کی سی ہے، جو کسی تیز فوارے کے نزدیک ہلکی پھوار سے پیدا ہوتی ہے، ورنہ اصل سیرابی آبِ رواں تک رسائی حاصل کیے بغیر ناممکن ہے۔بعض نادان افراد قرآن مجید کے اردو انگریزی تراجم پڑھ کر علومِ اسلامیہ کی مہارت کے مدعی ہیں اور بزعمِ خود یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ سمجھا ہے، یہی حقیقی اسلام ہے۔

اس غلط فہمی کو قدماء کی اصطلاح میں ''جہلِ مرکب'' کہتے تھے اور آج کل کی زبان میں ''مُلائیت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور بدقسمتی سے اس کج بنیی وکور باطنی کے شکار چند ایسے افراد ہیں، جنہیں قدیم عیسائی اقتدار کی خیرات سے کچھ عہدے اور اچھی تنخواہیں میسر آ گئی ہیں۔ان کی تربیت سرکارِ برطانیہ کے ظلِ عاطفت میں ہوئی تھی اور غلامانہ ذہنیت لے کر جوان ہوئے ہیں۔تعلیم کا معیار اور حصولِ تعلیم کی غایت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ وہ انگریزی کی اونچی ڈگریاں حاصل کر کے ذمہ دار غلام بن سکیں گے، ان بے چاروں تک علم کی شعاع پہنچی ہی نہیں تھی۔اب بدلتے ہوئے حالات میں جب کہ اجنبی آقا کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور فضاؤں میں ہر لحظہ ہر آن قرآن وسنت کی گونج سنائی دے رہی ہے، اِن کو اپنے موجودہ اقتدار کے زوال کا اندیشہ ہے۔سامراجِ برطانیہ کے فکری نسل والے مسلمان آزادی وغلامی،مشرقیت ومغربیت، دینداری ولا دینی،عیسائیت واسلام کی آخری جنگ لڑ رہے ہیں، پہلی کوشش تو یہ ہے کہ اسلام کی آواز بالکل دبا دی جائے اور قرآن وسنت نام کی

کوئی چیز حدودِ پاکستان میں رہنے نہ پائے، مگر اس محاذ پر مقابلہ زیادہ دشوار تھا، اس لیے عیارانِ پُرفن (چالاک) نے اپنے پینترے بدل دئے اور اپنے سروں پر دستارِ علمیت کو پیچ دینے کی کوشش کرنے لگے۔

فرنگی ملا اور اس کی خطرناک چال:

علومِ دینیہ کے مختلف اساس ہیں، قرآن، سنت، فقہ، عقائد، ان میں سے عقائد کو یہ کہہ کر علیحدہ کر دیا کہ قدیم یونان کی فلسفیانہ باتیں ہیں، جن کی موجودہ زمانے میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی، اس لیے اس اصول و بنیادی اعلامیہ کو علومِ دینیہ سے قطعاً خارج کر دینا چاہیے۔ فقہ کا ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ سرسری مطالعے سے ان تک رسائی ممکن ہی نہیں، لہٰذا ان کو مسلمانوں کے نزاعی مسائل کا نام دے کر قوانینِ ملکی سے الگ کر دیا۔ اب دو بنیادی چیزیں رہ گئی تھیں، ایک قرآن مجید، دوسری سنتِ رسول ﷺ۔ ان میں حدیثوں کے مجموعے اتنے زیادہ اور محنت طلب ہیں کہ اگر عالمِ دین بننے کے لیے بنیادی شرط قرار دیے گئے، تو پھر سخت مشکل ہوگی اور پھر علماء کی اہمیت اور ضرورت سے نجات نہیں ملے گی اور خود عالم بن کر نئے ماحول میں مقامِ بلند حاصل نہیں کر سکیں گے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرمان: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ [1] (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو)۔ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [2] (جو کچھ رسول ﷺ تمھیں دیں، لے لو اور جس سے منع کریں باز رہو)۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ [3] (تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور یعنی رسول ﷺ آئے اور کتابِ مبین، یعنی قرآن آیا) کے خلاف کھلی بغاوت شروع کر دی اور ایک قلم نے تمام حدیثوں کو من گھڑت اور طومار (قصہ کہانی) کہہ کر رد کر دیا۔

1- سورۃ النساء:59

2- سورۃ الحشر:7

3- سورۃ المائدہ:15

آئندہ صفحات میں احادیث کی کثرت، ان کی اہمیت اور حقانیت کو عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان سے متعلق جملہ امور پر الگ الگ ابواب میں بحث کی گئی ہے، تا کہ اس عظیم ''فتنۂ انکارِ حدیث'' کا سدِ باب ہو سکے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اسے طالبانِ حق کے لیے موجبِ ہدایت بنا دے۔ (آمین!)

❖❖❖❖❖

باب اول:
''حدیثوں کی کثرت اور اس کے اسباب''
(زبان کی نفسیات اور عربی زبان کی خصوصیات)

ذرا غور فرمایئے کہ آج کسی بڑے لیڈر کی چند سالہ سوانحِ حیات لکھی جاتی ہے، جس میں اس کے مختصر سے حصۂ زندگی کے چند خاص پہلوؤں کی تفصیل بیان ہوتی ہے، اس پر کئی کئی جلدیں مرتب ہو جاتی ہیں۔ مگر رسولِ اکرم ﷺ کے 23 سالہ دورِ اصلاح کی کامل تفصیلات بیان کی جائیں، خواب و بیداری، سفر و حضر، اکل و شرب، لباس و رہائش، اہلی و معاشرتی، عبادت و تبلیغ، صلح و جنگ، تجارت و سیاست، غرض دنیا میں جس قسم کے بھی بڑے انسان ذہن میں آ سکتے ہیں اور ان کی جداگانہ خصوصیات پر نگاہیں جا سکتی ہیں، وہ سب کے سب حضورِ اکرم ﷺ کی ذات میں جمع ہیں اور کوئی چھوٹا بڑا پہلوئے حیات ایسا نہیں ہے، جس کو جان نثارانِ مصطفوی ﷺ نے بیان نہ کیا ہو۔ یہ تفاصیل اگر حدیثوں کی ضخیم جلدوں کی صورت میں ہمارے پاس مہیّا ہو جائیں، تو خلافِ عقل و روایت نہیں ہے، بلکہ اس کے خلاف ہوتا، تو عقل و تعجب کی بات تھی۔ مزید برآں اصحابِ رسول ﷺ کا شمار لاکھ سے زیادہ ہے اور پھر ان کے تلامذہ کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے، جنھوں نے رسولِ اکرم ﷺ سے متعلق ہر قول و فعل کی دریافت و روایت میں پورا انہماک دکھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ منکرینِ حدیث نادان تو نہیں ہیں کہ وہ اتنی موٹی سی بات نہ سمجھ سکیں، مگر ایٹمی رفتار سے عالم بننے کی راہ میں حدیثوں کا ذخیرہ حائل تھا، اس لیے انہوں نے حجتِ حدیث کا ہوسِ اقتدار میں انکار کر دیا۔ اور اب ان کے خیال میں حصولِ مقصد بہت آسان تھا، یعنی قرآن مجید کو اردو انگریزی میں تراجم کی مدد سے پڑھ لیا اور عالم بن کر فتویٰ دینے لگے۔ عوام اس کبر و مکر کو نہ سمجھ سکیں، لیکن کوئی پڑھا لکھا آدمی اس طریقۂ علمیت کو کبھی

قبول نہیں کر سکتا۔ علمائے دین کا کیا سوال ہے! دنیا کے ماہرینِ اَلسنہ (ہر ایک زبان کے ماہر) بھی مغرب پرستوں کی اس ''ملائیت'' کے خلاف ہی فتویٰ دیں گے۔

ترجمہ کی حیثیت اور ماہرین لسانیات کی آراء:

ماہرینِ اَلسنہ اس پر متفق ہیں کہ ترجموں کے ذریعے ایک زبان کے جزوی مفہوم دوسری زبان میں منتقل ہوتے ہیں، مگر ایک زبان سے دوسری زبانوں میں مضامین کا کلی انتقال ممکن نہیں ہے۔ ہر زبان کے الفاظ کے جو بہتر عوامل کارفرما ہوتے ہیں، مثلاً: قومی مزاج، قومی تمدن، قومی روایات وغیرہ، جن کو اس زبان کے الفاظ کی وضع وانتخاب میں بڑا دخل ہے، وہ دوسری زبان میں کیونکر منتقل ہونگے، مثلاً: دختر، Daughter (ڈوٹر)، اور دوہتر، یہ تین الفاظ عہدِ حاضر کی تین جداگانہ زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ معنی اور اصل کے اعتبار سے ایک ہیں، یعنی قدیم آریہ زبان ان کا ماٴخذ ہے اور آج بھی ''لڑکی'' کے معنی میں بولے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان الفاظ کی تحلیل کریں اور ان تاریخی حقائق کو سامنے رکھیں، جو پہلے پہل لڑکی کے لیے اس لفظ دوہتر کی وضع کے محرّک تھے، تو آپ کے سامنے قبلِ تاریخِ وید[1] کے دور سے لے کر آج تک کے آریوں کی معاشرت، تمدنی خوراک، قومی مزاج اور پھر ان کے آئندہ ادوار کے انقلابات کی ایک طویل تاریخ مرتب ہو جائے گی۔

محض اشارے کے طور پر یوں سمجھئے کہ ان تینوں الفاظ میں ''دوہتر'' کا لفظ سب سے قدیم اور پرانے وید کے عہد کا لفظ ہے، جس کی ترکیب ''دوہ تر'' سے ہوئی ہے۔

لفظی معنی دودھ دوہنے والی یعنی Milk Maid۔

آپ اس لفظ کی مدد سے قدیم آریوں کی تاریخ سے ماضی مابعد کا نقاب اٹھائیں تو یہ چند باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ آریہ ایک قوم تھی، جو کسی سرسبز شاداب علاقے میں رہتی تھیں، ان کے معاش کی بنیاد جانوروں کی پرورش اور زمین کی پیداوار، ان کی خوراک کے اہم اجزا دودھ اور دودھ سے حاصل شدہ چیزیں تھیں۔ گائیوں کے تھن مرد نہیں چھوتے تھے، لڑکیاں

1- ہندوؤں کی مقدس کتاب کی تاریخ

دودھ دوہا کرتی تھیں، گائیوں کی رکھوالی لڑکیوں کے ذمہ تھی، لڑکیاں اپنے میکے میں خدمت گزاری میں مشغول رہتیں، کیونکہ ان کے لیے جو لفظ (دوہتر) وضع کیا گیا، وہ مالکانہ حیثیت کے برخلاف خادمانہ حیثیت کو ظاہر کرتا ہے، قدیم آریائی تمدن میں لڑکیوں کی نمایاں حیثیت نہ تھی وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس لفظ ''دوہتر'' سے انگریزی ڈوٹر (Daughter) کا استخراج بتاتا ہے کہ آریہ قوم اپنے اصل وطن سے نکل کر مختلف امصار و بلاد کو طے کرتی ہوئی انگلستان تک جا پہنچی۔ ان دونوں منزلوں کے درمیان جو نہ جانے کتنے مقامات اور ہیں، ان کو تلاش کیجئے، اور ہر جگہ آریائی نشانات واثرات کا کھوج لگائیے، پھر یہ معلوم کیجئے کہ اپنے وطنِ اصلی سے کیوں منتشر ہوئے؟ کن سیاسی ومعاشی عوامل ومحرکات نے ان کو ترک وطن پر مجبور کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

پھر یہ معلوم کیجئے کہ لفظ دوہتر، آج فارسی میں ''دختر'' سے بدلا ہوا ہے۔ کسی بیرونی فاتح کی یادگار ہے، جو حروف ہجا میں حرفِ ''خ'' کا استعمال زیادہ کرتے تھے اور انھوں نے اس آریائی تلفظ کو بدل دیا۔ اس لیے ترجمہ میں ایک زبان کے الفاظ کی جگہ پر جب ہم دوسری زبان کے الفاظ رکھتے ہیں، تو حقیقتاً ایک قوم کے تصورات ومزاج کو دوسری اقوام کے تصورات ومزاج سے بدلنا چاہتے ہیں، جو یقیناً محال ونا ممکن ہے۔ صرف جزوی تصور ہوتا ہے، حقیقی وکلی انقلاب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ماہرینِ اَلسنہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ کسی ایک زبان میں ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے دو الفاظ نہیں ہوتے، جنہیں اصطلاحات لغت میں ''مترادفات'' کہتے ہیں، کیونکہ وضعِ الفاظ کی غرض وغایت جب ایک لفظ سے پوری ہوگئی، تو لفظِ ثانی کے ایجاد کی سرے سے ضرورت نہ تھی۔ ہاں جزوی اختلاف کی وجہ سے جداگانہ الفاظ حسبِ ضرورت وضع ہوتے چلے گئے۔ کسی زبان میں مترادفات کا اقرار حقیقتاً اقرار کرنے والے کی کم علمی کی دلیل ہے، جو اصل زبان کے باریک فرق سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ترادف ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں، مثلاً: کہا جاتا ہے کہ عربی زبان میں مترادفات بکثرت ہیں، یہاں تک کہ ایک اونٹ کے لیے کئی سو الفاظ موجود ہیں، واقعہ

یہ ہے کہ اونٹ کی اقسام ان کے رنگ، عمر کے اعتبارات سے علیحدہ علیحدہ الفاظ ہیں، یہ بالکل غلط ہے کہ ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے سینکڑوں الفاظ وضع ہو گئے۔ جب تک زبانِ عربی پر کامل وقوف نہ ہو، مفہوم کے باریک فرق کا اثر جو جدا گانہ الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، کبھی دریافت نہ ہوگا اور ترجمہ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ خصوصاً جب اصل و ترجمہ کی زبانیں وسعتِ معانی و کثرتِ الفاظ کے لحاظ سے باہم ہم پلّہ نہ ہوں۔

زبان و ترجمہ سے متعلق ہم نے ماہرینِ اَلسنہ کے متفقہ فیصلوں میں سے صرف دو کلیات بیان کیے ہیں، تاکہ عوام و خواص اس کو پیش نظر رکھیں اور قرآنِ حکیم کے محض ترجمہ کو جو کسی زبان میں بھی عربی سے کیا گیا ہو، اسے دین کی فہم کا ذریعہ قرار نہ دیں۔

ان میں مستشرقین کے ترجمے اکثر موجبِ گمراہی ہیں اور دین کی محدود فہم رکھنے والوں کے ترجمے جن کی بنیاد مترجم کے ذاتی قیاس اور اجتہاد پر ہے، خطرے سے خالی نہیں، ان سے بھی اجتناب ضروری ہے۔

عربی زبان اور اس کی امتیازی خصوصیات:

اب ذرا عربی زبان کا جائزہ لیجیے، جس میں قرآن و حدیث کے علمی خزانے محفوظ ہیں، یہ زبان سامی (سام بن نوح کی) اقوام کی زبان ہے۔ فارسی، اُردو، جرمنی، فرانسیسی، لاطینی وغیرہ انڈو یورپین (Indo-Europian) زبانیں ہیں۔

آریہ نسل کی زبانوں اور سامی زبانوں میں جس طرح نسلی فرق ہے، اسی طرح مزاج، تمدن، افکار اور تاریخیت میں بھی کامل بُعد ہے۔ جس طرح آریہ و سامی اقوام ایک دوسرے کی خصوصیات کی کلی نمائندگی نہیں کر سکتیں، اسی طرح ایک نسل کی زبان دوسری نسل کی زبانوں کی تمام تر جانشینی و نیابت سے عاجز ہے۔ صرف جزوی مفہوم ترجمہ کی مدد سے ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو سکتا ہے، خصوصاً ایک زبان کے ادبی شاہکار کو دوسری زبانوں میں منتقل کرتے وقت، فصاحت و بلاغت، حسنِ بیان، خوبیِ ادا، معنوی لطافت و دل کشی اور ان سے حاصل ہونے والے دیگر اثرات تو قطعاً منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ اس نسلی

فرق کے علاوہ عربی زبان اپنی وسعتِ معانی، کثرتِ الفاظ، کمالِ قواعد کی وجہ سے دنیا کی ممتاز ترین زبان ہے اور اس زبان میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اقوال فصاحت و بلاغت کے بلند ترین معیار رکھتے ہیں اور قرآن مجید ساری کائنات کے لیے عربی زبان کا معجزانہ مجموعہ ہے۔

اگر کوئی شخص قرآن وسنت کو سامی زبان سے آریائی زبان میں ترجمہ کر کے یہ چاہے کہ قرآن وسنت کا یا اسلام کا کامل علم اس سے حاصل ہو جائے گا، تو لاریب ''جہلِ مرکب'' میں مبتلا ہے اور کسی فرنگی تربیت گاہ کا فارغ التحصیل مُلا ہے، جس کو نہ اسلام کا علم ہے اور نہ اقوام کی لسانی خصوصیات کا علم ہے۔ آج جو عربی زبان و عربی قومیت کے خلاف عجمی نژاد (خاندان) مسلمان نسلوں میں کچھ عصبیت پائی جاتی ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی طرف آج سے چودہ سو سال پہلے نگاہِ نبوت نہیں پہنچی تھی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کو مخاطب کر کے گویا آنے والی تمام عجمی نسلوں کو خبردار کر دیا تھا کہ عربوں سے عداوت ان کو عربی زبان کا مخالف بنا دے گی اور عربی (زبان کی) مخالفت کا نتیجہ قرآن مجید سے ناواقفیت اور سرکارِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی وسنت سے ان کو غافل کر دے گی، دین ہاتھ سے جاتا رہے گا اور آخرت کی فلاح سے محرومی ہو گی، اس نصیحت و تنبیہ کے مخاطب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ تھے، کیونکہ ان کی فدائیت و جاں نثاری ایک حقیقت ہے، بلکہ دراصل غیرِ عرب اقوام ہیں، جو عربی زبان سے تہاون (سستی) برتتے ہیں اور قرآن وسنت کو ترجموں کے ذریعے پڑھ کر مُلا بنے پھرتے ہیں اور علمائے دین کی تنقیص کرتے ہیں۔

یہ تو زبان سے متعلق چند بنیادی امور تھے، اب ذرا خم خانۂ فرنگ (یورپ کے شراب خانے) کے مُلائے خراباتی (شرابی) خود اہلِ فرنگ کے ماحول کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں کہ ان کے پیرِ مُغاں (آگ کے پجاریوں) کی محفلوں کا کیا دستور ہے۔ بلاشبہ انجیل اپنی اصل زبان میں ناپید ہو چکی ہے اور جیسا کہ اوپر ہم کہہ آئے ہیں کہ علاقائی زبانوں میں جو کچھ

انجیل کے نام سے موجود ہے، ان ملکوں میں مسیحیت انھیں پر قائم ہے، پھر بھی تمام باشندگانِ ملک و مذہبِ عیسوی کے لیے یہ سند نہیں مانے جاتے اور نہ کبھی وہ اس کے دعویدار ہوئے۔ دینِ مسیحی کے متعلق لب کشائی کا حق صرف انہیں اشخاص اور ایسی جماعت کو ہے، جو اپنی زندگی کا مُعْتَد بہ حصہ مذہبی علوم کی تحصیل اور غور و فکر میں صرف کرتے ہیں۔ اسلام ان کے ان مساعی و استحقاق کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ان سے ہمارا اختلاف صرف اس مسئلہ میں ہے، جو انہوں نے نجات فروشی اور رہبانیت کے نام پر اپنا اقتدار قائم کر رکھا ہے اور اپنی طرف سے اعمال و معتقدات میں جن امور کو چاہتے ہیں، داخل کر دیتے ہیں اور جنہیں چاہتے ہیں دین سے خارج کر دیتے ہیں۔ مثلاً 1950ء میں پاپائے روم نے اعلان کر دیا کہ آج کیتھولک مسیحیوں کا عقیدہ یہ قرار پایا کہ حضرت مسیح کی طرح ان کی والدہ محترمہ جناب مریم صدیقہ بھی جسدِ عنصری (جسم خاکی) کے ساتھ آسمان پر اُٹھالی گئیں، حالانکہ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اپنے بندوں کے اعمال و معتقدات میں جن امور کو چاہے داخل کر دے اور جن امور کو چاہے خارج کر دے اور اللہ کے ان حکموں کا اعلان پیمبر کی زبان سے ہوا کرتا ہے، کسی راہب، رِبی، پوپ، عالم، حَبر، مولوی، امام، مجتہد کو حلال و حرام کا مطلق اختیار نہیں ہوتا۔

اس غلط پاپائی اقتدار کے سوا اہلِ کلیسا کے اس حق کا انکار کہ مسیحی مذہب کے اصول و فروع کو ظاہر کرنے کے وہ حقدار ہیں، کسی احمق ہی سے ممکن ہے، ورنہ جب آبائے مسیحی اپنی ساری زندگیاں دین کے افہام و تفہیم میں صرف کر رہے ہوں، تو دین کے متعلق بولنے کا حق بھی انہیں کو ہونا چاہیے۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ زندگی بسر کریں خم خانۂ فرنگ میں اور کیفیت بیان کریں بادۂ حجاز (عرب کے شراب خانے) کی۔

سطورِ بالا سے ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ تراجم کی مدد سے قرآن مجید کا مطالعہ غیر مفید ہے، بلکہ مدعائے اصلی یہ ہے کہ تراجم کی مدد سے قرآن مجید کا مطالعہ صرف اس حد تک محدود ہے کہ دین کی جزوی باتیں، قرآن مجید کا اجمالی علم حاصل ہوتا ہے، رہے آیتوں کے تفصیلی

مطالب، اسرار، غوامض اور ہدایتِ الٰہیہ سے کامل استفادہ، تو عربی زبان وعلومِ قرآنیہ کے متعلقات کی صحیح واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے جب تک اسلام سے کلی انکار نہ کیا جائے، علمائے دین کی خدمات سے ہم مستغنیٰ نہیں ہو سکتے اور علومِ دینیہ کی تعلیم کے لیے معیاری مدارس کے قیام کی طرف سے لا پرواہی درست نہیں ہوسکتی۔ غیر عربی دانوں کے لیے ازبس (کثرت سے) ضروری ہے کہ وہ بہر حال قرآن مجید کا مطالعہ تراجم کی مدد سے کیا کریں؛ کیونکہ شبِ دیجور (اندھیری رات) میں راہروی (چلنے) سے بہتر ہے کہ سحر کے دھندھلکے (ابر آلود) میں آدمی مسافت طے کرے، اگر آفتاب کی جگمگاتی ہوئی روشنی میسر نہیں آرہی ہے۔

زبان دانی کی شرطیں:

اگر کسی زبان میں کوئی کلام آپ سنیں، تو صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کی واقفیت ضروری ہے:

اول: جس زبان کا کلام ہے، آپ اس کو جانتے ہوں یا کم از کم ان تمام الفاظ سے پوری طرح واقف ہوں جو اس کلام کے اجزاء ہیں۔

دوم: اس زبان کے قواعد سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔

سوم: اس زبان کے اصولِ بیان و بدیع کو جانتے ہوں۔

چہارم: متکلم ومخاطب کے فرقِ مراتب کا علم ہو۔

پنجم: اس موقع ومحل کا علم ہو، جس میں یہ کلام ظاہر ہوا۔

ششم: متکلم نے خود اپنے کلام کی کوئی وضاحت کی ہے یا کسی کو وضاحت کرنے کا ذمہ دار بنایا ہے، تو ان صورتوں میں اس کلام کو سمجھنے کی ایک شرط کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے، کیونکہ اب اس کلام کے اندر لغوی اور اصطلاحی دونوں حیثیتیں پیدا ہوگئیں۔

ہفتم: اس کلام کے مخاطب کون تھے اور کیا حاضرین ہی حقیقی مخاطب تھے یا مقصودِ خطاب ذہن میں یا خارج میں معہود اشخاص تھے؟

ہشتم: اگر متکلم کا کلام براہِ راست آپ نے نہیں سنا ہے، بلکہ بالواسطہ آپ تک نقل ہو کر پہنچا ہے، تو اس صورت میں دو مزید شرطوں کا اضافہ ہو جائے گا:

(الف) تکلم کے وقت مستعملہ کلمات کے معانی کیا تھے؟ (ب) ناقلینِ کلام معتبر ہیں یا نہیں، جنہوں نے اس کلام اور کلمات کے معانی کو ہم تک پہنچایا ہے۔

نہم: امثال ومحاورات کا علم ہو، کیونکہ بعض حالتوں میں ترکیبِ خاص کی وجہ سے مفرد الفاظ کے لغوی معنی بدل جاتے ہیں۔

خصائصِ لغتِ عرب:

امورِ مذکورہ بالا تو ہر زبان کے کلام سمجھنے کی بنیادی شرائط ہیں، لیکن زبانِ عربی کے لیے عموماً اور قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے خصوصاً مندرجہ ذیل شرطوں کا اضافہ نہایت ضروری اور اہم ہے:

(1) الفاظ کی دلالت باعتبارِ مطابقت وتضمن والتزام (2) پورے قرآن مجید کا ہمیشہ پیش نظر رہنا، کیونکہ بعض آیات دوسری (بعض آیات) کی تفسیر وتوضیح کرتی ہیں۔ (3) عرب جاہلیہ کی زبان اور قبیلۂ قریش کی لغت کا علم۔ (4) رسولِ اکرم ﷺ نے ان آیاتِ قرآنیہ کی کوئی تشریح بیان کی ہے یا نہیں؟ (5) صحابۂ کرام جو مخاطبِ اول تھے، انہوں نے قرآن مجید کے کیا مطالب بیان کیے ہیں؟ (6) وضع کے اعتبار سے الفاظ کے معانی کا علم یعنی حقیقت، مجاز، عموم، خصوص، مطلق، مقید، حذف، اضمار، منطوق، مفہوم، اقتضاء، اشارہ، تنبیہ، ایماء وغیرہ جو عربی زبان کی خصوصیات ہیں اور دوسری زبانوں میں ان کا وجود نہیں ہے۔

ماحصل:

یہ چند باتیں کلیات کی حیثیت رکھتی ہیں، جن کے بغیر کسی زبان کے کلام کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ حیرت ہے کہ اللہ جلّ وعلا کا کلام جب دنیا میں موجود ہے اور عربی ایک زندہ زبان ہے، دنیا کے کروڑوں انسانوں میں رائج اور ان کی قومی زبان ہے، اس کے قواعد

وضوابط، مفرد ومرکب الفاظ کی تشریح کے سلسلے میں قدیم وجدید اہلِ فن کی کتابیں میسر ہیں، تو پھر مقامِ تعجب ہے کہ لوگ اصل کلام سے استفادہ نہ کر کے صرف ترجموں پر اکتفا کریں اور قرآن فہمی کے مدعی بن جائیں۔

شیکسپئیر کے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے، لیکن ادیبوں اور زبان دانوں کا خیال ہے کہ ترجمہ میں نہ تو انگریزی زبان کی ادبی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں، نہ شیکسپئیر کا زورِ بیان منتقل ہوتا ہے اور نہ معنوی لطافت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ انگریزی اور اردو اِنڈو یوروپین Indo-Europian)) زبانیں ہیں اور دونوں میں سے کوئی زبان بھی عربی کی وسعت وکمال کو نہیں پہنچتی۔ پھر عربی ادب کا شاہکار یعنی قرآن مجید جو معجزانہ کلام ہے اردو میں منتقل ہو کر وہ تمام لفظی ومعنوی حیثیات کا کیونکر حامل ہو سکتا ہے!

گر مصوّر صورتِ آں جانِ جاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

(''اگر مصوّر، اُس جانِ جاں کی صورت بنانا چاہے گا، تو مجھے حیرت ہے کہ اُس کی دلکشی کا اظہار کس طرح کرے گا؟!'')

علاوہ ازیں عربی زبان میں بکثرت الفاظ ایسے ہیں، جن کے متعدد معانی ہیں اور بعض الفاظ لغتِ اضداد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مترجم ان میں سے کسی ایک معنی کو بیان کرے گا، مگر دوسرے معنی سے کیا اثرات ونتائج مرتب ہوتے ہیں، ان کا علم ترجمہ پڑھنے والوں کو تو کبھی نہیں ہو سکتا، حالانکہ قرآن فہمی کے لیے ان کا بھی جاننا ضروری ہے، کیونکہ بہت سی ہدایتوں کا ان سے تعلق ہے۔ قرینہ ومحلِ استعمال سے امتیاز پیدا ہوتا ہے، مثلاً: مسجدِ حرام کے معنی ''مسجدِ محترم'' اور اَکلِ حرام کے معنی ''ناجائز ممنوع کھانا''، قرء کے معنی ''حیض وطہر'' دونوں ہیں، نکاح کے معنی ''عقد ومباشرت'' دونوں ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مترجم کوئی ایک معنی لکھے گا، مگر ترجمہ پڑھنے والے دوسرے معنوں کے اثرات سے ناواقف رہیں گے۔ اور اگر دونوں معانی لکھے جائیں، تو غیر عربی دانوں کو الجھن ہوگی، پھر

ایک جگہ کسی ایک معنی کے تعین کے لیے جو قرائن ہیں، وہ ترجمہ پڑھنے والوں کو قطعاً معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس لیے قرآن فہمی کے لیے شرطِ لازم ہے کہ انسان سب سے پہلے کلماتِ قرآنی کی مکمل تحقیق، عربی قواعد و لغت کی روشنی میں کرے اور عربی زبان کا کامل علم حاصل کرے۔ عربی سے ناواقفیت لوازمِ قرآن سے ناواقفیت یا ان کا ناتمام علم، قرآن فہمی سے محروم رکھے گا۔

قومی اثرات کے علاوہ تمام موجودات ذات وصفات کے اعتبار سے باہم متمائز ہوتے ہیں۔ ہر فرد کے افکار و اعمال اس کی اپنی نفسیات کے آئینہ دار ہیں۔ کوئی کلام جو متکلم کی اپنی نفسیات کا آئینہ دار تھا، ترجمہ کے بعد مترجم کی نفسیات سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس طرح دو جداگانہ شخصیتیں بیک وقت ایک مرکز پر مجتمع ہو کر متوافق و متخالف اثر ڈالتی ہیں۔

ترجمے میں اصل کلام کی وحدانیت باقی نہیں رہ سکتی اور اصلی کلام کے ذریعے متکلم کے مافی الضمیر تک پہنچنے کے جو امکانات اور سہولتیں ہیں، وہ بہر حال ترجمے کی صورت میں موجود نہیں ہیں؛ کیونکہ اب سامع پہلے مترجم کے مافی الضمیر تک پہنچنے کی راہ تلاش کرتا ہے، اس کے بعد اصل متکلم کے خیالات تک رسائی کی امید رکھتا ہے۔ اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ مترجم کے اثرات اس حد تک غالب رہیں کہ منزل تک پہنچنے کے بعد بھی مخاطب اصل کلام کی بعض خوبیوں سے ناواقف رہ جائے، اور یہ توسط و پیچیدگی راست روی میں حائل رہے۔

کسی بلند پایہ شاعر کا کلام چند ادیبوں کے سامنے پیش کیجیے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہر شخص اپنی نفسیات کی روشنی میں اس کی شرح کرتا ہے۔ ان شرحوں میں سے آپ جس ایک شرح کو قبول کرتے ہیں، حقیقتاً اس شارح کی نفسیات کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور ممکن ہے کہ شاعر کی اپنی مراد اس معہود شارح سے الگ ہو۔ بلکہ دوسرے شُراح کے موافق ہو، مگر آپ اپنے تأثر و قبول کی وجہ سے حقیقت سے دور رہ جائیں گے اور شارحِ خاص کی نفسیات کے شکار رہیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ اناجیل کو حذف و الحاق سے محفوظ بھی تسلیم کر لیں، پھر بھی

ہدایتِ خلق کے لیے ناقص ونا کافی ہیں، کیونکہ کتابِ مقدس کا اصل متن تو مفقود ہے، مگر ترجمے میں مترجمین کی اپنی نفسیات نے جگہ بنالی ہے۔ایسا ممکن ہے کہ کمالِ اخلاص کے باوجود اہلِ انجیل مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مراد تک کبھی نہ پہنچ سکیں اور مترجمین کے اثرات سے متاثر ہوکر منزلِ مقصود سے دور رہ جائیں۔اناجیل کے سلسلہ میں مترجمین پر یوں بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر یہ تراجم حرف بحرف صحیح ہیں،تو مسیحیوں نے اصل متن کہاں اور کیوں چھپادیا اور اگر مطابقِ اصل نہیں،تو قطعاً قابلِ قبول نہیں ہیں۔

انجیل کا پہلا ترجمہ یونانی میں ہوا،اور پھر یونانی زبان کی وساطت سے دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کا سلسلہ قائم ہوگیا۔اور ہر دور کے مترجم کی نفسیات سے یہ الہامی کتاب متاثر ہوتی چلی گئی،مثلاً: سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بشارت دی تھی کہ فاران کے مقدس نبی دس ہزار پاک نفوس کی رفاقت میں تشریف لائیں گے۔انگریزی بائیبل میں یہ اعلان آج بھی اس معینہ عدد کے ساتھ موجود ہے،لیکن انگریزی سے اردو ترجمہ کے وقت بعض مسیحیوں نے دس ہزار کی جگہ لاکھوں لکھ دیا،اور اس ادنیٰ فرق سے بات کہاں پہنچ گئی۔ اس طرح مخلص مسیحیوں نے اپنے دین کے تحفظ کے لیے ایک نئی دیوار کھڑی کردی اور قبولِ اسلام کا دروازہ اپنے لیے بند کردیا۔ورنہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ فتح مکہ یعنی وادیٔ فاران میں داخلے کے وقت حضورِ اکرم ﷺ کے ہم رکاب دس ہزار صحابۂ کرام تھے،جن کی پاک نفسی وقدوسیت کی گواہی گذشتہ آسمانی کتابوں کے علاوہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مترجم متکلم کی جداگانہ نفسیات پر پیمبرانہ تفسیریں بھی ناقص ہوجائیں گی؛ کیونکہ حضورِ اکرم ﷺ بلاشبہ زبانِ قدرت ومترجمِ کلامِ الٰہی ہیں۔مگر اللہ کے حکم کے مطابق حضور ﷺ کی ذات متبوعِ حقیقی اور مُطاعِ (مربی) اصلی ہے،آپ مستقل مرکزِ ہدایت ومنبعِ دین ہیں۔

سنت کی اہمیت:

ترجموں کے نقص وخامی کی تفصیل کے علاوہ ہم یہ بتا آئے ہیں کہ کسی کلام کو سمجھنے کے

لیے ایک دوسری بنیادی شرط اور بھی ہے، یعنی متکلم نے اپنے کلام کی خود کوئی تشریح کی ہو یا کسی کو تعلیم دے کر تشریح کا ذمہ دار بنا دیا ہو، ان صورتوں میں کلام کا صحیح مفہوم وہی ہوگا، جو متکلم یا اس کے نامزد نمائندے سے منقول ہے۔ اب اس کلام کو صرف لغت کی بنا پر سمجھنا غلط ہوگا؛ کیونکہ اس کی حیثیت اصطلاحی کلام کی بھی ہو گئی۔ لہٰذا لغوی و اصطلاحی دونوں اعتبار سے اس کلام کو سمجھنا چاہیے۔ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے، سلاستِ بیان و ادبِ لغت کے اعتبار سے یہ بہت آسان کلام ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (1) ترجمہ: ''نہایت صاف و سلیس عربی میں۔''

دوسری جگہ ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (2)

(ترجمہ:) ''اعلانِ خداوندی ہے کہ قرآن مجید کو عربی میں اس لیے نازل کیا کہ تم اس کو آسانی سے سمجھ سکو۔''

جو شخص قرآن کی اصل زبان سے ناواقف ہو، وہ منشائے الٰہی کے مطابق قرآن مجید کو کامل طور پر کیونکر سمجھ سکتا ہے! کاش مدعیانِ قرآن فہمی ان آیات پر ایمان لے آئیں، تو پھر عربی دان علمائے قرآن کی توہین و تنقیص کے بدلے ان کی گراں بہا دینی خدمات کے معترف ہوں۔

قرآن مجید کی پیغمبرانہ تشریحات:

قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر خود متکلمِ حقیقی نے بیان کی ہے، جن کی واقفیت کلام فہمی کے مسلمہ ضابطے کے مطابق ہر متدبرِ کلامِ الٰہی پر لازم ہے۔

دوسری اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ ہرکارہِ پیغام رساں (خط پہنچانے والے ڈاکیے) کی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچا دیں اور بس، اگر بعثتِ انبیاء سے یہی غرض تھی کہ اللہ اور اس کے بندوں

1- سورۃ الشعراء:195

2- سورہ یوسف:2

کے درمیان ڈاکیوں کی ایک جماعت پیدا کی جائے اور بندگانِ خدا ان پیغاموں کو خود سمجھ لیا کریں، تو یہ کام ان ہرکاروں (اشخاص) کے بغیر بھی انجام پا سکتا تھا۔ اور جس طرح عقلِ انسانی نوامیس (قوانین) فطرت کی دریافت میں کسی ماورائے انسانی رہنمائی کی محتاج نہیں ہے، بلکہ پیش آنے والی تمام گتھیاں خود پیدا کرتی ہے اور کسی اور طاقت کے بغیر خود ہی سلجھاتی ہے۔

اگر مسائلِ دینیہ بھی اسی قبیل سے ہوتے اور انسان عقل وفہم میں خود مکتفی (خود کفیل) ہوتا، تو پھر عالمِ مادہ کی طرح روحانیت کا تعقّل (سمجھنا) بھی فطرتاً اس کے سپرد ہو جاتا۔ جانوروں کی طرح اپنی خبرُ ث (عقل) سے اللہ کی سخط ورضا اور رحم وغضب کو معلوم کر لیا کرتا، لیکن واقعات ومشاہدات ہمیں بتاتے ہیں کہ مادیات کی حدود میں انسانی صلاحیتیں ناکامی سے کامیابی کی طرف یوماً فیوماً بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایک کی غلطی کی تصحیح دوسرا فرد کر دیتا ہے۔ عناصر کی شکست وریخت اور جمع وترکیب کی حد تک انسان بڑا قادر وتوانا ہے، مگر روحانیت کے مسائل میں اس کی عقل کچھ ایسی کوتاہ دست وسُست قدم ہے کہ دوسروں کی رہنمائی کے بغیر آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ بڑے سے بڑا فلسفی وسائنس داں جب مادی ادراک کے منازل طے کر کے روحانیت کی سرحد پر جا کھڑا ہوتا ہے، تو روح کی اہمیت اور خدائے کائنات کے اقرار میں اس کی گردن جھک جاتی ہے، مگر اللہ رے بے بسی! از خود انسان وخدا کے درمیان رشتے کا سراغ لگانے سے بالکل مجبور ہے۔ (تفصیل کے لیے میرا مضمون ''دہریت اور اس کی ایڈیالوجی'' ملاحظہ فرمایئے) یہی وہ نقطہ ہے، جہاں بہت ہی بالغ نظر انسان بھی مذہب ومعلمِ مذہب کا محتاج ہی نظر آتا ہے۔

قرآن ومطالعۂ فطرت:

خالقِ کائنات کا ارشاد ہے کہ: ''ہم نے کوئی چیز عبث وبیکار نہیں پیدا کی ہے''۔ اہلِ نظر وصاحبِ ایمان کا فرض ہے کہ اپنے فکر وعمل کو کام میں لائیں، ان سے استفادہ کریں اور خلّاقِ ارض وسما کے شکر گزار رہوں۔ آفاقی آیتوں کے متعلق اللہ جلّ وعلیٰ نے اجمالی حکم دے کر ان کی تفصیل وتشریح اور استفادہ وانتفاع کا کام خود ہمارے سپرد کر دیا ہے، جوں جوں

ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں، عقلِ ادراک اس وسیع خزانۂ فطرت سے اپنی کفالت کا سامان مہیّا کر لیتی ہے۔ جو حاجتیں آج ہیں، ان کی تکمیل کے اسباب بھی آج ہی ظاہر ہوتے ہیں۔

عصرِ حاضر کی ایجادات کا سراغ ایک ہزار سال پہلے تلاش کرنا اسرارِ فطرت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح ہزار سال بعد جب انسانی ضروریات بہت کچھ بدل چکی ہوں گی۔ اس وقت آج کے مہیّا کردہ سامان کی کوئی قیمت نہیں رہے گی۔ اصطلاحِ تمدن میں جس کا نام ترقی ہے، وہ ''تکمیلِ ضرورت'' کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ اپنی ضروریات و تکمیلِ ضروریات کے لحاظ سے ہر دور ترقی کا دور ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر دور اپنے ماضی کی نسبت سے شاندار اور مستقبل کے اعتبار سے پست و تاریک ہے، گویا ترقی حاجتوں کی فراوانی کا دوسرا نام ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ انسان سراپا احتیاج ہے اور حاجتوں کے ظہور سے انسان کے تمام کمالات وابستہ ہے۔

جو لوگ مذہب کی غرض صرف مادی ترقی قرار دیتے ہیں وہ بڑی غلطی میں ہیں۔ وہ روح و مادہ کے فرق کو نہیں سمجھے اور دونوں کی حدود سے غافل ہیں۔ مادّی ترقیات روح وخدا کے انکار کے بعد بھی ہوسکتی ہیں؛ کیونکہ ان مسائل میں عقلِ انسانی خود مکتفی ہے۔ ضروریاتِ انسانی ان کے لیے محرک اور میدانِ عمل بہت وسیع ہے۔ مگر روح و مذہب کے معاملے میں انسانی دراز دستیاں (بے انصافیاں) ناکارہ، عقل ناکام اور میدانِ عمل نامعلوم ہے۔ یہاں اقرارِ خدا اور معلمِ مذہب کے اتباع سے مفر (کوئی بھاگنے کی جگہ) نہیں۔ **اسی لیے قرآن مجید مطالعۂ فطرت پر زور دینے کے بعد بھی اس کی کوئی تفصیل نہیں بتاتا اور نہ کبھی کوئی معلمِ مذہب یعنی پیغمبر و رسول طبیعات و کیمیا کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے۔ اس کے برخلاف فطرت کے اجمالی احکام دے کر عقائد و اعمالِ مذہب کی تفصیلات بیان کرنے کی ذمہ داریاں ان کے سپرد ہیں۔**

فریضۂ رسالت:

روح و مادہ کا بنیادی فرق معلوم کرنے کے بعد تمام باہوش انسانوں کا فرض ہے کہ

مذہب کا صحیح علم حاصل کرنے کے لیے اللہ کے فرامین واحکام کی طرف متوجہ ہوں اور جو کچھ کلامِ الٰہی کے نام سے انسانوں کے پاس موجود ہے، اس کو سمجھیں اور اسی کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ چونکہ دنیا میں اللہ کے کلام کا صحیح واصلی مجموعہ صرف قرآن مجید ہے، دوسری الہامی کتابیں تاریخی حیثیت سے مشتبہ، حذف والحاق کی شکار اور بے اصل ہیں، یعنی اصل متن ناپید ہے اور ترجمہ در ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کتابوں سے تشنہ کام (پیاسے) دل کو تسکین نہیں مل سکتی، لہٰذا بنی نوعِ انسان کو چاہیے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرے اور اپنی مذہبی پیاس اسی آبِ زُلال (صاف شفاف پانی) کے سرچشمے سے بجھائے۔

قرآن مجید کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے دنیا کے اور دوسرے کلاموں کی طرح ان تمام شرائط کا پورا پورا لحاظ رکھیں، جو کسی کلام کے فہمِ معانی کے لیے ضروری ہیں۔ اولاً لسانِ قرآن، یعنی عربی زبان سے صحیح واقفیت۔ دوسری اہم تر بات یہ ہے کہ اگر متکلم نے کسی کو تعلیم دے کر اپنے کلام کی تشریح وتوضیح کا ذمہ دار بنا دیا ہے، تو اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ مخاطبین اس کلام کا وہی مفہوم قبول کریں، جو متکلم نے خود بیان کیا ہے، یا اس کے سکھائے ہوئے نمائندے نے وضاحت فرمائی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی کلمہ کے معنی لغت کے اعتبار سے کچھ اور ہوں، لیکن متکلم کی مراد وہ اصطلاحی معنی ہو، جو اس نے خود متعین کیے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے ساتھ حضورِ اکرم ﷺ کا دوگونہ تعلق ہے، اول تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام آپ پر نازل ہوا، تاکہ آپ بعینہٖ دوسروں تک پہنچا دیں۔

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ[1] یہ اور اس مضمون کی متعدد آیتیں ہیں، جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیب ورسول ﷺ کو حکم دیا کہ قرآن مجید جوں کا توں تمام لوگوں کو پہنچا دیجیے۔ آپ پر تبلیغِ کلامِ الٰہی فریضۂ اولین ہے۔

دوسری حیثیت یہ ہے کہ حاملِ قرآن بنانے کے علاوہ اللہ جلّ شانہ نے آپ ﷺ

1- سورۃ المائدہ:67

کو قرآن کی تعلیم بھی عطا فرمائی، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ[1] یعنی اپنے کلام قرآن مجید کے معانی مطالب آپ ﷺ کو سکھائے اور پھر اپنی طرف سے آنحضرت ﷺ کو یہ ذمہ داری سپرد کی کہ لوگوں تک اللہ کے کلام کو پہنچائیں اور اس کے معانی کی وضاحت فرمائیں:

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ[2]

(ترجمہ:) ''ہم نے آپ پر قرآن مجید اتارا، تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس کی توضیح وتشریح فرمائیں۔''

اس طرح شرح وبیان کی ذمہ داریاں سپرد کر کے اللہ جلّ وعلیٰ نے اپنے اس رحیمانہ وعدے کو پورا کیا جو ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ[3] (ترجمہ:) ''پھر قرآن مجید نازل کرنے کے بعد اس کی وضاحت وبیان کی ذمہ داری بھی ہم ہی پر ہے'') میں مذکور ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کی ساری توضیحات لاریب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہیں اور حضور ﷺ قرآن ومطالبِ قرآن، حکمِ الٰہی کے مطابق بندگانِ خدا تک پہنچاتے رہے اور پہنچا دیا، اور جو کچھ بھی آپ ﷺ سے اس سلسلے میں ظاہر ہوا، وہ کلامِ ربانی کی تشریح وتوضیح ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے دین سے متعلق جو دو امور آپ کے سپرد کیے تھے، یعنی تبلیغِ قرآن اور تشریحِ کلامِ الٰہی، ان میں سے حضور اقدس ﷺ نے صرف ایک پر عمل کیا اور قرآن مجید کی تشریح نہیں فرمائی۔ حق تو یہ ہے کہ آپ نے حقِ رسالت ادا کر دیا، قرآن بھی عطا کیا اور قرآن مجید کی شرح یعنی اپنی ساری زندگی، جس کو سنت واُسوہ سے تعبیر کرتے ہیں، خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے پیش کر دی۔ سنت، قرآنِ مجید کی پیغمبرانہ شرح وبیان کا نام ہے، جو آیاتِ قرآنی سے الگ، مگر ان سے متعلق ہیں؛ کیونکہ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا

1- سورۃ الرحمن:2

2- سورۃ النحل:44

3- سورۃ القیامہ:44

بَیَانَہٗ [1] (پھر قرآن مجید کے معانی کی وضاحت ہم پر ہے) میں بیان کی اضافت ضمیر راجع بجانب قرآن کی طرف ہے، جس کے معنی ہوئے کہ قرآن اور چیز ہے اور قرآن کا بیان اور چیز ہے اور دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔

''لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ''میں یہ بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدۂ تبیین کی ذمہ داری حضورِ اکرم ﷺ کے سپرد کر دی ہے اور آپ جو کچھ قرآن مجید کی تشریح فرمائیں گے، وہ اگر چہ قرآن کا حصہ نہیں ہے، مگر سر تا سر (پورا کا پورا) اللہ کی طرف سے وحی والہام کے مطابق ہے اور یہ ''بیان'' دنیا کو حضورِ اکرم ﷺ کے اقوال واعمال سے حاصل ہو رہا ہے اور خود آنحضرت ﷺ کو اللہ کی طرف سے عطا ہوا، یہی اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ قرآن مجید کے علاوہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے جو غیر معجزانہ کلام ظاہر ہوتے ہیں، اُن کا مدار بھی کلامِ الٰہی ہے اور کسی کو شک واختلاف کا حق نہیں ہے۔

❖❖❖❖❖

1- سورۃ القیامہ:19

باب دوم:
''فہمِ قرآنی اور نورِ نبوت''
(تشریحاتِ قرآنی، حدیث کی اصلاح، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی اہمیت)

ہم بتا چکے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کے ساتھ اللہ کی طرف سے اس کی تفسیر بھی دنیا والوں کو عنایت فرمائی اور اس باب میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو کچھ بھی منقول ہوگا، وہ سب کا سب قرآن فہمی کے لیے لازم ولابُدیٰ (ضروری) ہوگا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی تشریح کا حق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تھا اور اللہ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے ذمے دار بنائے گئے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کی تشریح تین طرح فرمائی، اوّل: اقوال، دوم: افعال اور سوم: تقریر، یعنی آپ نے زبانِ مبارک سے حکم دیا کہ فلاں کام کرو اور ان دوسرے کاموں سے باز رہو۔ اس کو اصطلاحِ شریعت میں ''قولی سنت وقولی حدیث'' کہتے ہیں۔

دوم یہ ہے کہ آپ نے صحابۂ کرام کے سامنے کوئی کام کیا، جسے صحابۂ کرام دیکھ کر خود عمل کرنے لگے اور دوسروں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مقدس عمل سے باخبر کیا۔

تیسری صورت یہ تھی کہ درس گاہِ نبوت کے کسی طالب علم نے کوئی کام کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو منع نہیں فرمایا، تو سمجھا گیا کہ یہ کام درست تھا، ورنہ اپنے کسی جاں نثار متعلّم کو غلط روی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً روک دیتے یا خبردار کرتے۔

اسی شرحِ دین و بیانِ قرآن کا نام "سنت" ہے اور اس سنت کی مذکورہ تین قسمیں [1] ہیں۔ از منۂ سابقہ میں کسی مسلمان نے سنتِ نبوی ﷺ کا انکار تو نہیں کیا، لیکن عہدِ حاضر کے چند فرنگی مُلا اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہیں۔

حدیث کی اصطلاح:

سنت، قرآن مجید کے بیان کا دوسرا نام ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کے اقوال و اعمال اور تقریرات کو صحابہ و تابعین جب اپنی زبان میں قرآن مجید سے علیحدہ بیان کرتے ہیں، تو ان کو "حدیث" سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ لفظ "سنت" کے مفہوم میں عمل و رواج کو زیادہ دخل تھا، اقوال و تقریرات اس سے نکل جاتے تھے۔ حالانکہ مطالبِ قرآنی کے کشف و بیان وہ بھی ہیں؛ اس لیے مفہوم میں وسعت دینے کے لیے "حدیث" کا لفظ اختیار کیا جو وسیع المعنی ہے۔ اب ہر وہ روایت جس کا تعلق حضورِ اکرم ﷺ کے اقوال و اعمال یا تقریر سے ہو، وہ "حدیث" کہلائے گی۔

سنتِ رسول ﷺ اور ہمارا فرض:

جس طرح حضورِ اکرم ﷺ کی ذات قرآن سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی، قرآن و مہبطِ [2] قرآن دونوں پر ایمان لانا رکنِ اسلام ہے، اسی طرح پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ان کی مقدس زندگی کے تابندہ نقوش کی علیحدگی ناممکن ہے۔

دنیا نے قرآن آنحضرت ﷺ سے سیکھا، لیکن حضور ﷺ نے براہِ راست اللہ تبارک و تعالیٰ سے قرآن مجید کی تعلیم پائی۔ اللہ کے معصوم پیغمبر کے لیے جائز نہ تھا کہ منشائے الٰہی کے خلاف کلامِ ربانی کی شرح فرمائیں اور نہ دنیا والوں کے لیے جائز ہے کہ منشائے

1- تین قسمیں: 1۔ قولی: حضور ﷺ کا فرمان مبارک۔ 2۔ عملی: حضور ﷺ کے اعمال مبارکہ۔ 3۔ تقریری: حضور اکرم ﷺ کے سامنے یا ان کے علم میں صحابہ کا کوئی عمل آیا، مگر حضور ﷺ نے اس سے منع نہ فرمایا۔ 12 منہ

2- مہبطِ قرآن: جن پر نازل ہوا۔ 12 منہ

نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے الگ قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

متکلمِ حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام کا مفہوم جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا ہے، وہی اصل وصحیح ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ اللہ جل شانہ نے قرآن مجید تو نازل فرمایا مگر: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (پھر ہمارے ہی ذمے اس قرآن کی تشریح بھی ہے) کا وعدہ پورا نہ ہوا، غلط ہے، معاذ اللہ! ذاتِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بدعہدی کا الزام لگانا ہے۔

''لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ'' کے اعلان نے قرآن مجید کے بیان وکشف کے حق دار سے ہمیں آگاہ کردیا۔

قرآن مجید ھدًى لِّلنَّاسِ ہے، یعنی یہ کتابِ ہدایت قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے خدا کا آخری ہدایت نامہ ہے؛ اس لیے نہ تو اللہ کا مقدس کلام معدوم ہوسکتا ہے اور نہ اس کلام کی وہ صحیح تفسیر ناپید ہوسکتی ہے، جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنت واُسوہ کے نام سے دنیا والوں کو عطا فرمائی۔ وہ دوا ازالۂ مرض کے لیے ناکافی ہے، جس کے ساتھ حکیمِ حاذق کی بتائی ہوئی ترکیب نہ ہو، وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ [1] ناممکن ہے۔

قرآن تو قیامت تک محفوظ رہے، مگر اس کی پیمبرانہ شرح گم ہوجائے، گویا اللہ کے وعدۂ ہدایت میں فرق آ گیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ [2] (کتابِ ہدایت ہم نے نازل کی اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں)۔

قرآن مجید کا دنیا میں بطورِ ذکر وہدایت محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن اپنے تمام متعلقات کے ساتھ محفوظ رہے، یعنی عربی زبان، عربی قواعد اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی قرآن مجید کے ساتھ تا ابد قائم رہیں۔

1- سورہ بنی اسرائیل:82

2- سورۃ الحجر:9

قرآن اور بیانِ قرآن یعنی سنتِ نبوی ﷺ کو محفوظ و تابناک بنا کر اللہ جلّ وعلیٰ نے تمام لوگوں کو حکم دیا کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ[1] (یعنی کلام خدا کو قبول کر کے اللہ کی اطاعت کرو اور سنتِ رسول ﷺ پر عمل کر کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو) دونوں اطاعتوں میں اگرچہ خدائے واحد ہی کی فرماں برداری ہے، لیکن کلام اللہ وسنت یعنی کلامِ رسول اللہ ﷺ میں ظاہری نسبت کا فرق تھا، ایک معجزانہ کلام ہے، جس کے مقابلے سے دنیا عاجز رہی، دوسرا غیر معجزانہ۔ ایک ظاہری وحی اور دوسری معنوی وحی ہے۔

قرآن کے ساتھ ساتھ جہاں اللہ تعالیٰ نے اتباعِ رسول کا حکم دیا، وہاں بالاستقلال سنتِ رسول ﷺ کی اہمیت ظاہر فرمائی: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[2] یعنی حضورِ اکرم ﷺ کی پوری زندگی ہمارے لیے تقلیدی نمونہ ہے، اور اللہ کی محبت کا صحیح راستہ یہ ہے کہ ہم سب حضورِ اکرم ﷺ کے نقشِ قدم پر چلیں اور ان کی قائم کردہ سنت سے اِدھر اُدھر نہ مڑیں۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ [3] (لوگو! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو، محبوبِ خدا بن جاؤ گے)۔

حضورِ اکرم ﷺ نے آیاتِ قرآنیہ کی خاموش وضاحت نہیں فرمائی، بلکہ زبان مبارک سے صریح حکم بھی دیا اور عمل کر کے لوگوں کو بتایا کہ منشائے الٰہی یہی ہے، مثلاً: صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّيْ[4]، یعنی: اللہ تعالیٰ کے حکم: وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کی تفسیر یہی ہے کہ میری طرح نماز ادا کرو۔

اسی طرح کھانے پینے کے مسائل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس حکم: وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ کی تشریح فرمائی اور منشائے قدرت میں جو چیزیں گندی اور بُری تھیں، وہ آپ نے بتادیں۔

1- سورۃ النساء:59

2- سورۃ الاحزاب:21

3- سورہ آل عمران:31

4- صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر، رقم الحدیث:631

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (1)

(ترجمہ:) ''نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دو اور رسول کی فرماں برداری کرو، اس طرح تم رحمت کے امیدوار ہو سکتے ہو۔''

نماز کی پابندی کے بعد جب کہ انسان اللہ سے اپنا رشتہ درست رکھے اور زکوٰۃ کے ذریعہ اپنے ہم جنسوں کے حقوق ادا کر رہا ہو، اطاعتِ رسول ﷺ کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ ''**کتاب اللہ حاصل ہو جانے کے بعد بھی ہم اتباعِ رسول یعنی اطاعتِ سنت سے مستغنی نہیں ہو سکتے**۔'' دوسری جگہ ارشاد ہے:

فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖٓ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (2)

یعنی ''لوگوں کو ڈرتے رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ رسول کے حکم کی مخالفت کر بیٹھیں فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے اور دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے۔''

یہ آیت منکرینِ سنت کے حق میں بڑی واضح ہے، جو کتاب اللہ کو تو مانتے ہیں مگر احکامِ رسول ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے:

فَاتَّبِعُوْہُ وَ اتَّقُوْا (3) (رسول کی پیروی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو) اور یہی اصلِ دین ہے۔

سنتِ رسول ﷺ سے انکار قرآن مجید سے انکار ہے:

آپ قرآن مجید کی احکامی آیتوں کو پڑھتے جایئے، اگر ان پر پوری صداقت واخلاص سے عمل کرنا چاہیں، تو یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب کہ آپ حدیثوں کی بیان کردہ تفصیلات کو ساتھ ساتھ قبول کریں، ورنہ قرآن کے اجمالی احکام آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتے،

1- سورۃ النور:56

2- سورۃ النور:63

3- سورۃ الانعام:155

مثلاً: صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ، اگرچہ یہ تمام الفاظ عربی زبان کے ہیں، مگر اللہ کے کلام میں اصطلاحی (تعین راہِ حق) بن کر آئے ہیں۔ ان کی تفسیر حضورِ اکرم ﷺ کی سنت میں ملے گی۔ یہ اجمال صرف عبادات میں نہیں ہے، بلکہ دیگر تمام احکامی آیتوں میں بھی ہے، مثلاً: ارشاد ہوتا ہے: السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا[1] میں چوروں کے ہاتھ کاٹ دو۔ کہاں تک ہاتھ کاٹا جائے؟ اسکی تفسیر صرف حضور ﷺ کے قول و عمل سے ممکن ہے؛ کیونکہ متکلم ہی کو حق ہے کہ اپنے کلام کی شرح بیان کرے یا پھر اس کا نامزد نمائندہ۔

خلاصۂ مقصد:

چونکہ کلام اللہ حضور ﷺ پر نازل ہوا اور آنحضرت ﷺ اس کی تبلیغ اور توضیح کے ذمے دار تھے۔ اس لیے جب تک کوئی شخص آنحضرت ﷺ سے قرآن اور قرآن کی توضیح یعنی سنت قبول نہیں کرے گا، اللہ کے حکموں پر نہیں چل سکتا اور چونکہ قیامت تک اسلام خدا کا پسندیدہ دین ہے، اسلام کی دونوں بنیادیں یعنی قرآن وسنت محفوظ رہیں گی۔ رہا کسی فرنگی مُلا کا انکارِ حدیث تو بہر حال شپرہ چشمی (سورج کی روشنی میں آنکھیں بند رکھنے) سے آفتاب بے نور نہیں کہلا سکتا۔ آج انکارِ حدیث کے فتنے سے مؤمنین کے ایمان میں مزید جلاء وقوت پیدا ہوگئی ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کی صداقت پر ایک دلیل کا اضافہ ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس گروہ کے ظاہر ہونے کی خبر دے دی تھی، جو کتبِ حدیث میں موجود ہے جس کا جی چاہے ابوداود و ترمذی کے کسی نسخے کو اٹھا کر دیکھ لے۔

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوشِكُ رَجُلٌ مِنكُمْ مُتَّكِئًا عَلَى أَرِيكَتِهِ يُحَدِّثُ بِحَدِيثٍ عَنِّي، فَيَقُولُ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللهِ فَمَا وَجَدْنَا فِيهِ مِنْ حَلَالٍ اسْتَحْلَلْنَاهُ، وَمَا وَجَدْنَا فِيهِ مِنْ حَرَامٍ حَرَّمْنَاهُ، أَلَا! وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللهِ مِثْلُ الَّذِي حَرَّمَ اللهُ أَلَا! إِنِّي

1- سورۃ المائدہ:38

أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ(1)

ترجمہ: ''حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ مستقبل میں ایک شخص تمہارے درمیان اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہوئے ہماری حدیثوں کا ذکر کرے گا اور پھر کہے گا کہ لوگو! ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن مجید ہے، اس میں جو کچھ ہم حلال پائیں حلال قرار دیں اور جو کچھ حرام پائیں حرام کر دیں۔ آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے رسول نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں، وہ اسی طرح حرام ہیں، جو اللہ کے حرام کرنے سے حرام ہو جائیں۔ خبردار رہو! بے شک مجھے قرآن ملا اور اس کے ساتھ اسی جیسی اور دوسری چیز بھی''۔

وہ دوسری چیز کیا ہے؟ (وہ ہے) قرآن مجید کی تفسیر اور دین کی توضیح کا حق۔ ملاحظہ فرمائیے کہ انکارِ حدیث کا فتنہ آج پیدا ہوا ہے، لیکن خدا کی طرف سے ڈرانے والے نے اپنی اُمت کو ڈیڑھ ہزار برس پیشتر آگاہ کر دیا تھا۔ یقیناً یہ پیشین گوئی قرآن میں درج نہیں ہے، لیکن واقع سے صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ یہ اس مجموعۂ وحی میں سے ہے، جو قرآن مجید کے علاوہ مگر مثلِ قرآن کے آپ کو ملا تھا۔ اگر ابدی دین کے لیے صرف قرآن مجید کافی ہوتا، تو پھر نزولِ قرآن کے لیے 23 سال محنت محض لغو اور فضول تھی، یہ کام چند ہفتوں اور مہینوں میں انجام دیا جا سکتا تھا۔

جس طرح آج کوئی شخص چند مہینوں میں پورا قرآن مجید حفظ کر لیتا ہے، اور چند گھنٹوں میں اس کی تلاوت سے فارغ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے بھی نزولِ قرآن کے سلسلے میں حفظ و تلاوت کی موجودہ مدت کافی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ قرآن کی تعلیم، نزول بتدریج ہوئی اور 23 سال کی طویل مدت میں، یہ مقصد پورا ہوا، اس لیے کہ قرآن کتاب کی صورت میں بہت مختصر ہے، مگر جب اس کی پیمبرانہ شرح کی جاتی ہے اور اسوۂ رسول ﷺ اس کتابِ مقدس کا تکملہ بنتا ہے، تو یہی مختصر مجموعہ پھیل کر 23 سال کی طویل مدت کو محیط ہو

2- سنن ابن ماجہ، باب تعظیم حدیث رسول اللہ ﷺ، رقم الحدیث: 12

جاتا ہے۔نزولِ قرآن کے لیے یہ طویل مدت صرف حدیثوں کی روایت سے قدرت نے تجویز کی۔

گذشتہ تفصیل کے بعد کسی صاحبِ بصیرت کے لیے درست نہیں ہے کہ درایت یا روایت کی بنیاد پر حدیثوں کی اہمیت کا انکار کرے؛ کیونکہ قرآن وسنت دونوں حقیقتاً اللہ جلّ وعلیٰ کی طرف سے ہیں، اور دینِ حق کے اہم اجزاء ہیں۔سنت تمام قرآن کو محیط ہے بخلاف قرآن مجید (کے، کہ وہ) زیادہ تر اصولی ہدایت عطا کرتا ہے اور وہ تفصیلات اس میں موجود نہیں ہیں، جو حدیثوں سے حاصل ہوتی ہیں اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو گھیرے ہوئے ہیں۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمادیا کہ حضورِ اکرم ﷺ ہی کی ذات گرامی سے لوگوں کو دونوں فائدے ''تزکیہ وتطہیر اور کتاب وحکمت کا علم'' حاصل ہوں گے۔

يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ(1)

(ترجمہ:) ''آپ لوگوں کا تزکیہ بھی کرتے ہیں اور کلام اللہ وحکمت کی تعلیم بھی دیتے ہیں''۔

مندرجہ بالا کسی جگہ اس آیت کریمہ کی تفصیل گزر چکی ہے، یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔مگر اتنا بتادینا ضروری ہے کہ تزکیۂ نفوس اور تعلیمِ کتاب دو جداگانہ امور ہیں، ایک شخص قرآن مجید کو یاد کرلے اور اس کو قرآن کے لغوی معنی پر عبور حاصل ہو، اگر تزکیۂ نفس میسر نہیں تو وہ ہرگز راہ یاب نہیں ہوسکتا۔ہمارے سامنے ایسے بیسیوں مستشرقینِ یورپ وایشیا کی مثالیں موجود ہیں۔

کتاب اللہ کی تیز تجلیات سے کبھی انسانی عقل خِیرہ (حیران) ہوکر صحیح راہ سے الگ ہوسکتی ہے اور اس کے حق میں قرآن مجید يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا کے بدلے يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا کا اثر پیدا کرتا ہے۔اگرچہ اس کا امکان بھی ہے کہ صرف قرآن سے وابستگی کسی صالح فطرت انسان کو راہِ ہدایت پر قائم رکھے اور يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا کا وعدہ اس کے لیے ظاہر ہو، لیکن

1- سورہ آل عمران:164

ان دو گونہ خطرات میں راہِ راست حاصل کرنے کے لیے تزکیۂ نفس ایک ایسا نسخۂ کامیابی ہے، جس کی وجہ سے انسان کے لیے گم گشتگی (راستہ بھولنے) وضلالت کا امکان نہیں رہتا، اور تزکیۂ نفس کا سامان حدیثوں میں ہے، تزکیۂ نفس، حدیثوں، اتباعِ رسول اور اسوۂ پاک سے حاصل ہوتا ہے۔

اگر قرآن فہمی کے لیے حدیثوں کا سہارا مضبوطی سے پکڑا جائے، تو ہدایت یابی آسان ہوتی ہے۔ حدیثوں کی مدد کے بغیر کسی نے قرآن سمجھنے کی کوشش کی اور صحیح منشائے کلام تک پہنچ گیا، تو یقیناً راہِ ہدایت پر ہے، ورنہ ذہن رسا کی غلطی اور مفہومِ صحیح تک نارسائی کے بعد کسی گمراہ کے سنبھلنے کی کوئی امید نہیں رہتی۔

تعلیمِ کتاب کی صحیح افادیت تزکیۂ نفس پر موقوف ہے، جس نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صدیق بنایا اور ابوالحکم کو ابوجہل کا طوقِ لعنت پہنایا۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلاتفریق ہر کہ ومہ (خاص وعام) کے سامنے اس کی تعلیم کا اعلان کر دیا۔ دوست اور دشمن سبھوں نے اقرار کیا کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے، **مگر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اعلان کے بعد سنت کی بھی تصدیق کی اور اتباعِ رسول میں فنا ہو گئے۔** منکرین قبولِ سنت سے محروم تھے، برباد ہو گئے۔ قبولِ سنت اور اتباعِ رسول سے ایک کا تزکیہ ہو گیا دوسرا اس نعمتِ عظمیٰ سے بے بہرہ رہا۔

آج بھی کتاب اللہ کے ساتھ قبولِ سنت نہ ہو، تو وہ تزکیہ حاصل نہیں ہو سکتا، جو مؤمنین پر اللہ کی خاص عنایت ہے۔ وہ تصوف بھی الحاقی اور خارج از دین ہے، جس پر سنتِ نبوی کی مہرِ تصدیق ثبت نہ ہو۔ طریقت، شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اور شریعت، کتاب وسنت کے مجموعے کا نام ہے۔ اسی لیے صوفیائے کرام کے یہاں وہی شجرۂ بیعت معتبر ہے، جس کی سند حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک متصل ہو۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

باب سوم:
''تدوینِ حدیث''
ابتدائی دورِ کتابت میں قرآن کا مقدم کیا جانا

بعض لوگوں کو قبولِ حدیث سے انکار ہے، وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جمع وتدوینِ حدیث کا کام عہدِ صحابہ میں نہیں ہوا اور عہدِ صحابہ کے بعد بیشتر عجمی نژاد فتنہ پسند اور منافق راویوں نے اپنی طرف سے گھڑ کر حدیثوں کا پشتارا (بھاری وزن) اسلام کی معصوم پیٹھ پر لاد دیا۔ بعض راویوں نے اپنی عظمت کا محل کثرتِ روایت پر تعمیر کیا۔ حدیث سازی کے متعدد کارخانے قائم ہوئے، جہاں دین کے مصنوعی سانچے میں حدیثیں گھڑی جاتی رہیں۔ منکرینِ حدیث اپنے اس دعویٰ کی تائید میں اکثر یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ:

لَا تَكْتُبُوا عَنِّي، وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ[(1)]

''میری نسبت سے کچھ نہ لکھو، جس کسی نے میری نسبت سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو، اسے مٹا دے''۔

محدثینِ کرام کی تالیفات کتاب الموضوعات اور کتاب الضعفاء سے کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں، عوام کو کیا خبر کہ اس طریق کار میں کیا کیا مکر وفریب پنہاں ہیں! جبکہ منکرینِ حدیث روایتوں کے مَالَهُ وَمَا عَلَيْهِ سے خود بھی بخوبی آشنا نہیں۔

غلط فہمی کا ازالہ:

اوراقِ گذشتہ میں ہم نہایت تفصیل سے مدلّل بیان کر چکے ہیں کہ متکلم کے کلام کو سمجھنے کے لیے ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ مخاطب ان خاص حالات سے آگاہ ہو، جن میں یہ کلام ظاہر ہوا، ورنہ صرف کلام اپنے نفی واثبات کے اعتبار سے صحیح فائدہ نہیں دے سکتا۔ بعض حکم

1- صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقائق، باب التثبت فی الحدیث وحکم کتابۃ العلم، رقم الحدیث: 3004

خاص حالات ووقت کی بنا پر دیے جاتے ہیں، جو تبدیلِ ماحول کے ساتھ بدل جایا کرتے ہیں، مثلاً: ابتدائے اسلام میں بعض مسلمان، کافر سرمایہ داروں کے قبضے میں پڑ کر طرح طرح کی اذیتیں اٹھاتے رہے۔ بعض کو بے گناہ محض خدا پرستی کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے مخلص اصحاب یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، مگر ضبطِ غم کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ لیکن مدنی دور میں جب حالات بالکل مختلف تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے نامہ بر (پیغام رساں) کا انتقام لینے کے لیے منظم کافر حکومت کے خلاف لشکر کشی کا حکم دے دیا۔

کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ حضرت سمیہ اور یاسر کی شہادت پر خاموشی اصلِ اسلام ہے اور قاصدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقام خلافِ اسلام تھا! شروع میں مسلمان چھپ کر نمازیں ادا کیا کرتے تھے، مگر اس وجہ سے کہ مسجدِ حرام میں ادائے نماز کی استطاعت نہ تھی؛ اس لیے تا روزِ قیامت اس طرح پوشیدہ اور حرمِ پاک سے باہر نماز ادا کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ، حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ اصل حکم اس کے خلاف ہے، استتار واختفا (چھپے رہنا) بعض ناسازگار ماحول کا نتیجہ تھا۔

اصل یہ ہے کہ امر و نہی کے جو احکام تقاضائے وقت وحال سے تعلق رکھتے ہیں، وہ ہمیشہ بدلتے ہوئے ماحول میں بدل جایا کرتے ہیں۔ اسی لیے متکلم کے کلام کو سمجھنے کے لیے وقت وحالت کی واقفیت بہت اہم ہے۔

کتابتِ حدیث کی ممانعت:

یہ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ آج بھی دنیا کے اکثر ممالک میں پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط فی صد (%) بہت کم ہے اور آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پیشتر اہلِ علم کی تعداد، آبادی کے تناسب سے یقیناً بہت ہی مایوس کن ہوگی۔ یہ اُن ملکوں کا حال تھا، جہاں منظم حکومتیں تھیں، مدنیت (شہریت) تھی، تنظیم تھی، ترقی تھی، مذہب تھا، مذہب سے منسوب کتابیں تھیں، ان کتابوں کو پڑھنے پڑھانے والے گروہ تھے، خاندان تھے، نسلیں تھیں۔

اس کے برخلاف، ملتِ عربیہ پر نگاہ ڈالیے، جو وطن کے لحاظ سے، رسم ورواج کے لحاظ سے، مذہب ومذہبی کتاب کے لحاظ سے، اُمّیِ محض تھی، نہ ان میں پڑھنے لکھنے کا رواج تھا نہ کوئی باقاعدہ مذہب تھا نہ کوئی مذہبی کتاب تھی، جس کی بنا پر تعلیم وتعلم کا رواج ہوتا، محض گنتی کے چند آدمی تھے، جو تجارتی اغراض سے ادھر ادھر آس پاس کے ملکوں میں آتے جاتے تھے، یہ (یہی وہ افراد تھے جو) بقدرِ ضرورت کچھ لکھنا پڑھنا جان گئے تھے۔ ورنہ ان کے تمام کاروبار محض حافظہ اور یادداشت پر منحصر تھے، ملک اور خاندان کے چھوٹے بڑے واقعات، اپنا شجرۂ خاندان، گھوڑے، اونٹ اور کتوں کے نسب نامے زبانی یاد رکھتے تھے۔ عربوں کی اس مثالی یادداشت پر کوئی استعجاب کی ضرورت نہیں ہے، واقعات شاہد ہیں کہ جب کسی شخص کا کوئی حاسہ معطل ہوجاتا ہے، تو دماغ اس خاص حاسے کے فرائض بھی کسی دوسرے حاسے کے سپرد کردیتا ہے۔ ایک نابینا حاسۂ بصر سے محروم ہوکر قوتِ لامسہ میں دوسروں سے ممتاز ہوجاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی اندرونی صلاحیتیں خارجی امداد کے وقت دب جاتی ہیں اور اگر خارجی وسائل کا سہارا نہ ہو، تو فطرتِ انسانی اپنی قوتوں کو دو چند کرکے زیادہ کارآمد ومؤثر بناتی ہے۔ آج بھی جن دور اُفتادہ غیر متمدن قوموں میں قراءت وکتابت کا رواج نہیں ہے، دیکھا گیا ہے کہ ان کے حافظے لکھے پڑھے انسانوں کے مقابلہ میں اوسطاً زیادہ تیز اور قوی ہوتے ہیں۔ یہی حال عربوں کا تھا، وہ تعلیم وتعلم سے محروم تھے۔

ہر نسل نے قوتِ حافظہ کی پرورش اور پرداخت (تربیت) کی اور ہر سلف نے اپنے خلف کو یہ قیمتی ورثہ عطا کیا۔ یہاں تک کہ عرب، حافظے کے اعتبار سے دنیا میں ممتاز ہوگئے۔ اس جوہرِ ذاتی پر طبع موزوں وسخن سنجی (شاعری کے نکات سے واقفیت) نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

عرب کی فصاحت اور شعر گوئی پر غیر عربوں کو حیرت ہے کہ اس سرزمین کا بچہ بچہ شاعر تھا۔ عورتیں فصاحت وبلاغت کے میدان میں مردوں کے قدم بہ قدم تھیں، اس حیرت وتعجب

کی وجہ صرف عربوں کی تاریخ اور ان کے موروثی مزاج سے ناواقفیت ہے۔ بات یہ ہے کہ عرب قوتِ حافظہ میں فطرت کے تنہا اجارہ دار تھے۔ ان کی زبان اپنی وسعت اور ترنم ریزی میں ممتاز تھی۔ وطن، خاندان، افراد اور قوم سے متعلق کوئی ادنیٰ واقعہ بھی ہو فوراً شعر کا موزوں لباس زیبِ تن کر لیتا تھا۔ نثر کے مقابلے میں علی العموم سجع و منظوم کلام حافظہ میں زیادہ دیر پا ہوتا ہے۔ اس لیے جب کبھی کوئی واقعہ کلامِ منظوم کی شکل اختیار کر لیتا اور عربوں کی قوتِ حافظہ اس کو قبول کر لیتی، تو پھر یہ پتھر کی لکیریں تھی جو مدتوں مٹائے نہیں مٹتی، چنانچہ مرد و زن کے خزائنِ ذہن اشعارِ موزوں سے ہمیشہ معمور رہتے۔ ہر بچہ والدین کی گود میں پہنچ کر یہ دو چیزیں ذاتی ورثہ کے طور پر بلا ارادہ حاصل کرتا۔ ایک تو ذخیرۂ کلام موزوں اور دوسرے قوتِ حافظہ اور ان دونوں میراث کے سائے میں پروان چڑھنا، جوان ہونا، اس لیے فطری طور پر جاہلیت میں ہر عرب بچے کا ذہن فصاحت و بلاغت کے سانچہ میں ڈھلتا تھا، حافظے میں اشعار کے خزانے محفوظ تھے، لہٰذا ان میں ہر ایک بڑا ہو کر شاعر بذلہ سنج (خوش طبع) نظر آتا۔ آج بھی عرب نسلیں جزیرۃ العرب میں موجود ہیں، لیکن نہ وہ جاہلیت والی شاعری ہے اور نہ وہ امتیازی قوتِ حافظہ ہے، کیونکہ ماحول بدل گئے اور یاد داشت کی ضرورتیں دیگر ذرائع سے پوری ہونے لگیں۔ اس لیے فطرت نے بھی اپنے مقررہ اصول کے مطابق ان کی رفاقت کا طریقہ بدل دیا۔

اہلِ عرب کے اس تاریخی پسِ منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اب ذرا عہدِ نزولِ قرآن پر نگاہ ڈالیے۔ ان میں لکھے پڑھوں کی تعداد صفر کے قریب تھی۔ جو چند افراد تحریر و کتابت سے آشنا بھی تھے، ان میں زیادہ تر کفار تھے۔ یہاں تک کہ اسلامی تاریخ و روایت صاف بتا رہی ہے کہ کافر اسیرانِ بدر میں جو لکھے پڑھے چند قیدی تھے، ان کی رہائی کی شرط حضورِ اکرم ﷺ نے یہ قرار دی کہ ہر تعلیم یافتہ قیدی چند انصاری مسلمانوں کو کتابت کی تعلیم دے۔ یہ ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بدر کے قیدی وہ منتخب سردارانِ قریش تھے کہ جن کے قتل کے بعد بہ ظاہر جزیرۃ العرب میں اسلام کی تبلیغ

بے روک ٹوک ہوسکتی تھی۔ مگر حضورِ اکرم ﷺ خدا کا آخری پیغام لائے تھے اور اس پیغام کے مخاطب صرف عرب ہی نہ تھے کہ ان کے حافظے پر اعتماد کیا جاتا، بلکہ اس آفتابِ ہدایت کو مطلعِ حجاز سے ابھر کر ساری کائنات پر ضیا پاشیاں (روشنیاں) کرنا تھیں، اس لیے جزیۂ عرب کو زیرِ اقتدار لانے سے پہلے ضروری تھا کہ کلام اللہ کو مضبوط تحریر میں لا کر جعل وتحریف سے محفوظ کر دیا جائے۔ واقفِ اَسرارِ الٰہی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معلوم تھا کہ جزیرۃ العرب ایک دن علمِ اسلامی کے نیچے آجائے گا۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کے پھیلاؤ سے پہلے قرآن مجید کے تحفظ کا انتظام زیادہ اہم ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اسلامی فتوحات کی طرف سے ہاتھ روک کر کتابتِ قرآن کو مقدم قرار دیا کہ:

لَا تَكْتُبُوا عَنِّي وَمَنْ كَتَبَ عَنِّيْ غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ، وَحَدِّثُوا عَنِّي وَلَا حَرَجَ، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (1)

یعنی ''میری کوئی بات نہ لکھو، جس کسی نے میری نسبت سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو، اس کو فوراً مٹا دے۔ تم لوگ میری باتیں زبانی دوسرے سے بیان کرو، اس لیے کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ جس کسی نے میری نسبت سے جھوٹ بات کہی، اس کو اپنی قرارگاہ جہنم میں بنالینی چاہیے''۔

یہ ہے اصل روایت جس کے ابتدائی حصے کو منکرینِ حدیث اپنی تائید میں لاتے ہیں۔ اگر مخالفتِ رسول کی پاداش میں عقل ماؤف اور بصیرت سلب نہ ہوگئی ہوتی، تو اسی حدیث میں ان کو وہ سب نعمت ودولت مل جاتی، جو ایک مؤمن معرفتِ رسول ﷺ کی وجہ سے حاصل کرتا ہے۔

کتابتِ حدیث کی ممانعت کے اسباب:

یہ تو ایک مسلمہ واقعہ ہے جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ عرب عموماً اُمی تھے اور صحابۂ کرام میں آشنائے کتابت حضرات کا شمار اور بھی کم تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے کتابتِ

1- صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقائق، باب التثبت فی الحدیث وحکم کتابۃ العلم، رقم الحدیث: 3004

حدیث کی ذمہ داریوں سے ان کو سبک دوش کر کے ساری توجہ کتابتِ قرآن مجید کی طرف پھیر دی۔ اس طرح حفظِ کلام اللہ کا کام پورے وثوق اور یقین کے ساتھ بآسانی انجام پاتا رہا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اہلِ عرب نئے مسلمان تھے، ان کا مزاج قرآن مجید کے سانچے میں اچھی طرح ڈھلا نہ تھا۔ اس لیے کلام اللہ اور کلام الرسول کے باہم اختلاط وہم آمیز ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ جب ان کی قوتِ تمیز یہ قولِ خدا اور قولِ رسول ﷺ کے درمیان شناخت کرنے لگی، تو پھر اس حکم کے برقرار رہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ کلام اللہ کے ظاہر و باطن دونوں مطلوب تھے، لفظ و معنی کے ساتھ اس کی حفاظت فرض تھی؛ کیونکہ یہ وحیِ متلو ہے۔ لیکن حدیثیں معانی کے اعتبار سے اہم ہیں، ان کی تلاوت فرض نہیں ہے۔ لہٰذا الفاظ میں اگر کوئی ادنیٰ تغیر ہو بھی گیا، تو چنداں حرج نہیں تھا، کیونکہ حدیثوں کی بنیاد قرآن مجید پر قائم تھی، جو اپنے لفظ و معنی (دونوں) کے ساتھ محفوظ تھا۔

چوتھی وجہ یہ تھی، اگر قرآن کے ساتھ صدیوں کی کتابت جاری رہتی، تو دین کی تبلیغ اور دینیات کی تعلیم میں دشواری ہوتی۔ عہدِ رسالت ﷺ میں عرب تیزی سے اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور ان کو علمِ دین کے تحصیل کی زیادہ حاجت تھی۔ کتابتِ قرآن وروایتِ حدیث کے دوگونہ طریق کار نے اس کام کو آسان بنا دیا۔ لوگ قرآن مجید کی کچھ یا تمام نازل شدہ سورتیں یاد کر لیتے اور زبانی ان کے مطالب سے متعلق حدیثی مرویات سن کر مطمئن ہو جاتے۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ کلام اللہ الفاظ وعبارت کے اعتبار سے بہت موجز (مختصر) اور نچوڑ تھا۔ اس کے برخلاف حدیثیں جن کی بسط وتفصیل کا کوئی اندازہ ممکن نہیں؛ کیونکہ حضور ﷺ کی مقدس زندگی کے ہر لمحے کا ذکر ایک حدیث ہے۔ اگر ان کی کتابت کا حکم دیا جاتا، تو صحابۂ کرام بڑی دشواریوں میں مبتلا ہو جاتے اور یہ انسان کے بس کی بات بھی نہ تھی۔

لہٰذا قرآن کی کتابت اور حدیثوں کی روایت کا حکم دے کر بہت آسانیاں پیدا کر دیں۔

چھٹی وجہ یہ تھی کہ اگر قرآن مجید کی طرح حدیثوں کی بھی کتابت ہوتی، تو تلاوت وروایت میں بھی معانی کے ساتھ الفاظ کی رعایت رکھنی پڑتی، جو دشوار بھی تھا اور اُمتِ مسلمہ بہت سی نیکیوں سے محروم بھی ہو جاتی۔ آج ہم حضورِ اکرم ﷺ کی حدیثیں آپس میں ایک دوسرے سے بیان کرتے ہیں اور روایتِ حدیث کے ثواب سے فیض یاب ہوتے ہیں، لیکن الفاظ کی قید کی صورت میں یہ مراعات چھن جاتیں۔

ساتویں وجہ یہ ہے کہ دنیا کو یہ بتا دینا تھا کہ حدیثوں کے تغیر سے اصل دین میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ مگر قرآن میں ادنیٰ تحریف پوری عمارت کو ڈھا دے گی اور حدیثیں گھڑنے والے صدیوں کا انکار کرنے والے قیامت میں کہیں اور جگہ مقیم ہوں گے اور حدیثوں کی خدمت کرنے والے حدیثوں کو پرکھنے والے کہیں اور منزل گاہ بنائیں گے۔

آٹھویں وجہ یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کی طرح حدیثوں کی کتابت کا بھی حکم دیا جاتا، تو غیرِ کاتب صحابہ تبلیغِ دین کی سعادت سے اس وقت تک محروم رہتے، یہاں تک کہ فنِ کتابت سیکھ لیں۔ لیکن خدمتِ دین کو دو شعبوں میں تقسیم کر کے، کاتب وغیرِ کاتب تمام صحابہ بلکہ ساری امت کو تبلیغِ دین کی آسانیاں عطا کیں اور اس پیمبرانہ سعات سے مستفیض فرمایا۔

نویں وجہ یہ ہے کہ آپ نے تحفظِ قرآن کی طرف سے مطمئن ہو کر عربوں کے موروثی حافظے کو بھی کارآمد بنائے رکھا۔

دسویں وجہ یہ ہے کہ مشکوٰۃِ نبوت سے فیض پانے والے گروہِ صحابہ کو بھی ہدایت کا مرکز بنا دینا تھا، تاکہ آنے والی نسلیں اور تابعین ان فدائیانِ رسول کی اہمیت کو جانیں اور ان کے مقام کو پہنچانیں، دین کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے ان کی طرف متوجہ ہوں، تلاش و جستجو کر کے رفقائے رسول ﷺ تک پہنچیں، ان نفوسِ قدسیہ کی فدائیت، جاں نثاری، اخلاص، شدت واخوت میں استقلال و پامردی کا حق ادا کریں، اگر قرآن مجید کی طرح

حدیثیں بھی کتابی صورت میں جمع کر دی جاتیں، تو پھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک صحابی کا حال معلوم کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ لوگ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں محفوظ قرآن مجید اور مجموعۂ حدیث سے مقصد پورا کر لیا کرتے۔

آج جو صحابۂ کرام کی زندگیاں، ان کے کارنامے یاد ہیں اور اسلامی تاریخ کو دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ پر بدرجہا برتری حاصل ہے، اس کی بنیاد یہی حدیثیں ہیں۔ اگر زبانی روایتِ حدیث کا رواج نہ ہوتا، تو لوگ صحابۂ کرام کی جستجو نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کے اس مبارک عطیہ سے عملاً محروم رہتے:

وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ [1]

(ترجمہ:) ''جنت کے حق دار مہاجر و انصار صحابہ ہیں اور جو لوگ ان پاک ہستیوں کی سچی پیروی کریں وہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے''۔

یہ دس باتیں ایک منصف مزاج کے قلب کے لیے کافی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں قرآن کی کتابت کا حکم دیا اور حدیثوں کی کتابت سے منع فرماتے ہوئے زبانی روایت کی طرف متوجہ کیا، عاقل وفہیم کے لیے یہ مصلحتیں بہت گراں قیمت اور بیش بہا ہیں۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

1- سورۃ التوبہ:100

(کتابتِ حدیث کے چند ابتدائی نقوش اور زبانی روایتِ حدیث کے اسباب اور اس کی اہمیت)

فہمِ کلام کی شرائط کے ذکر میں یہ بات گزر چکی کہ معانی کا صحیح علم اسی وقت ممکن ہے، جب کہ کلام کا موقع ومحل اور وقت وحالات معلوم ہو؛ کیونکہ بعض باتیں وقت وحالات سے متعلق ہوتی ہیں، ماحول کے بدل جانے کے بعد ان کا پہلا اثر اور حکم باقی نہیں رہتا۔ کتابتِ حدیث کی ممانعت بھی بعض حالات کے تحت مخصوص مصالح کی وجہ سے تھی۔ جب خوفِ التباس دور ہو گیا، صحابۂ کرام قرآنِ مجید کے طرزِ بیان کو اچھی طرح پہچاننے لگے، کاتبوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور اب اگلی سی مشقت ودشواری باقی نہ رہی، تو پھر وہ حکم بھی بدل گیا، جو کسی خاص ماحول پر مبنی تھا۔ چنانچہ رسول ﷺ سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ آنحضرت ﷺ کے اقوال بھی لکھے جانے لگے اور وہ پہلی سی قید وبند نہ رہی۔

(مثلاً:) جب ابوشاہ نے درخواست کی کہ خطبۂ مبارکہ ان کو لکھ کر عنایت ہو، تو آنحضرت ﷺ نے صحابۂ کرام کو حکم دیا کہ میرا یہ خطبہ ابوشاہ کو لکھ کر دے دو۔ [1] یہ خطبہ یقیناً قرآن مجید سے الگ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ جو ایک مشہور صحابی ہیں، حضورِ اکرم کے اقوال سُن کر لکھ لیا کرتے تھے، [2] ان کے اُس مجموعۂ احادیث کا نام ''صادقہ'' تھا۔ [3] محدثین میں یہ صحیفہ مقبول ہے۔ ائمۂ اربعہ نے اس مجموعے کی روایتوں کو دلیل بنایا ہے۔ خود حضرت علی کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا، جس میں حدیث لکھی ہوئی تھی، [4]

1- صحیح بخاری، کتاب فی اللقطۃ، باب کیف تعرف لقطۃ اھل مکۃ، رقم الحدیث:2434

2- مسند احمد، کتاب الحج، باب تحریم مکۃ وصیدہا، رقم الحدیث:6510

3- جامع بیان العلم وفضلہ، باب ذکر الرخصۃ فی کتابۃ العلم، رقم الحدیث:394

4- صحیح بخاری، کتاب فضائل المدینۃ، باب حرم المدینۃ، رقم الحدیث:1870

حضرت عمرو بن حزم اور بعض دوسرے صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقۂ دیت، فرائض اور سنن سے متعلق تفصیلی احکام لکھوا کر دیے تھے۔ (1) حضرت عبد اللہ بن مسعود کی ایک کتاب تھی، جس میں انھوں نے خود حدیثیں لکھی تھیں۔ (2)

یہ چند مثالیں محض ثبوت کے لیے بیان کی گئیں، ورنہ واقعات بتاتے ہیں کہ اور بھی دوسرے صحابہ سے حدیثوں کی کتابت ثابت ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کو حضور کے زمانے میں صحابہ سے زیادہ کسی نے سمجھا ہو! حقیقت تو یہ ہے کہ ہر امر و نہی کا صحیح علم صحابہ کو تھا اور دنیا کو صحابہ کی وساطت سے حاصل ہوا، اس لیے کسی کا یہ کہنا کہ حدیثیں قرنِ اوّل یعنی عہدِ صحابہ میں نہیں لکھی گئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ممانعت وقتی مصلحت پر مبنی نہ تھی، یہ سراسر غلط اور واقعات سے لاعلمی ہے۔

زبانی روایتِ حدیث:

اس میں شبہ نہیں کہ قرنِ اوّل میں کتابتِ حدیث کا عام رواج نہ تھا۔ ساری توجہ کتابتِ قرآن مجید پر مرکوز تھی۔ پھر صحابہ کی ایک جماعت سے جمع و کتابتِ حدیث ثابت ہے اور آگے چل کر تحفظِ قرآن کی طرف سے اطمینان ہو گیا، تو ہر دور میں حدیثوں کی کتابت، روایت اور جمع و ترتیب عام ہو گئی، کیونکہ حدیثوں کی اہمیت کو صحابہ اور ان کے بعد مؤمنین مخلصین اچھی طرح جانتے تھے اور قرآن مجید کے ساتھ ان کا تعلق تفسیر و تکملہ کا تھا۔ (3) منعِ کتابتِ حدیث میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں قرآن مجید کی طرف توجہ دلائی، وہاں زبانی روایتِ حدیث کا حکم دیا اور وضعِ حدیث سے ڈرایا، تاکہ قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثیں بھی اُمت تک پہنچیں اور ضائع نہ ہوں۔ اگر صرف قرآن مجید ہدایتِ خلق کے لیے کافی ہوتا، تو ہرگز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روایتِ حدیث کا حکم نہ دیتے۔

1- جامع بیان العلم وفضلہ، باب ذکر الرخصۃ فی کتاب العلم، رقم الحدیث:392

2- جامع بیان العلم وفضلہ، باب ذکر الرخصۃ فی کتاب العلم، رقم الحدیث:399

3- قرآن متن ہے حدیثیں شرح ہیں، متن کی حفاظت شرح پر مقدم ہے۔ 12 منہ۔

اگر کوئی شخص یہ خیال کرلے کہ قرنِ اول کے ابتدائی دور میں حدیثوں کی عام کتابت ممنوع تھی اور صرف زبانی روایتیں ہوتی تھیں۔ اس لیے سہو ونسیان کا اندیشہ ہے اور حدیثوں کی محفوظیت پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا اور جو چیزیں بطورِ خود اطمینان بخش نہ ہوں، وہ بنائے دین نہیں بنائی جاسکتیں۔ اس لیے حدیثوں کو خلط والتباس کی وجہ سے رد کردینا چاہیے۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے شبہات تہاون (حقیر سمجھنے) واستخفافِ حدیث (ہلکا جاننے) کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، صحابہ کے مزاج اور اہلِ عرب کے موروثی حافظے سے ناواقفیت کی بنا پر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رفقائے رسول ﷺ وہ یگانہ ویکتا افراد ہیں، جو نبی اُمی ﷺ کے سوا کسی اور رسول و نبی کو نہیں ملے۔ دین کی تکمیل ہورہی تھی اور نبوت ورسالت پر اب آخری مہر لگائی جانے والی تھی۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے خزانۂ قدرت سے حضور کے گرد ایسے نفوسِ قدسیہ کو اکٹھا کردیا، جو تبلیغ واشاعتِ دین میں بے مثال جوہر دکھائیں اور کلام اللہ کے ساتھ ہر قول وعملِ رسول ﷺ عامتہ الناس تک پہنچادیں۔ خود ان کا حال یہ تھا کہ مشکوٰۃِ نبوت سے نکلی ہوئی ہر شعاع کو اپنے دل میں سمو لیتے تھے، اپنی پاک زندگیوں پر اُتار لیتے تھے اور دوسروں کو اسی روشنی میں منور ہوجانے کی ہدایت کرتے تھے۔ قرآن مجید کی جو تفسیر حضور سے حاصل کرتے، دوسروں تک قرآن اسی تفسیر کے ساتھ پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اس امکان کے پیشِ نظر کہ شاید کوئی صحابی روایتِ حدیث میں غلطی کررہا ہو، یا بعض اجزائے حدیث اس کے حافظے سے نکل گئے ہوں، خود صحابہ بنظرِ احتیاط ان حدیثوں کے قبول کرنے میں بہت محتاط تھے اور اس وقت تک کوئی روایت قبول نہیں کرتے تھے، جب تک کہ اُس کی تائید وتصدیق دوسرے کسی صحابی سے حاصل نہ ہوجائے۔

حضورِ اکرم ﷺ صفِ انبیاء میں آفتاب کی طرح ہیں کہ آپ کی تجلیات میں ان کی تعلیمات چھپ گئیں، لیکن صحابۂ کرام کے درمیان ماہِ روشن کے مثل ہیں۔ کبھی آپ تنہا نظر نہ

آئے، بلکہ ہمیشہ آپ کے گرد جاں نثاروں کا جھرمٹ رہا۔ اس لیے آپ کی کوئی حدیث یا اس کے اجزاء کسی ایک صحابی کے حافظے سے نکل گئے، دوسروں کی یاددہانی نے اہلِ علم کو واپس یاد دلا دیے، اسی لیے ایسا کوئی بیان نہیں ملتا کہ ایک صحابی کی روایت کی تصدیق عند المطالبہ کسی صحابی سے نہ ہوتی ہو، اس کے علاوہ اصحابِ کرام میں ایک ایسی جماعت بھی تھی، جن کا کام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسجدِ نبوی میں دربارِ رسالت سے وابستہ رہیں اور حضور کے چشم و ابرو کے ہر اشارے کو یاد رکھیں اور عمل پیرا ہوں۔ اس گروہ کا نام ''اصحابِ صفہ'' ہے۔

اخیر دور میں جب اسلام پھیلنے لگا اور قرآن کی اشاعت عام ہوگئی، حدیثوں کی روایت و حفاظت کو کوئی خطرہ نہ رہا، یہی اصحابِ صفہ اپنی قیام گاہ سے نکل کر ادھر ادھر پھیل گئے۔ ان کی اس وقت تک بڑی ضرورت تھی، جب تک حدیثوں کی اشاعت نہ ہوئی تھی اور روایت میں خلط و آمیزش کے خطرات تھے۔ صحابۂ کرام محبتِ رسول ﷺ اور جذبۂ اطاعت واتباع کی وجہ سے ایک خاص مزاج کے مالک ہوگئے تھے۔ غیر حفاظِ قرآن صحابہ بھی قرآن کی آیتوں کو سن کر سمجھ جاتے تھے کہ یہ اپنے طرزِ بیان اور معانی کے لحاظ سے اللہ کا کلام ہے۔ اسی طرح جب یہ کوئی حدیث سنتے تو فوراً اس کا اندازہ کرلیا کرتے کہ یہ قولِ رسول ﷺ ہے؛ کیونکہ دینی استغراق نے ان کے اندر ایک ایسا ملکہ پیدا کردیا تھا، جس سے وہ حضورِ اکرم ﷺ کے مزاج داں بن گئے تھے، روحِ اسلام کو اچھی طرح جانتے تھے اور قولِ رسول کو پہچان لیتے تھے اور یہ کوئی ناممکن سی بات نہیں ہے، آج بھی کوئی اسکالر کسی خاص شاعر کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، تو پھر اس کے اندر یہ ملکہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے شاعر کے کلام کو دوسروں کے اشعار سے تمیز کرلے۔

یہ تو یقینی ہے کہ وضعِ حدیث کا کام کسی صحابی کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ان کی پاکیزگی وقدوسیت، عظمت ورفعت کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے۔ ان کی زندگیاں دین و پیغمبرِ دین پر نثار تھیں اور ان کے کان آشنا تھے کہ حضور ﷺ کے نام پر جھوٹی روایت بیان کرنے کی سزا جہنم ہے۔ صحابۂ کرام جو تقویٰ وخشیت میں منتخبِ خلق تھے اور کچھ

یاد نہ رکھیں، مگر دھمکی اور وعید کی باتیں تو کبھی فراموش نہیں ہوسکتی تھیں؛ کیونکہ یہ انسانی نفسیات اور فطرت کے خلاف ہے۔

حدیثوں کی روایت جب کہ صحابۂ کرام کے درمیان محفوظ رہیں، تو پھر اپنی کثرتِ اشاعت کی وجہ سے عہدِ تابعین میں بھی گم نہیں ہوسکتی تھیں اور ہر طالبِ حق کے لیے ممکن ہے کہ عصورِ مابعد میں لوگوں کے خلاف دینی ریشہ دوانیوں (پوشیدہ کوشش) کو معلوم کرلے اور اِنھیں مجامیعِ حدیث میں صحیح وموضوع کا انتخاب کرلے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (1)

زمانہ بدلتا رہے گا آفتاب کے طلوع وغروب سے روشنی اور تاریکی دنیا پر مسلط ہوتی رہے گی، مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک زندگی اور اس کا ہر تابناک نقش دلِ مؤمن میں کبھی مدھم نہیں ہوسکتا۔ یہی وہ اُسوہ ہے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کے لیے رہتی دنیا تک منارِ ہدایت بنایا ہے تا کہ ''لاالٰہ الّا الله'' کی تفسیر ''أَطِيعُوا الله'' میں ہو اور ''مُحَمَّدٌ رَّسُولُ الله'' کی تفسیر ''اطیعُوا الرَّسُول'' سے میسر آئے۔

❖❖❖❖❖

1- سورۃ الاحزاب:21

باب چہارم:
''حدیثوں کی کتابت اور ان کی اشاعت''
(عہدِ رسالت میں، عہدِ صحابہ میں)

اسلام کا کمال اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی عظمت اسی ایک بات سے ظاہر ہے کہ دنیا میں بکثرت ہادیانِ خلق و مُصلحانِ عالَم آئے کہ آج اُن میں سے بعض مقدس حضرات سے منسوب گروہ، کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، ان کو زمین کا اقتدار حاصل ہے، فطرت کے خزانوں پر دسترس ہے، مگر یہ اپنے بانیانِ مذہب کی سوانح حیات سے نا آشنا اور محروم ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام آغوشِ مادر میں اعلانِ نبوت کرتے ہیں اور تقریباً 30 سال کی عمر میں دنیا والوں سے رخصت ہوتے ہیں، مگر اس تیس سالہ دورِ نبوت وتبلیغ کی نہ تفصیل معلوم ہے نہ اجمال۔ عیسائیوں کے پاس سوانحِ مسیحی کا حصہ غلط یا صحیح جو کچھ بھی ہے، وہ دو تین سال کے واقعات پر مشتمل ہے، نہایت ناقص ہے، نامکمل ہے، چند قصوں اور حکایتوں کے علاوہ سوانحِ مسیحی کے اجزاء نہیں ملتے۔ حیاتِ مسیح ایک راز ہے، ایک پہیلی ہے، ایک مسٹری (Mystery) ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام روزِ ولادت سے عنفوانِ شباب (عینِ جوانی) تک قصرِ فرعون میں پرورش پاتے ہیں، شکوہ وشوکت کی زندگی ہے، متکبر وجابر بادشاہ کے متبنّیٰ ہیں۔ پھر یہاں سے نکل کر وہ مدین میں مقیم ہوتے ہیں۔ پیغمبرِ وقت حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ ایک طویل مدت وہاں گزار کر پیمبرانہ جاہ وجلال کے ساتھ وارِدِ مصر ہوتے ہیں، پھر کئی لاکھ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر وادئ تیہ میں داخل ہوتے ہیں، بڑی عمر پائی، معجزات کی کمی نہیں، رفقاء بے شمار ہیں اور زندگی کا کوئی حصہ کسی ایسے ماحول میں نہیں گزرا کہ تفصیلی حالات کا اندراج وتذکرہ غیر متوقع خیال کیا جائے۔ مگر ہزار

افسوس کہ اس مقدس کلیم اللہ کے پورے واقعاتِ زندگی وسوانحِ حیات تو ہم تک کیا پہنچے، آٹھ دس لاکھ اسرائیلیوں کو غلامی سے نجات دلانے والے پیغمبر اپنے لاکھوں لاکھ پیروؤں کے درمیان وفات پاتے ہیں، مگر کچھ مدت بعد جب کہ موجودہ توریت کی نئی ترتیب وتدوین ہوئی، کسی اسرائیلی کو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر تک کا نشان معلوم نہ تھا اور نہ آج تک دریافت ہوسکا۔

یہ ہے سلسلۂ اسرائیلی کے دو جلیل القدر رسولوں کا حال، جو صاحبِ شریعت بھی تھے اور صاحبِ معجزات بھی اور جن کی ولادت و پرورش قدرتِ خداوندی کے خاص مظاہر تھی اور آج جن دونوں کے ماننے والے علم واقتدار کے لحاظ سے ساری اقوامِ عالم میں ممتاز وسر فراز ہیں۔ دوسری طرف پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں، جو پیدا ہوئے اُمی قوم کے درمیان، گھرانہ کوئی متمول نہیں، باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ چکا ہے، اسی بے سروسامانی میں ان پڑھ لوگوں کے درمیان آپ بڑھے، جوان ہوئے اور ایک دن آپ نے مرادِ ملائک، مقصودِ جبریل اور محبوبِ خدا ہونے کا اعلان فرما دیا۔ آپ کے جِلو (ہمراہی) میں دس لاکھ اسرائیلی ہیں نہ پڑھے لکھے رفیقوں کی جماعت، مگر آفتاب کی ضیا پاشیاں نہ تو فلسفیانہ دلائل کی محتاج ہیں اور نہ سائنسی تحقیق کی، آفتاب روشن ہے اس لیے کہ تنویر اس کی فطرت ہے، چمن کا ہر پھول، گلشن کی ہر کلی، درخت کا ہر پھل، جواہرات کے رنگ، بادلوں کی پرواز اس پر گواہ ہیں کہ نظامِ عالم میں ہر شے کی نمود ونمو تابشِ آفتاب کی رہینِ منت ہے اور صفحۂ کائنات پر وقائع آفتابی مندرج ہیں۔ رسولِ عربی روحی فداہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے 23 سالہ دورِ تبلیغ کا ہر گوشہ کتابوں میں مرقوم، زبانوں پر جاری اور دلوں میں محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ قبلِ بعثت کے 40 سالہ دور کے اہم واقعات بھی لوگوں کی یاد سے فراموش نہ ہوئے۔ قبلِ بعثت کی زندگی بھی اتنی تابناک تھی کہ آئندہ پیمبرانہ دور کی تعمیر اس پر سیدھی کھڑی رکھی جا سکے اور بحکمِ خدا آپ نے اپنی پہلی زندگی دعوائے نبوت پر دلیل بنا کر پیش کی ہے۔

اگلے انبیا کی سوانح اگر ہم تک نقل ہو کر نہ پہنچ سکیں تو کوئی نقصان نہیں، لیکن خاتم

النبیین ﷺ کی پاک زندگی کا کوئی گوشہ اگر حافظۂ خلق سے فراموش ہو جاتا، تو لاریب دین کے کمال اور نعمت کے اتمام میں فرق آجاتا اور اس کی دوبارہ یاد، موت سے پہلے ناممکن تھی۔ اللہ بزرگ و برتر کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں دین عطا کیا، تو کامل اور نبی ﷺ بھیجا، تو اکمل جس کی لائی ہوئی وحی بھی محفوظ ہے اور بسر کی ہوئی زندگی بھی یاد ہے۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور روایتِ حدیث:

سابقاً گزر چکا ہے کہ عہدِ رسالت کے ابتدائی ایام میں خصوصی مصالح کی وجہ سے کتابت، قرآن مجید تک محدود تھی اور حدیثوں کے لیے زبانی روایت کا حکم تھا، جو لوگ آپ کے مبارک قدموں سے وابستہ تھے، ان کو حقیقتاً روایت کی ضرورت بھی نہیں تھی، صبح و شام آپ کی خدمت میں حاضری سے ہر امر و نہی کی واقفیت براہِ راست حاصل تھی۔ پھر بھی زبانی روایتِ حدیث کا اشارہ صحیح حدیثوں کی اہمیت کی طرف تھا: »حَدِّثُوْا عَنِّيْ «، (ہماری نسبت سے حدیثیں بیان کرو) کا ارشاد، صاف بتا رہا ہے کہ ہدایتِ عالم کے لیے آپ کی حدیثوں کا منصب کیا ہے، آپ کی پاک صحبت اور مقدس رفاقت میں رہ کر جو لوگ آپ کا رنگ اختیار کر رہے تھے، وہ نجومِ ہدایت ہیں جنھوں نے نورِ مبین سے کسبِ فیض کیا تھا۔ اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ[1] اگر اسوۂ رسول اور احادیثِ نبوی کی روایت کا حکم نہ ہوتا، تو نئے آنے والے اور آئندہ نسلیں صبغت اللہ سے محروم رہتیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کی زندگی کا گہرا رنگ صرف انھیں تک محدود رہتا، جو آپ کے آستانہ پر حاضر ہو کر فیض یاب ہوتے رہے، جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا، اس کے مقابل عمل پیرا ہوئے اور جو کچھ آپ نے کیا، عملاً اس کی موافقت کی، آخری دین کے پیغمبر کی حیثیت سے ایک طرف یہ حضور ﷺ کا فرضِ منصبی تھا کہ اپنی روشن زندگی کی تمام شعاعیں اس آخری انسان تک بھی پہنچانے کا انتظام کریں، جو قیامت کے کنارے کھڑا ہے اور صحابۂ کرام بھی آخری رسول کے پہلے متبعین کی حیثیت سے اس کے پابند تھے کہ حیاتِ مقدسہ کا کوئی پہلو آنے والوں

1- جامع بیان العلم وفضلہ، باب جامع بیان ما یلزم الناظر فی اختلاف العلماء، رقم الحدیث: 1684

سے چھپا کر نہ رکھیں۔اسی لیے ارشاد ہوا:

قَالَ رسول الله صلى الله عليه وسلم يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تحرِيفَ الْغَالِينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الجَاهِلِينَ (1)

(ترجمہ:) ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: اس بزرگ علم کی ذمہ داری ہر آنے والی نسل کے عادل وثقہ لوگ اٹھائیں گے، غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پسندوں کی من گھڑت اور ناواقفوں کی غلط تاویل کو دور کریں گے''۔

تاکہ حضورِ اکرم ﷺ کی حدیثیں ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں کی رہنمائی کرتی رہیں۔

چنانچہ ابتدا میں محض زبانی روایتوں کا رواج تھا، مگر جب رکاوٹیں دور ہوگئیں، صفِ اصحاب میں لکھے پڑھے حضرات کی تعداد بڑھ گئی اور کلام اللہ اور کلام الرسول کے اندازِ بیان میں لوگ امتیاز کرنے لگے، تو زبانی روایتوں کے ساتھ ساتھ زمانۂ رسالت ہی میں کتابتِ حدیث کی بنیاد پڑ گئی اور خود آنحضرت ﷺ نے بھی قرآن مجید کے علاوہ اپنے بعض خطبات اور فرامین لکھوا کر صحابہ کو دیے۔

کلام اللہ وکلامِ رسول میں خلط والتباس کا خوف محض پیش بینی (دوراندیشی) وخطرہ کی حد تک نہ تھا، بلکہ اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بعض صحابۂ کرام نے قرآنی آیتوں کے ساتھ اپنے مصاحف میں تفسیری حدیثوں کو بھی جگہ دے دی تھی، جس کا اثر ممکن ہے عہدِ رسالت وعصرِ صحابہ میں ناموافق نہ ہوتا۔ مگر آئندہ چل کر بڑے خطرناک عواقب اور ہولناک نتائج پیدا کرسکتا تھا، لہٰذا حضور ﷺ نے موقع ومحل اور حالات کی رعایت سے کتابتِ حدیث کی ممانعت فرمائی اور صحابۂ کرام پورے جزم واحتیاط سے اس پر کاربند ہوئے۔ اگرچہ عہدِ رسالت ہی میں کتابتِ حدیث شروع ہوگئی تھی، مگر اس کا عام رواج نہ ہوسکا۔ صحابہ کے اخیر

1- مشکوۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی، رقم الحدیث: 248

دور میں جب اسلام اچھی طرح پھیل گیا اور اس کے زیرِ سرپرستی ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقے کے علاوہ یورپ کے کچھ حصے بھی آ گئے، تو اب اشاعتِ دین کی رفتار نئے حالات کے مطابق نئے انداز پر ہونے لگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ جب اسلام کسی نئے علاقے میں داخل ہوتا اور کوئی نیا قبیلہ اسلام میں داخل ہوتا، تو آپ اپنے جاں نثاروں میں سے کسی قدیم الاسلام صحابی کو ان کی تعلیم و ہدایت پر مامور فرماتے۔ خلافتِ راشدہ بھی اسی نہج پر عمل پیرا رہی۔ ہر علاقے کے والی یا ان کے نائبین، صحابۂ کرام میں سے مقرر کیے جاتے۔ چنانچہ نشرِ دین کے ساتھ صحابۂ کرام بھی مملکتِ اسلامیہ کے دور ونزدیک گوشوں میں پھیل گئے اور تمام اقطارِ اسلامی میں یہ نفوسِ قدسیہ مراکزِ ہدایت بن کر دین کی تعلیم وتبلیغ میں مشغول ہو گئے، زمانہ آگے بڑھتا جا رہا تھا، اسلام کی اشاعت ہو رہی تھی، مگر دیدار کنندگانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعداد تیزی سے گھٹتی جا رہی تھی۔ لوگ دور دور سے ان کی خدمت میں آتے اور اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیکھنے والوں کو دیکھ کر سعادت یاب ہوتے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حالات اور صحابۂ کرام کے واقعات سنتے، جن جن طرح کی ہدایتیں تھیں، احکام تھے اور قلب وروح کی تسکین کا سامان تھا، جو کچھ سنتے یاد کر لیتے، اور بعض حضرات ان تمام بیانات اور حدیثوں کو صحابہ سے سن کر لکھ بھی لیا کرتے، اس طرح عہدِ صحابہ ہی میں کتابتِ حدیث کا رواج تابعین میں عام ہونے لگا۔ ہاں صحابۂ کرام کے درمیان یہ تعمیم نہ تھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کافی عمر پائی اور اپنی زندگی کا مقصد روایتِ حدیث وتعلیم دین کے سوا کچھ قرار نہ دیا؛ کیونکہ اپنے دوسرے رُفقاء کے مقابلے میں روایتوں کی ذمہ داری ان پر زیادہ تھی، یہ بزرگ صحابی اہلِ صفہ میں سے ہیں۔ جس دن سے ایمان لائے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیٹھ گئے اور آخر دم تک حضرت کے ساتھ رہے، خوراک ولباس کی بھی کبھی فکر نہ کی، عہدِ خلافتِ راشدہ میں بھی کوئی سیاسی ذمہ داری ان پر عائد نہ تھی، جو تعلیم وروایت میں حارج ہو اور اللہ ورسول کے یہ فرامین ان کی نگاہوں

سے کبھی اوجھل بھی نہ ہوئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ(1)

''جولوگ ہمارے اتارے ہوئے بینات وہدیٰ کو چھپاتے ہیں، اُن پر ہماری لعنت اور لعنت کرنے والے فرشتوں کی لعنت''۔

نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: اَلسَّاكِتُ عَنْ الْحَقِّ شَيْطَانٌ أَخْرَسُ (2) یعنی: ''حق بات میں خاموش رہنے والا (گونگا) شیطان ہے''۔

اس دور میں روایت وکتابتِ حدیث پہلے کی نسبت زیادہ ہونے لگی اور متعدد تابعین نے حدیثین جمع کیں۔ مگر یہ ساری جمع وکتابت، اپنے انفرادی ذوقِ علم، شوقِ عمل، خدمتِ دین، استحفاظِ شریعت کے جذبے سے تھی، فدائیانِ اسلام، دلدادگانِ سنت، شیفتگانِ (قربان) اسوۂ نبوی بطورِ خود ''کراماً بررۃ'' بنے ہوئے حدیثوں کی جمع وتدوین میں مشغول تھے، نہ ان کی کوئی سوسائٹی تھی، نہ کوئی ادارہ، نہ اہلِ دولت کی اس میں شرکت تھی، نہ اہلِ حکومت کا تعاون، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ عمل کچھ اس انداز پر قائم ہو گیا تھا کہ آگے آگے حکومت کی مدد سے اسلام کا علَم کسی نئی سرزمین میں داخل ہوتا، پیچھے پیچھے علمائے دین قرآن وسنت کا آفتاب وماہتاب لے کر وہاں پہنچ جاتے اور اسلامی برتری وعظمت کے دونوں پھریرے ایک ساتھ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کا نعرہ بلند کرتے۔ یعنی فیروزمند اسلامی فوج عام سپاہیوں کے علاوہ اپنی صف میں ائمہ، علماء اور محدثین کو بھی جگہ دیتی، جس سے سیاسی فتوحات کے ساتھ دلوں کی تسخیر بھی ہو جاتی۔

1- سورۃ البقرۃ:160

2- بریقہ محمودیہ فی شرح طریقہ محمدیہ، ج3، ص127

صحابۂ کرام کی تعداد لاکھ کے قریب ہے، کس مسلمان کی جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ ان نفوسِ قدسیہ کو حدیث سازی کا محور قرار دے۔ قرآن کی بے شمار آیتیں، کتبِ قدیمہ کی بشارتیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں اور تاریخی واقعات اس پر گواہ ہیں کہ نہ چشمِ دہر نے انبیاء ورسل علیہم السلام کے علاوہ ایسے افراد دیکھے، نہ فرشِ زمین کو ان کی قدم بوسی کی سعادت نصیب ہوئی، اور نہ سقفِ آسمان نے سایہ فگنی کی۔ ان صحابہ میں اکثریت اہلِ عرب کی ہے اور غیرِ عرب صحابہ نسل ونسب کے علاوہ اپنی زندگی کی ہر اُٹھان میں عربوں کے برابر تھے، انھوں نے جس طرح قرآن کو سمجھا اور جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانا، ہدایت کی وہی اصل اور سند ہے؛ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سامنے اسلامی تعلیمات صرف نظری طور پر نہیں پیش کیں، بلکہ عملی مشق سے ہر صحابی کو قرآنِ ناطق اور سنتِ متحرّک بنا دیا، ان میں ہر فرد مکمل اسلام تھا، اسلام کا پیرو تھا، اسلام کا معلم تھا، اسلام کا مفسر تھا، اسلام کا شارح تھا۔

غور فرمایئے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں اگر ان بزرگوں سے ملیں، تو کیا وہ قرآن کی طرح حجت نہ ہوں گی! یہ گروہ ہم تک قرآن کے راوی بھی ہیں، رسول کی سنت کے بھی راوی ہیں، اگر حدیثوں کی روایت ان سے نامعتبر ہے، تو قرآن کی روایت کیونکر صحیح اور قابلِ قبول ہوگی۔!

حضور کی حدیثیں مختلف انداز وطرز میں بھی بزرگ روایت کرتے ہیں اور دنیائے اسلام کے دور دراز کناروں میں پہنچ کر بیان کرتے ہیں، اپنی زبان سے بیان کرتے ہیں اور اپنے عمل سے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ جو بات لاکھوں کے درمیان گردش کرے، کیا وہ ایسی ہے کہ ہم یہ کہہ کر اس کا انکار کر دیں کہ یہ باتیں عہدِ رسالت کی کتابوں میں یا تو نہیں ملتی ہیں، یا بہت کم ملتی ہیں، صحابۂ کرام راویانِ حدیث اور عینی شاہد ہیں۔ پھر ان میں سے ہر راوی صحابی کے گرد سینکڑوں تشنگانِ علم وشیفتگانِ اسلام کا حلقہ ہے۔ کیا منکرینِ حدیث کے کہنے سے کوئی شخص اتنا بے عقل واحمق بن جائے گا کہ وہ بسر وچشم، بلا دلیل وحجت یہ تسلیم کر

لے کہ ہر راوی صحابی کے گرد، یہ تمام تلامذہ منافق بے دین اور دشمنِ اسلام تھے، انھوں نے صحابہ کی بیان کردہ سنتِ رسول ﷺ کو صحیح صحیح بعد والوں تک نہیں پہنچایا۔

تلامذۂ صحابہ جن کو اصطلاحِ حدیث میں ''تابعی'' کہتے ہیں، عرب بھی تھے، عجمی بھی تھے۔ یہ کون صحیح الدماغ وصائب الرائے دعویٰ کرسکتا ہے کہ تمام عجمی تابعین یا عجمی ماؤں کی عرب اولاد کُل کی کل منافق تھی، دشمنِ اسلام تھی، محرفِ سنت تھی، واضعِ حدیث تھی، جب کہ آج بھی نئے پرانے عجمی نژاد مسلمانوں میں مخلص وفدائیانِ اسلام کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت تو حالت یہ ہے کہ بعض لوگوں کو ان عجم نژاد بزرگوں کے ساتھ زیادہ عقیدت ہے، جو شیفتگانِ (قربان) قرآن تھے۔

واقعات تو یہ بتاتے ہیں کہ اگلے عجمیوں نے اسلام میں رخنہ اندازی کی کوشش اتنی نہیں کی، جو آج دیکھنے اور سننے میں آرہی ہے۔ اگر پچھلوں نے چند حدیثیں اپنی طرف سے گھڑ لیں تو اپنا بُرا کیا۔ اہلِ ایمان واہلِ طاعت محدثین نے ان حدیثوں کا بھی پتہ لگایا اور ان گھڑنے والوں سے اقبالِ جرم بھی کرالیا، مگر آج کے عجمیت پسند، خسرو پرویز سے زیادہ اسلام کے خلاف آتش افروزی میں منہمک ہیں، اگلوں نے چند حدیثیں گھڑیں اور انھوں نے ساری حدیثوں کو رد کردیا، مگر وَاللهُ مُتِمُّ نُورِهِ (اللہ اپنے نور کو مکمل فرمائے گا)، انوارِ حدیث عام ہوکر رہے۔

حضراتِ تابعین رضی اللہ عنہم صرف اسی پر قانع نہ تھے کہ کسی ایک صحابی کے حلقۂ درس میں شریک ہوکر جو کچھ حاصل کیا وہ کافی ووافی ہے، بلکہ ایک جگہ سے فارغ ہوکر پھر دوسرے صحابی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور پھر ان سے تحصیلِ علم وروایتِ حدیث کرتے اور پیشتر کی حاصل کی ہوئی روایتوں کو ان کے سامنے پیش کرتے، تاکہ ان کی تصدیق یا دو صحابہ کے باہم طرزِ بیان کا فرق معلوم ہوجائے۔ اسی لیے حدیث کی کتابوں میں جب آپ سندِ روایت پر نگاہ کریں گے، تو آپ پر روشن ہوجائے گا کہ راویانِ حدیث کیا کیا جانفشانیاں کرتے رہے اور ایک ہی حدیث ایک ہی راوی نے متعدد شیوخ (راوی بالا ساتذہ) سے

کس طرح روایت کی ہے۔

ہر صحابی کے تلامذہ کی فہرست موجود ہے، جو حدیثوں کی تتبع کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی طرح تابعی کے شاگردوں کا حال تھا، جنھیں اصطلاح میں ''تبع تابعین'' کہتے ہیں۔ قرآن وسنت کے یہ فدائی بھی اپنے اساتذہ کی طرح ایک تابعی کی روایات لے کر دوسرے معلوم تابعی تک پہنچتے تھے اور اسی میں اپنی زندگی گزارتے تھے۔

❖❖❖❖❖

باب پنجم:
''راویانِ حدیث کے حالات''
(اسماء الرجال کے ذریعے احادیث کا تحفظ، دیگر طریقۂ کار اور احتیاطیں)

عرب، نسب و قبیلے کے دیوانے تھے، جس طرح اپنا شجرۂ نسب اور اپنے پالتو جانوروں کے نسب ناموں کو ازبر یاد رکھتے تھے، اسی طرح دوسرے قبائل عرب کے نسب وانتساب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ہر قبیلے اور اس کی مختلف شاخوں میں اچھی خاصی تعداد ایسے انسانوں کی تھی، جن کو اپنے اور دیگر قبائلِ عرب کے نسب ناموں پر کامل عبور تھا؛ اس لیے عرب راویانِ حدیث کے حالات معلوم کرنے اور محفوظ کرنے میں اس وقت کوئی دقت و دشواری نہ تھی۔

غیرِ عرب راویوں کا نشان پتہ معلوم کرنا، ان کے معاملات، طرزِ بود و ماند (رہن سہن) اور تقویٰ و دین داری کی دریافت میں بڑی دشواری ہوتی، اگر قدیم عربی معاشرت اور اس کے ہمہ گیر اثرات اور پھر اسلامی تعلقات اپنے رواجی و فطری میلان کی وجہ سے اشاعت دین میں مددگار نہ ہوتے۔ قدیم سے یہ دستور تھا، جسے اسلام نے برقرار رکھا کہ کسی قوم و قبیلے کے موالی و غلام اسی قبیلے سے وابستہ ہوتے اور ان کا تعلق اپنے آقا قبیلے کے افرادِ خاندان کی طرح سمجھا جاتا، اسلام نے اس نظریہ کو اور قوی کر دیا۔ ظہورِ اسلام کے بعد موالاتی انتساب زیادہ استوار اور محکم مساوات و ہمدردی پر قائم ہوا۔ بلکہ وہ غیرِ عرب جو داخلِ اسلام ہوتے، اپنے مبلغِ دین کے ساتھ وابستہ ہو کر ان کی طرف منسوب ہو جاتے اور اس نومسلم عجمی کی دیکھ بھال، تعلیم و تربیت، مسلمان کرنے والے اہلِ خیر افراد اور ان کے خاندان کے سپرد ہوتی۔ یہ تعلق اتنا مضبوط اور گہرا تھا کہ مابعد کے مؤرخین بھی بعض اوقات ان نومسلمین کو انتسابِ

قبیلہ کی وجہ سے نسباً اس خاندان سے شمار کرلیا کرتے ہیں۔

میری غرض سطور بالا سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ راویانِ حدیث کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرنے میں اس وقت کوئی دشواری نہ تھی۔ ہر عرب وغیرِ عرب راوی اپنے انتساب کی وجہ سے بآسانی پہچانا جاتا تھا اور حاملانِ دین ان کی پوری زندگی معلوم کرنے میں سعی بھی کرتے رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حدیثوں کی چھان بین نقد وتبصرہ کے ساتھ ساتھ راویوں کی زندگی اوران کے متعلق کامل تنقیدیں موجود ہیں۔مجہول الحال راویوں کے بیانات محدثین کے یہاں معتبر نہیں ہیں۔جس طرح حدیثیں گھر گھر جا کر روایت کی گئیں، اسی طرح راویوں کے حالات بھی پوری سعی وانہماک سے مرتب کئے گئے۔ اگر کتابتِ حدیث کا رواج نہ بھی ہوتا، تو صرف زبانی روایتیں اپنی جگہ پر وہ روشن حقیقتیں ہیں، جس سے کوئی سمجھدار وناطرفدار انکار نہیں کرسکتا۔

اسماء الرجال:

لیکن روایتوں کی جمع وتدوین کے بعد روایتِ حدیث کو استحکام وقوت مل گئی اور صحیح وموضوع کا انتخاب آسان ہوگیا، جو کمالِ اسلام کی بیّن دلیل ہے۔ اسماء الرجال پر ذخیرۂ کتب نے حدیثوں کی تصحیح وتنقید کی ایک ایسی کسوٹی مہیا کردی ہے، جس کے بعد یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ صحیح روایتیں موضوعات میں مل کر بے وقعت ہوگئی ہیں۔

تدوینِ حدیث وترتیبِ اسماء الرجال اگرچہ حدیثوں کے کامل تحفظ کے لیے اعلیٰ ذرائع انسانی ہیں، لیکن محدثین وعلمائے اعلام نے حدیثوں کو صرف روایت کی حد تک قبول نہیں کیا، بلکہ اللہ رب العزت کو اپنے حبیب ﷺ کی سنت کو زیادہ محفوظ کرنا تھا، اس لیے اسی عصر میں مفکرین کا ایک دوسرا طبقہ بھی ساتھ ساتھ خدمتِ دین میں مشغول ہوگیا۔ یہ فقہا ومجتہدین کا گروہ تھا، جو راویانِ حدیث کے بیانات پرکھ لینے کے بعد مسائلِ فرعیہ کے استنباط میں مشغول ہوا، اس طرح نہ صرف حدیثیں اور زیادہ محفوظ ہوگئیں، بلکہ اپنے تنوعِ معانی اور مختلف اثرات کے ساتھ ہم تک پہنچیں۔

ذرا عقل کی تمام کھڑکیاں کھول کر لوگ غور کریں کہ حدیثوں کے تحفظ کے لیے جو ذرائع اختیار کئے گئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص صلاحیتوں کے ساتھ اعلیٰ توفیق عطا کر کے ایک پاکیزہ گروہ کو پیدا کیا، کیا دنیا کے کسی اور علم وفن کی حفاظت کے لیے یا کسی اور رہنما لیڈر کے وقائع نگار بھی ایسے گزرے ہیں۔

یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اگر دین میں حدیثوں کی کوئی اہمیت نہ تھی، تو پھر صحابہ سے لے کر جامعینِ حدیث تک بلکہ اس کے بعد آج تک لوگوں نے اس قدر مشقتیں کیوں برداشت کیں؟ اور روایتوں کے لیے کوہ پیمائی (پہاڑوں پر چڑھنے)، دشت نوردی (جنگل میں پھرنے)، مہاجرت اور غریب الوطنی کی کیا ضرورت تھی؟ اسلام کے ابتدائی ادوار میں تصحیح احادیث کے لیے در در کی خاک چھاننا فضول وعبث تھا، اور پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانا کہ: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ [1] یعنی: ''میری نسبت سے جھوٹی روایتیں بیان کرنے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے''، غلط تھا۔ اتنی شدید دھمکی اور ہولناک وعید کسی بہت ہی اہم امر کے لیے تو درست ہے اور غیر اہم باتوں کے لیے متوازن عقل اس کو پسند نہیں کرتی۔ اگر دین کی بنا صرف قرآن مجید پر قائم رہتی، تو روایتِ حدیث کے لیے یہ احتیاط واہتمام قرینِ عقل نہیں ہے۔ ہاں یہ وعید اسی وقت درست وقابل قبول ہوتی، جب غلط حدیثوں کا اثر براہِ راست دین پر مرتب ہو رہا ہو۔ غلط وموضوع روایتیں دینِ متین وقرآنِ مبین پر غلط اثر ڈال سکتی ہیں، تو بلاشبہ صحیح روایتیں دین کی توضیح اور قرآن کی تبیین کی معاون ہوں گی، محفوظ اسلام اور محفوظ قرآن کا دعویٰ اس وقت جائز اور درست ہے، جب صحیح حدیثوں کی صحت اور محفوظیت کا یقین کیا جائے۔

جو لوگ قرآن سے حدیثوں کو علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ لوگ يُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ اللهِ وَرَسُوْلِهِ [2] (اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان جدائی پیدا کرنا چاہتے

1- صحیح البخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، رقم الحدیث: 110

2- سورۃ النساء: 150

ہیں)، حالانکہ ہم پر اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت یعنی دونوں کی اطاعت فرض ہے: اَطِیْعُوا اللہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ[1] (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو)۔

حج بیت اللہ اور روایتِ حدیث:

علمائے اعلام، محدثینِ کرام، راویانِ عظام جس طرح سال کے بیشتر حصوں میں حدیثوں کی جستجو اور طلب میں چار جانب، بعید فاصلے، پیدل اور جانوروں پر طے کرتے اور ہر اس شخص کی خدمت میں پہنچتے، جو بلحاظِ روایت وسندِ حدیث مرکزِ نبوت سے قریب تر ہو۔ موسمِ حج کے موقع پر شمعِ نبوت وروایتِ نسبت کے یہ تمام پروانے سمٹ کر بیت اللہ کے گرد جمع ہو جاتے، کعبۂ مطہرہ نقطۂ اتصال تھا، اور ہے، جہاں اقطارِ عالم کے ہر گوشے سے اہلِ دیانت برابر پہنچا کرتے ہیں۔ صحابۂ کرام تابعین اور بعد کے علماء ومحدثین کا یہ دستور رہا کہ زیادہ سے زیادہ حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کریں اور سال بھر کی متاعِ علمی یہاں کے اہلِ علم حاضرین وزائرین، کی خدمت میں پیش کریں۔

اس طریقۂ کار نے ایک طرف حدیثوں کا تصحیح وتنقید کا سامان بہم پہنچایا اور اس سے رِجال ورُواۃ کے حالات معلوم ہوتے رہے، دوسری طرف دنیائے اسلام کے کسی گوشے میں اگر کوئی دینی ودنیاوی علمی وفکری راہ پیدا ہوئی، تو اس مجمعِ عام ومرکزِ اہلِ اسلام کی وساطت سے تمام مملکتِ اسلامی میں پھیل گئی، علمائے بخارا ہوں، یا فقہائے اُندلس، شامی محدثین ہوں یا یمن وحضرموت کے اہلِ بینش (دور اندیش) ودانش، سندھ وہند کے اہلِ فکر ہوں یا روم وسسلی (صقیلہ) کے اہلِ قلم، آج سے سینکڑوں سال پہلے جب کہ کتابت وطباعت اور نشر واشاعت کا موجودہ رواج نہ تھا، رسل ورسائل کے ذرائع مفقود تھے۔ اسلامی مصنفین کی کتابیں، مجامعِ حدیث، اسماء الرجال، علمِ کلام، قرآن مجید کی تفسیریں، فقہ کی تصریحات، فلسفہ وحکمت کے کارنامے طب وسائنس کے اختراعات، ریاضی وہندسہ کی

1- سورۃ النساء:59

ایجادات کی خبریں، حجِ بیت اللہ کے طفیل میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتی تھیں، محدثین وراویانِ حدیث، حجِ بیت اللہ سے فارغ ہو کر مسجدِ حرام یا مسجدِ نبوی ﷺ میں کچھ دن اور قیام فرما ہوتے تھے، تاکہ علمِ سنت کے طلباء، روایت وتصحیحِ روایت کا کام ان کے معیارِ علم وروایت تک مکمل کرلیں۔ علمائے اسلام کا یہ مروجہ طریقہ مغربی تسلط کے ابتدائی دور تک قائم رہا، قافلۂ حجاج میں علمائے دین اور ان کے تلامذہ زیادہ شریک ہوتے۔ زیارتِ کعبہ کے ساتھ ساتھ اپنی علمی تشنگی بجھانے کی سعی کرتے، ان تمام علوم میں بہرحال حدیثوں کو بہت زیادہ اہمیت تھی، کیونکہ ان کا تعلق براہِ راست قرآن مجید اور مہبطِ قرآن ﷺ کی ذاتِ مقدس صفات سے وابستہ تھا۔

مذکورہ حالات میں کسی غیر ذمہ دار یا دشمنِ رسول ﷺ کا یہ دعویٰ کہ حدیثیں معتبر نہیں اور دین کے لیے ان کو حجت بنانا اسلام میں تحریف وتغیر ہے، کیونکہ حدیثیں نہ تو عہدِ صحابہ میں جمع ہوئیں اور نہ ان کے بعد حدیثوں کی جمع وترتیب میں کوئی قابلِ اعتماد طریقہ اختیار کیا گیا، کتنا بے بنیاد اور حقیقت سے بعید ہے۔ آج تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کی مصنفات کچھ ردوبدل کر کے اپنے نام سے مشہور کر دیتے ہیں، لیکن اسلام کے علمی عروج کے زمانہ میں مصنف اور اس کے تلامذہ اجتماعِ حج کے موقع پر لاکھوں کی موجودگی میں جس چیز کی روایت وتصحیح کر دیتے تھے، اس میں ردوبدل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ ساری حمد، اللہ کے لیے ہے جس نے قرآن نازل کیا، جو کتابِ مبین ہے، رسول بھیجا جو نورِ مبین ہیں، اور اس نور کی شعاعوں کو ہم تک محفوظ پہنچایا، تاکہ اس روشنی میں ہم زندگی گزاریں، جسم وروح کی اصلاح کریں، اے اللہ! اپنی خاص رحمت سے ہمیں سرفراز فرما اور خیر کی توفیق عطا فرما۔ آمین!

کعبۃ اللہ اور عرب:

حجِ بیت اللہ اور روایتِ حدیث کے سلسلے میں جو چند سطریں گذشتہ اوراق میں لکھی گئی ہیں، ان کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نہ تو اسلام کی ایجاد ہے اور نہ مسلمانوں کے ترقی

یافتہ تمدن کا نتیجہ، بلکہ اوّل روزِ تعمیر سے آج تک اس بقعۂ مبارکہ کی مرکزیت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ مکہ اور اس کے ملحق علاقے عربوں کے لیے مذہبی، سیاسی، قومی اور معاشی لحاظ سے بڑی اہمیت کے علاقے تھے، عہدِ جاہلیت کے عرب، موسمِ حج میں جزیرۃ العرب کے ہر کونے سے یہاں آ کر جمع ہوتے تھے۔ زیارتِ کعبہ، دینِ ابراہیمی کا ایک بڑا رکن تھا اور یہ اجتماع عربوں کا عظیم الشان تہوار تھا۔ سال بھر کے سیاسی جھگڑے یہاں آ کر بالکل سرد ہو جاتے۔ معاشی نقطۂ نظر سے ان ایام میں مکہ، بڑی تجارتی منڈی بن جاتا تھا اور اکثر اہلِ عرب اپنی سالانہ ضروریاتِ زندگی یہیں سے فراہم کرتے۔

فصحائے عرب اپنے ادبی شاہکار، اس عظیم اجتماع میں نقد و تبصرہ، مقابلہ و معارضہ کے لیے پیش کرتے اور جو کلام سب سے بہتر قرار دیا جاتا، وہ پورے جزیرۂ عرب میں پھیل جاتا اور ہر وارد و صادر کی زبان پر جاری ہو جاتا، اسی طرح قبائلی عظمت کی داستانیں، خاندانی روایات اور مآثر قومی (یادگاریں)، لوگ وہاں پہنچ کر بیان کرتے اور پورے عرب میں پھیلا دیتے۔ اسلام نے کعبۃ اللہ کی یہ افادیت قائم رکھی اور ان خرابیوں کی اصلاح کر دی، جو عربی نخوت و غرور سے پیدا ہوتی تھیں۔ اب خاندانی مباہات، قبائلی مفاخرت اور ادبی شاہکاروں کی جگہ اسلامی علوم، تفسیرِ قرآن اور روایتِ سنت نے لے لی، نسب ناموں اور قومی کارناموں کو چھوڑ کر خدائے واحد کے پرستار اسلامی کارنامے اور راویانِ حدیث کے حالات بیان کرنے لگے۔

المختصر دریائے رواں کی تمام پرانی کشتیاں ڈبو دی گئیں اور اب اہلِ عرب ایک نئے جہاز کے ناخدا بن گئے اور وہ جہاز اسلام تھا، کتاب اللہ اور حدیثِ نبوی ﷺ تھی۔ منکرینِ حدیث اگر عرب قدیم کا جغرافیہ، اہلِ عرب کی معاشرت، رسم و رواج اور ان کی نفسیات کا مطالعہ کرتے، تو آسانی سے حدیثوں کو غیر اہم اور مشکوک کہنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

باب ششم:
''حجیت حدیث''
(حدیثیں ہم تک کس طرح پہنچیں؟ صحابۂ کرام کا دور۔ روایتوں کا تسلسل۔ صحابہ، تابعین۔ عربی عجمی اور ان کی اولاد)

جو شخص حضورِ اکرم ﷺ کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے اور آپ کو خدا کی طرف سے تعلیم دینے والا اور خبر دینے والا سمجھتا ہے، اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ آپ کی بعض باتوں کو تسلیم کرے اور بعض کی دینی اہمیت کا منکر ہو اور یہ بھی عقلاً نا قابلِ قبول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے پورے دورِ تبلیغ میں جو کچھ کلام کیا، اس کا مکمل مجموعہ صرف قرآن مجید ہے اس کے علاوہ 23 سال کی طویل مدت میں کسی نے کوئی کلمہ آپ کی زبانِ مبارک سے نہیں سنا۔

یقیناً قرآن مجید کے علاوہ بھی آپ کے اقوال ہوں گے، اور بہت ہوں گے اور ہونے چاہئیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماسوائے قرآن آپ کے اقوال کیا تھے اور ان کی کوئی اہمیت تسلیم کی جائے یا نہیں؟ تو یہ جان لینا چاہیے کہ دورِ نبوت میں نبی کی ہر گفتگو بڑی اہم ہوتی ہے، اور اس کا دین سے گہرا تعلق ہوتا ہے، کیونکہ کوئی نبی اپنے زمانۂ تبلیغ میں لوگوں سے لایعنی اور فضول باتیں نہیں کرتا، وہ خدا کی طرف سے معلّم بن کر آتا ہے اور گروہِ مخاطبین کے سامنے اپنے قول و عمل کو، معیارِ دین اور اساسِ ہدایت بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ بحالتِ خواب بھی نبی رہتا ہے اور بحالت بیداری بھی، تکلم کے وقت بھی نبی ہے اور خاموشی کے وقت بھی نبی ہے۔ نبوت اس کی ذات سے کبھی الگ نہیں ہوتی، اس کے تمام طور و طریق اور

طرز و انداز پیغمبرانہ ہوتے ہیں، جن کی پیروی ہر غیر نبی پر فرض ہے۔ یہ ممکن ہے کہ نبی کی بعض ہدایات وقتی اور عصری ہوں اور انقضائے عہد کے ساتھ ان کی پیروی کا حکم بھی منسوخ ہو جائے، لیکن وہ تمام اقوال و اعمال جن کا تعلق عموم دین سے ہوتا ہے اور کسی لحاظ سے وقتی نہیں کہلا سکتے، ان ہدایات کی اتباع اس وقت تک فرض ہے، جب تک نبی کی نبوت نافذ اور مؤثر ہے اور ہر پیرو کا فرض ہے کہ اپنے پیغمبر کی ہدایتوں کو اور ان کے تمام اقوال و اعمال کی روایتوں کو اپنے سلف سے حاصل کریں اور خلف تک پہنچائیں اور یہ سلسلہ جس مقام پر پہنچ کر رک جائے یا کوئی نیا نبی ظاہر ہو کر مزید تبلیغ سے روک دے، تو پھر یہ سمجھنا چاہیے کہ اب اس خاص نبی کا دورِ نبوت ختم ہو گیا اور دنیا کو اس تعلیم کی ضرورت نہیں رہی۔

حضورِ اکرم ﷺ خدا کے آخری نبی ہیں، اس لیے اس کا امکان ہی نہیں ہے کہ کوئی دوسرا نبی ظاہر ہو کر تعلیماتِ مصطفوی کو ختم کر دے گا۔ لہٰذا اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، اول یہ کہ انسانوں کو دین و مذہب کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے تمام ہدایاتِ محمدی ﷺ کی نشر و اشاعت اور ان کی تبلیغ و تعلیم بند کر دینا چاہیے، دوم حضور ﷺ کی مدتِ نبوت ختم ہو گئی اور اب آپ کے دیے ہوئے احکام میں تنفیذی صلاحیتیں نہیں ہیں، اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں یہ دونوں صورتیں بھی غلط ہیں اور کوئی مسلمان (ان کو) تسلیم نہیں کر سکتا۔

جب تک انسان کے اندر روح موجود ہے، وہ دین و مذہب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اور حضور ﷺ کی رسالت و نبوت بھی ابدی ہے، قیامت تک کے لیے مقدر ہو چکی ہے، اس لیے آپ کی تعلیمات اور تمام اقوال و افعال کو آج بھی وہی اہمیت حاصل ہے، جو دعوائے نبوت کے پہلے روز تھی، اور ہمارا فرض ہے کہ احادیثِ مبارکہ میں پوری توجہ اور جرح و تعدیل کے بعد، اُن روایتوں کو الگ کریں، جن کی تصدیق نہیں ہوتی اور امتِ مسلمہ کو حضور سرورِ کائنات ﷺ کے احوال، اعمال، اقوال سے باخبر رکھیں۔

بحمد اللہ ہمارے محدثینِ کرام جن میں اسلاف کی بڑی تعداد شامل اور دورِ حاضر کے چند علمائے کرام نہایت باریک بینی اور حسنِ خوبی سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

کیا تمام یا اکثر مرویات غلط ہیں؟

کسی کا یہ دعویٰ کہ تمام حدیثیں موضوع ومحرف ہیں یا ان میں جعلی وغیر معتبر مرویات کی اکثریت ہے، تو اس قسم کا وہم بھی میزانِ عقل میں بے وزن اور اصولِ روایت سے قابلِ رد ہے۔ جو شخص اسلام کی تاریخ سے ناواقف اور اگلے مسلمانوں کی نفسیات سے بیگانہ ہے، وہی ایسی بے عقلی کی باتیں کہے گا۔

نہ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دینِ مبین کی تبلیغ معاذ اللہ سازشی انداز میں کی اور نہ اس کی تعلیم وترویج کا کام تہ خانوں میں چھپ کر انجام دیا، بلکہ ابتدائے نزولِ وحی سے لے کر آخری سانس تک خدا کے ہر حکم کو علی الاعلان زبانِ مبارک سے دہرایا اور اپنے قول وعمل سے اس کی برملا تصدیق فرماتے رہے۔ صحنِ کعبہ میں جا کر کہا، بوقبیس کی چوٹیوں سے للکارا، عربوں کے قومی اجتماعات کو خطاب کر کے کہا، صلح وآشتی (نرم گفتگو) سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا، شمشیر وسناں سے تبلیغِ دین میں کام لیا۔ 13 سال تک مکہ کو مرکز بنا کر ہدایت کی اور دس سال تک اُفقِ مدینہ سے عالَم پر ہدایت کے نور برسائے۔ اس لیے آپ کا کوئی قول کوئی عمل نہ پوشیدہ رہ سکتا تھا اور نہ آپ نے ان کو پوشیدہ رکھا، بدر کی فتح میں بھی آپ کی پیمبرانہ آواز بلند تھی اور اُحد کے انتشار میں بھی اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ [1] کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

صحابۂ کرام اور روایتِ حدیث:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برملا تبلیغ اور اعلانیہ احکامِ الٰہی کی تعمیل ایک امرِ واقعی ہے، ایک سچی حقیقت ہے، دوستوں کا ایمان ہے اور دشمنوں کا اقرار ہے۔ ہاں! قرآن کے بیان اور حدیثوں کی روایت میں صحابۂ کرام کی ذات تبلیغ کی دوسری منزل ہے۔ اگر ان بزرگوں نے سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم تک پہنچانے میں معاذ اللہ جعل کیا، تحریف سے کام لیا ہے، یا ادائے فرض میں کوئی کمی کی ہے، تو بلاشبہ بعد والوں کو حضور کی حدیثیں صحیح نہیں پہنچی ہوں گی۔

1- صحیح البخاری، کتاب الجھاد والسیر، باب من قاد دابۃ غیرہ فی الحرب، رقم الحدیث: 2864

مگر ذرا سوچئے تو کیا اصحابِ رسول ﷺ سے یہ ممکن بھی ہے کہ روایتِ حدیث میں وضع وتحریف سے کام لیں گے۔ ہرگز نہیں، دین میں تحریف وجعل بہت ہی فحش گناہ ہے، بلکہ سراسر کفر ولا دینی ہے، ان حضرات سے روایتِ دین و بیانِ سیرت میں غفلت وسستی کا امکان بھی نہیں ہے۔ قرآنی شہادتوں سے قطع نظر، ان اساطینِ اسلام کی ظاہری زندگیاں صداقتِ اسلام کی روشن دلیلیں ہیں، ان بزرگوں نے رضائے الٰہی اور اتباعِ رسول ﷺ میں اپنی جان و مال، آرام وسکون خویش واقارب، گھر بار لٹا دیے اور محبوب کردگار کے اشاروں پر دیوانہ وار فدا ہوتے رہے، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ صحابۂ کرام کے مزاج سے آگاہ اور ان کی سوانحِ حیات سے جو لوگ باخبر ہیں، وہ کبھی اس کی جرأت نہیں کر سکتے کہ ان قدوسیوں پر آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک چھپائے رکھنے کا الزام لگائیں، یا ان کو روایتِ سیرت میں کسی غفلت وکوتاہی کا قصوروار ٹھہرائیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ حضراتِ صحابہ نے حضور ﷺ کے تمام اقوال وافعال بے کم وکاست اپنے بعد والوں سے بیان کر دیے اور اب یہ اَخلاف یعنی تابعین کا فرض تھا کہ ان تمام روایتوں کو بحفاظت اپنے تمام پچھلوں تک پہنچائیں۔ وھلّم جرًّا

روایتوں کا تسلسل:

دنیا کی دوسری حکایات کی طرح حدیثوں کے قبول ورد کے لیے اس بات کی واقفیت بہت اہمیت رکھتی ہے کہ آیا روایتِ حدیث میں تسلسل بدستور رہا یا درمیان میں اسلام پر کوئی ایسا دور بھی آیا، جس میں روایتوں کا سلسلہ بالکل ٹوٹ گیا تھا اور اگلوں کے بیانات پچھلوں تک براہِ راست نہیں پہنچے، مثلاً: ہم تسلیم کرتے ہیں کہ صحابۂ کرام روایتِ حدیث میں بہت محتاط بھی تھے اور اس فرض کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے، لیکن عہدِ صحابہ اور زمانۂ تابعین کے درمیان کوئی ایسا دور اگر فرض کیا جائے جس میں کوئی راویِ حدیث باقی نہیں تھا، تو بلاشبہ اس صورت میں ساری روایتیں مشتبہ اور مشکوک ہو جاتی ہیں۔ کسی کڑی کا درمیان سے نکل جانا زنجیر کو ناکارہ اور بے کار بنا دیتا ہے۔ اور اب یہ حدیثیں اثری اکتشافات سے

زیادہ وقیع (قابلِ بھروسہ) نہیں ہوں گی، جو زمین کی کھدائی کے بعد دستیاب ہوتی ہیں اور ہم ان کی مدد سے مجہول التاریخ اقوام کے حالات معلوم کرتے ہیں۔ کسی واقعے کا تذکرہ مسلسل روایت سے پچھلی نسلوں تک نہ پہنچے اور اس درمیان میں خمول وگمنامی کا پردہ پڑ جائے، تو پھر کمالِ یقین کی منزل ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتی ہے۔ ظن اور تخمین اور قیاس آرائیوں کے سوا صحیح حقیقت کا نشان نہیں مل سکتا۔ حدیثوں کی روایت میں یہ مفروضہ درمیانی وقفہ دو ہی طرح خیال میں آسکتا ہے، اول اسلام کی گمشدگی یعنی اس درمیانی دور میں کوئی مسلمان باقی نہ تھا، جو حضور ﷺ کی تعلیم پر ایمان رکھتا ہو، اور آپ کی حدیثوں پر عمل کرتا ہو، دوم بلا استثناء امتِ محمدیہ ﷺ دشمنانِ اسلام کی بدترین غلامی میں اس طرح جکڑ دی گئی ہو کہ وہ کتاب وسنت پر اعلانیہ عمل کرنے سے عاجز ہو۔

بحمد اللہ اسلام اور اس کے پیرو حضور ﷺ کے مبارک عہد سے آج تک ان دونوں قسموں کی لعنتوں سے محفوظ ہیں، عیسائیت کی طرح نہ تو کبھی اسلام بالکلیہ پوشیدہ ہوا اور نہ یہودیت کی طرح مسلمانوں پر کبھی ایسی غلامی کا دور گزرا، مرکزِ اسلام یعنی حجازِ مقدس ہمیشہ سے پیروانِ اسلام محافظینِ سنت کے قبضے میں آج تک منتقل ہوتا رہا ہے۔ دیگر مسلم ممالک اپنی ناطاقتی کے بعد بھی آزادی وغلامی کے درمیان زندگی گزارتے رہے، ایسا کوئی دور نہیں آیا جس میں پوری امتِ مسلمہ تعلیمِ دین وتعمیلِ سنت سے کنارہ کش ہوگئی ہو، بلکہ ہر دور اور ہر عہد میں پاک نفسوں کا ایک گروہ پایا جاتا ہے، جو کتاب وسنت کی اشاعت بھی کرتا رہا اور پوری شدت واخلاص سے ان پر خود بھی عامل رہا۔ یہی وہ گروہ ہے، جو روایتِ حدیث میں عہدِ نبوت سے آج تک ہمارے لیے سند ہے اور مسلسل سند ہے۔ حکمِ خداوندی: طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ [1] شاہدِ عدل ہے۔

صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کا عہد:

حضورِ اکرم ﷺ سے مکمل دین ایک گروہ (صحابہ) نے لیا اور دوسرے گروہ

1- سورۃ التوبہ:122

(تابعین) تک پہنچایا۔ یہی حضرات قرآن مجید کے راوی ہیں اور یہی حدیثوں کے بھی راوی ہیں۔ ان دونوں مأخذِ دین کی روایتوں میں صرف اتنا فرق و امتیاز ہے کہ قرآن مجید زبانی اور تحریری دونوں طرح سے منتقل ہوتا رہا۔ روز وشب کی نمازوں میں اور نمازوں سے باہر بھی، اس کی بکثرت تلاوت ہوتی رہی۔ تابعی نے صحابی سے ہر آیت بار بار سنی، سن کر یاد کیا اور خود تا زندگی دہراتے رہے، لیکن حدیثوں کا معاملہ یہ نہ تھا، حدیثیں زیادہ تر زبانی روایت ہوتی تھیں، تحریری روایت بہت کم تھی۔

علمی طور پر حدیثوں کو کسی تابعی نے صحابی سے سنا اور ان پر عامل ہو گیا، عملی حدیثوں کی حفاظت کا اس سے بہتر کوئی طریقہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ قولی روایتوں کا حال عملی روایتوں سے کچھ مختلف تھا۔ راوی اپنے شیخ سے سن کر یاد کر لیتا اور پھر دوسرے راویانِ حدیث سے اس روایت کی تصدیق وتردید معلوم کرنے کی کوشش کرتا اور اطمینان کے بعد اپنے شاگردوں سے سند کے ساتھ بیان کرتا۔

مکتوب مصاحف کی روایتیں محدثین اسی وقت قبول کرتے جب کہ خود صاحبِ مصحف اپنے صحیفے سے حدیثیں بیان کرے اور ان کی یادداشت اور حافظے کی طرف سے پیشتر اطمینان حاصل کر لیا گیا ہو۔ ورنہ الف، کے صحیفے سے ب کی روایت محدثین کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ اصل راوی کے متعلق ضروری شرائط کا علم اور اس صحیفے کی اصلیت کا یقین جب تک نہ ہو، محض انتساب اور تحریر پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اگر عہدِ نبوت سے آخری صحابی کی رحلت تک کے دور کو سامنے رکھیں اور اس مدت میں تابعین رُواۃِ حدیث کی پیدائش، بلوغ اور سنِ رشد صحیح معلوم ہو، تو درایت وروایت اور گہری تاریخیت کے اصول پر بھی حدیثوں کے رد وقبول کا فیصلہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔

فنِ اسماء الرجال کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، لیکن صحابی وتابعی کے عہد کی باہم پیوستگی ایک ایسی کسوٹی ہے، جس پر روایتیں پرکھی جا سکتی ہیں اور اجمالی طور پر یقین کرنا پڑتا ہے کہ صحیح حدیثیں کثیر تعداد میں ہم تک ضرور پہنچتی ہیں، مثلاً: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سب سے پہلے مسلمان ہیں یا ان چند مؤمنین میں ایک ہیں، جن سے پہلے حضور پر ایمان لانے والے کسی شخص کا تعین آج تک نہیں ہوسکا۔ اپنے ولادت کے دن سے حضور کی وفات تک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کبھی آنحضرت ﷺ سے جدا نہ ہوئے اور جو کچھ حضور نے اللہ کی طرف سے دنیا میں کسی انسان کو سکھایا، علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس پوری تعلیم میں برابر کے شریک ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے تربیت یافتہ ہیں اور اپنے سارے علم و اعمال میں نبی آخر کے راست باز، شاگرد جانشین اور نمونہ ہیں۔ ان کی شہادت رمضان 40ھ میں ہوئی، یعنی حضور ﷺ کی وفات کے بعد پورے تیس 30 سال زندہ رہے، اس لحاظ سے وہ تمام بچے جو وفاتِ نبوی ﷺ کے فوراً بعد پیدا ہوئے، اُن کو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فیض یاب ہونے کا موقع 30 سال تک میسر آیا۔ پندرہ سال قبلِ بلوغ کی مدت اگر اس میں سے نکال دی جائے، تو پچھلے پندرہ سال درس گاہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سندِ فراغ حاصل کرنے کے لیے بہت کافی ہیں۔

خلفائے راشدین کے علاوہ عشرۂ مبشرہ میں سے بقیہ 6 اصحاب اپنے دوسرے معاصرین سے ممتاز اور افضل ہیں۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان دس جنتیوں میں سے ایک ہیں، ان بزرگ صحابی کی رحلت 55ھ میں ہوئی۔ یعنی جو بچے وفاتِ نبوی ﷺ کے فوراً بعد پیدا ہوئے، وہ 45 سال تک ان کی مقدس تربیت سے استفادہ کر سکے، اس میں سے کم سنی کے 15 سال نکال دینے کے بعد سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تلامذہ اطمینان سے پورے 30 سال تک حدیثوں کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

گذشتہ اوراق میں لکھا جا چکا ہے کہ وفاتِ نبوی ﷺ کے وقت صحابۂ کرام کی تعداد ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی اور سال بہ سال ان اکابرِ دین وملت کی تعداد بڑھنی شروع ہوئی، ابو الطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ آخری فرد ہیں، جن کی رحلت کے بعد صفحۂ گیتی (دنیا) پر کوئی صحابیٔ رسول ﷺ باقی نہیں رہا۔ یہ بزرگ اپنی تاریخِ رحلت کے لحاظ

سے آخری نبی ﷺ کے آخری صحابی ہیں، ان کی وفات 110ھ میں ہوئی، گویا سابقین فی الاسلام صحابۂ کرام کی متعدد نسلیں ان کے سامنے پیدا ہوئیں۔ حضرت عامر بن واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قدیم الاسلام صحابیوں کے بیٹے پوتوں اور پڑپوتوں تک کو جوان ہوتے دیکھا۔ اگر صحابۂ کرام کی تعداد ایک لاکھ تھی، تو عامر بن واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رحلت کے وقت صرف عرب صحابہ کی اولاد کئی لاکھ کی تعداد میں ظاہر ہے کہ مملکتِ اسلامیہ میں پھیل چکی ہوگی۔ عجمی مسلمانوں اور ان کی اولاد خلافتِ فاروقی اور اس کے مابعد زمانوں میں فتوحاتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ قلمرو (سلطنت) خلافت کی بعید ترین سرحدوں تک پہنچ چکی تھی۔ یقیناً وہ تمام نو مسلمین اوران کی اولاد سب کے سب منافق تو نہ تھے۔ ان میں ایسے دیندار بھی یقیناً بہت بڑی تعداد میں تھے اور یقیناً ہیں، جن پر صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ آج تک انسانیت کو بھی فخر ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام کی تاثیر صرف عرب نژاد مسلمانوں کے لیے مختص سمجھتے ہیں اور عجمی مسلمانوں اور عجمی راویانِ حدیث پر اعتماد نہیں کرتے، ذرا صحابۂ کرام ہی کی اولاد سے اندازہ کرلیں کہ آخری صحابی کے انتقال کے وقت ان کی کیا تعداد ہوگی، ذاتی اکتساب اور وراثت سے دینی علوم تفسیرِ قرآن اور روایاتِ حدیث کا کتنا بڑا سرمایہ ان کے پاس ہوگا۔

سچ ہے تعصب وعداوت انسان کو حق بینی وحق شناسی سے محروم کر دیتی ہے، ورنہ منکرینِ حدیث عقل وہوش کی سلامتی کے ساتھ یہ احمقانہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ حدیثوں کی اہمیت، ان کی صحت وصداقت کا مسئلہ اتنا واضح ہے، جسے ہر پڑھا، بے پڑھا، عالم عامی بہ آسانی اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

حضرت عامر بن واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر تو محض بسبیلِ تذکرہ آیا ہے ورنہ اشاعتِ حدیث اور خدمتِ دین کے لیے صحابۂ کرام اسلامی قلمرو (سلطنت) میں پھیل گئے تھے اور مختلف مقامات کو مرکز بنا کر روایتِ حدیث میں مشغول تھے۔ مشہور مرکزی مقامات میں راویانِ حدیث صحابۂ رسول ﷺ کی ایک جماعت رکھتے تھے، جن کی موجودگی میں یکے بعد دیگرے روایتیں بیان کرتے، تا کہ اگر کہیں کوئی غلطی یا بھول ہو تو دوسرے حاضر

صحابی اس کی اصلاح فرمادیں۔

چنانچہ حضرت ابوادریس خولانی بیان کرتے ہیں کہ جب میں جامع حمص پہنچا ہوں، تو دیکھا کہ 32 صحابۂ رسول ﷺ، ایک حلقہ بنائے تشریف فرما ہیں اور طالبانِ دین وتشنگانِ علم کے سامنے باری باری احادیثِ نبوی ﷺ بیان کررہے ہیں، جب ایک صحابی اپنی روایت ختم کرتے ہیں، تو دوسرے صحابی ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور اپنی روایت شروع کرتے ہیں۔ (1)

حدیثوں کی صحیح روایت کے لیے جو قابلِ قبول طریقے آج ہمارے ذہنوں میں آسکتے ہیں، ہمارے اسلاف بالخصوص صحابہ وتابعین ان سے غافل نہ تھے، بلکہ اپنی بیش ازبیش (زیادہ سے زیادہ) ذمہ داریوں کو یاد رکھتے ہوئے ہمیشہ روایتِ حدیث میں ان پر کاربند رہے۔ حرمین مکہ ومدینہ کا ذکر کیا، یہ تو مرکزِ نبوت وصحابیت ہیں، ان کے علاوہ شہروں میں اجلہ صحابہ کا اجتماع بہت اہمیت رکھتا ہے، مثلاً: کوفے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ممتاز ترین صحابہ تقریباً پچاس 50 تھے۔ بصرہ میں مقیم اکابر صحابہ کا شمار تقریباً چالیس 40 ہے۔ مصر میں سترہ 17 اصحابِ رسول کا قیام تھا۔ شام میں پینتیس 35 صحابہ کی تشریف آوری ثابت ہے، تین 3 صحابیوں نے جزیرہ کو شرفِ ورود بخشا۔ خراسان کے علاقے میں پانچ صحابیوں کے مزارات ہیں۔

آخری صحابی اوران کی تاریخِ رحلت:

بہ لحاظِ وفات کوفہ کے آخری صحابی حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ جن کا سن 86ھ میں انتقال ہوا، یعنی حضورِ اکرم ﷺ کے 75 برس بعد اور مدینہ میں حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رحلت سن 91ھ میں ہوئی، یعنی حضور ﷺ کے بعد یہ بزرگ 80 برس زندہ رہے اور بصرہ میں مقیم صحابیوں میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جنھوں نے وہیں سن 93ھ میں وفات پائی، اور شامی صحابہ میں حضرت

1- مسند احمد، مسند الانصار، حدیث عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث: 22783

عبداللہ بن بُسر ہیں، جن کا انتقال سن 88ھ میں ہوا۔

تابعین وراویانِ حدیث:

سَابِقُوْا إِلَى الْخَيْرَاتِ (نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو) اسلام کا زریں اصول ہے کہ صحابۂ کرام کی مسابقت اور خیر کی طرف پیش قدمی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، لیکن تابعین کے حالات پر اگر ہم نگاہ کرتے ہیں، تو ان کے اندر بھی صداقت کی روح جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ صحابیت کی فضیلت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا تھا، لیکن دین کی خدمت اور اتباعِ رسول ﷺ کی راہ نہ پہلے بند تھی اور نہ آج بند ہے۔ رحمتِ عالم ﷺ کا یہ بابِ عالی قیامت تک کھلا ہوا ہے۔ لوگ ہمت کریں اور مدینۃُ السلام (سلامتی کے شہر) میں داخل ہوں۔

اسلام کے چشمِ معرفت سے آج بھی زُلال (شیریں پانی) اُبل رہا ہے، ہم صحابی تو نہیں بن سکتے مگر اس آبِ مزکی (پاک کرنے والے پانی) میں ڈوب کر صبغۃ الرسول سے بہرور ہو سکتے ہیں۔ قرآن موجود ہے اور زندہ خدا کا زندہ کلام ہے۔ ہم آج بھی مردہ دلوں میں اس کے معجزانہ اثرات سے زندگی اور گرمی پیدا کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ کا کلمہ پڑھنے والا رسولِ پاک کو مردہ نہ سمجھے۔ ان کی سنت قیامت تک زندہ رہے گی اور روشن اسوۂ رسول ﷺ ہمیشہ اہلِ تقویٰ پر اپنی تجلیات برساتا رہے گا۔ تابعینِ کرام اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ رحلتِ نبوی ﷺ کے ساتھ صحابیت کی فہرست میں اضافہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے، مگر دیدار کی فضیلت کے سوا اور جتنی عظمتیں رسولِ عربی ﷺ کے وسیلے سے بنی نوعِ انسان کو ملی ہیں اور مل سکتی ہیں ان کے دروازے بند نہیں ہوئے ہیں۔ صحابۂ کرام اوصافِ نبوی کے چشم دید گواہ تھے اور ان کی مقدس زندگیاں خواصِ نبوت کی زندہ مثالیں تھیں، تابعین نے بھی صحابۂ کرام کی سیرتوں کو اپنایا اور رسول اللہ کے اسوۂ مطہرہ کے سانچے میں ڈھل گئے، محمدِ عربی روحی فداہ ﷺ نے اپنے اعجاز وصداقت سے نہ صرف صحابہ کی ذات میں بلکہ لاکھوں تابعین کی صورت میں کامل جلوہ گری فرمائی۔ آج سے

ایک ہزار تین سو چھیاسی سال پہلے (موجودہ وقت سے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے) شیاطین انس و جن ایک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منکر تھے، مگر اللہ رب العزت نے اپنی قدرت کاملہ سے تھوڑے ہی دنوں میں ہزاروں ایسے پیدا کر دیے، جو دینِ حق کی سربلندی کے لیے اس اخلاص و جوش سے مصروفِ عمل ہو گئے، جو اتباعِ محمدی سے پیدا ہوا۔ اسوۂ رسول اسلام کی ساخت و پرداخت (پرورش) کرتا ہے اور قرآن مجید دین کی روح ہے، دونوں کا اشتراک جب تک نہ ہو، مؤمن کامل بننا ناممکن ہے۔ جس طرح روحِ انسانی اپنے ظہور و نمود کے لیے جسمِ انسانی کی خواہاں ہے، اسی طرح حیاتِ ایمانی یعنی قرآن اپنی صوری تکمیل کے لیے اسوۂ نبوی کا طلبگار رہے، صحابہ کی برتری اتباعِ سنت اور تاثیرِ قرآن کا نتیجہ ہے اور تابعین و تبع تابعین اسوۂ رسول اور اتباعِ قرآن کے مشترکہ وسیلے سے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔

صحابۂ کرام جس کیمیا کی مدد سے زرِ خالص کا معیار بنے تھے، وہ نسخہ یعنی ''حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال'' انھوں نے تابعین کو پہنچائے اور حضراتِ تابعین نے بھی صحابۂ کرام کے نقشِ قدم پر چل کر حیاتِ مصطفوی کو اپنے ظاہر و باطن کے لیے قبول کیا اور امثالِ صحابہ بن گئے، تبع تابعین کے گروہ نے تابعین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں لیں اور ان کی راہ چلے یہ سلسلہ مقدسینِ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہمیشہ رائج رہا۔

عجمی تابعین اور ان کی اولاد:

عربی نژاد تابعین اور ان کی اولاد کو یہ اہمیت بھی حاصل تھی کہ خدا کے آخری پیغمبر ان کی قوم میں پیدا ہوئے اور کلامِ الٰہی ان کی زبان میں نازل ہوا، مگر عجمی تابعین اور ان کی اولاد اس نسبتِ خاص سے محروم تھے۔ اس لیے انھوں نے عربوں کے ہم پلہ بننے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کیں اور سَابِقُوا اِلَى الْخَيْرَاتِ (نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو) مقصدِ حیات بنالیا۔

عجمی تابعین اپنا نسب تو بدلنے سے رہے اور اسلام میں نسب کو وہ اہمیت بھی نہ تھی، جس پر پیشتر اس عہد کی اقوام اور بالخصوص اعراب کی معاشرت و قومیت کی بنا تھی۔ اسلام نے ایمان و عملِ صالح کو اساسِ کرامت بنا کر صہیب و سلمان و بلال و زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو

بے شمار عربوں، قرشیوں بلکہ بعض ہاشمیوں پر بھی فوقیت وشرافت بخشی تھی۔

تابعین اوران کی اولاد کے سامنے غیر عرب صحابہ کی عظمت وبزرگی کی مثالیں موجود تھیں کہ یہ نفوسِ قدسیہ محض دولتِ ایمان اور اتباعِ سنت کے ذریعے سے کس طرح سرتاجِ خلائق بن گئے، ان تابعین نے بھی وہی راہ اختیار کی اور یہ بھی نسبی فرق کے سوا تمام باتوں میں صحابہ کی پاکیزہ اولاد کے دوش بدوش نظر آنے لگے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کمالِ وابستگی پیدا کرنے کے لیے عربی زبان، نبوی معاشرت اور کتاب وسنت کا علم پورے اخلاص وعقیدت اور جذبۂ عمل کے ساتھ حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے، کیونکہ یہی چیزیں نبوت کی یادگار اور رسول کی میراث تھیں، ان کا جتنا زیادہ حصہ میسّر آئے اسی قدر دنیا وآخرت میں ایک مسلمان عزت وکرامت کا مستحق ہوگا۔ ایمان وعمل کی مدد سے عجمی بھی عربی پر فوقیت لے جا سکتا ہے۔

چنانچہ عصرِ صحابہ سے لے کر اسلامی عروج کے آخری دور تک عجمی مسلمانوں کو خدمتِ دین وتحصیلِ زبان میں آپ بہت پیش پیش دیکھیں گے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ جس طرح خالص عربوں کی صف میں ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ ابن ابی اور ابو عامر اور بعد میں عبداللہ بن سبا نظر آتے ہیں، اسی طرح عجمی اہلِ تقویٰ کے ساتھ کچھ منافقین بھی مل گئے ہوں گے، لیکن پاکبازِ صحابۂ کرام کی اسلامی خدمات نے جس طرح دینِ حنیف کے تمام خد وخال کی پوری حفاظت کی، بعد کے منافق وخودغرض عجمیوں کے مقابلے میں بھی مخلصینِ مابعد کی سعی سے اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت جاری رہی۔ ثقہ راویوں کے درمیان واضعینِ حدیث اسی طرح پہچان لیے جاتے ہیں، جس طرح روشن چاند کے درمیان سیاہ دھبے، نہ تو تمام عرب ایک جیسے تھے اور نہ تمام عجمی برابر تھے۔ دین ودنیا کی طلب ہر انسان کے دل میں یکساں نہیں ہوتی۔ برہمن زادہ اقبال حدیثوں کا پرستار تھا، لیکن زینب کبریٰ کی بعض اولاد حدیثوں کی مخالفت میں زبان وقلم کا سارا زور خرچ کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو ذاتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے کی ہدایت کی، لیکن ایک بدنصیب حدیثوں کا انکاری ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خود بھی دُور ہو رہا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے۔

بابِ ہفتم:
''احادیث کی صحت، صداقت و عظمت''
(طبقاتِ صحابہ اور تابعین کبار، خود صحابہ کے دور میں)

یہ سلسلۂ کلام نہ فنِ جرح و تعدیل سے متعلق ہے اور نہ یہ رِجال و رُواۃِ حدیث کا تفصیلی تذکرہ ہے، بلکہ ان مضامین کی واحد غرض یہ ہے کہ بعض لوگ جو جہلِ مرکب میں مبتلا ہو کر خود بھی گم کردہ راہ ہیں اور دوسروں کو بھی غافل پا کر راستے سے بھٹکانا چاہتے ہیں، ان کو خبردار کر دیا جائے کہ حدیثوں کے خلاف ان کی ساری کوششیں فضول ہیں۔ اگر دھرم بھکشو (بدھ مت کا راہب) نے قرآن کے معجزانہ کلام ہونے سے انکار کیا، تو کیا واقعی قرآن مجید کا اعجاز مشکوک ہو گیا؟ ہرگز نہیں، دنیا کو آج بھی چیلنج ہے کہ اس کا مقابلہ کرے، اب تو چودہ سو سال کی طویل مدت میں قرآن مجید کے دعویٔ اعجاز کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ ہر ماضی اپنے مستقبل کے سامنے قرآن کی عظمت پر ایک نئی دلیل پیش کرتا جا رہا ہے۔ اسی طرح جو لوگ حدیثوں کی اہمیت یا ان کی صحت و صداقت سے انکار کرتے ہیں، دھرم بھکشو کی طرح اپنے جہل کے معترف ہیں، بلکہ (اپنے جہل کا) اعلان کر رہے ہیں، ورنہ کوئی صاحبِ فہم و فراست جو اسلام کی تاریخ اور روایتِ حدیث کا تفصیلی علم رکھتا ہے، اس کو محمدِ عربی ﷺ کی ذات، ان کی لائی ہوئی کتاب اور دی ہوئی سنت، سراسر اعجاز نظر آئیں گے۔

ذیل کی چند سطریں بھی اہمیت و صداقتِ حدیث کے ثبوت میں بطورِ اشارہ پیش کی جا رہی ہیں۔

طبقاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

صحابۂ کرام اگر چہ اس صفت میں تو یقیناً باہم شریک ہیں کہ انھوں نے براہِ راست حضور ﷺ سے ایمان و عمل کی تعلیم حاصل کی اور بصیرت کے علاوہ اپنی بصارت سے بھی

آپ کو دیکھا اور پہچانا، لیکن بعض حیثیتوں سے یہ پاک گروہ ایک دوسرے سے افضل اور ممتاز ہیں، چنانچہ اس لحاظ سے صحابۂ کرام مندرجہ ذیل طبقات میں منقسم ہیں اوران میں سے ہر طبقے کے صحابہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بڑی تعداد میں عرصہ دراز تک زندہ رہے اور آپ کی حدیثیں انھوں نے روایت کیں، جن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور اخلاق کے بہت سے ایسے پہلو بعد میں آنے والوں پر روشن ہوئے، جن کا اظہار اور علم آسان نہ تھا، مثلاً: اُمہات المؤمنین نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ازدواجی تعلقات کو بیان کر کے انسانی زندگی کے اس خاص شعبے میں ہدایتیں عطا کیں، کمسن صحابہ نے حضور کے بعد بڑے ہو کر ہمیں یہ بتایا کہ بچوں کے ساتھ آپ کا سلوک کیا تھا۔ طبقۂ اول میں وہ صحابہ ہیں، جو مکہ میں اظہارِ دعوت کے بعد جلد ایمان لائے اور آپ کے شیدائی وفدائی ہو گئے۔ طبقۂ دوم میں اصحابِ دار الندوہ ہیں، طبقۂ سوم میں مہاجرینِ حبشہ ہیں، طبقۂ چہارم میں عقبۂ اولیٰ کی بیعت والے ہیں، طبقۂ پنجم میں عقبۂ ثانیہ کے مبایعین ہیں، طبقۂ ششم میں وہ مہاجرین ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ورودِ مدینہ سے پہلے مقام قباء میں آ کر رفیقِ ہجرت ہوئے، طبقۂ ہفتم میں اصحابِ بدر ہیں، طبقۂ ہشتم میں وہ صحابہ داخل ہیں جو غزوۂ بدر کے بعد صلح حدیبیہ سے پہلے ہجرت کر کے آپ کی سرکار میں فروکش ہو گئے، طبقۂ نہم میں بیعتِ رضوان والے اصحاب ہیں، طبقۂ دہم میں وہ صحابہ ہیں جو صلح حدیبیہ کے بعد فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے آئے، طبقۂ یازدہم میں فتح مکہ کے دن ایمان لانے والے اصحاب ہیں، طبقۂ دوازدہم میں کم سن صحابہ ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے نابالغ تھے، یا بہت (چھوٹے) بچے تھے۔ طبقۂ سیزدہم میں اصحابِ صفہ ہیں، طبقۂ چہاردہم میں فقہائے صحابہ ہیں۔ پھر بلحاظِ روایت صحابۂ کرام کے مختلف طبقات ہیں۔ یعنی بعض وہ گروہ صحابہ ہیں، جن سے کئی ہزار حدیثیں مروی ہیں، بعضوں سے چند ''سو'' حدیثیں اور بعض دوسرے صحابہ سے صرف چند حدیثیں روایت ہوئی ہیں۔

صحابہ سے روایتِ حدیث میں کمی بیشی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ کم روایت کرنے والے، یا

حضور کی نسبت سے کوئی حدیث نہ بیان کرنے والے صحابہ کو آنحضرت ﷺ کے اقوال واعمال کا علم نہ تھا، بلکہ وجہ یہ تھی کہ صحابہ کی دوسری متعدد جماعتیں حدیثوں کی تعلیم وتبلیغ میں مشغول ہوچکی تھیں اور سنتِ نبوی ﷺ کا ہر گوشہ لوگوں کے سامنے واضح کیا جارہا تھا۔ تو پھر بلاضرورت انھیں حدیثوں کو اور واقعاتِ نبوت کو دُہرانا ان کے نزدیک کچھ مفید نہ تھا اور اندیشہ تھا اس طریقِ کار سے شاید صحابیت کا غرور نہ پیدا ہو، **ورنہ سراسر محال تھا کہ حضور ﷺ کی کوئی حدیث کسی صحابی کو معلوم ہو اور وہ دنیا سے پوشیدہ رکھ کر اپنے ساتھ گوشۂ قبر میں لے جائے۔ یہ دینی ذمہ داری کے بھی خلاف تھا اور رسمِ محبت کے بھی خلاف، اگر محبوب کا ذکر دوسروں کی زبان پر جاری ہو، تو انسان کان لگا دیتا ہے اور اگر دوسرے خاموش ہوں، تو عاشقِ صادق فوراً ذکرِ محبوب چھیڑتا ہے۔**

وہ صحابہ جن سے ایک ہزار سے زیادہ حدیثیں مروی ہیں، ان میں اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ، ابوہریرہ، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم بہت ممتاز ہیں اور جن بزرگوں سے پانچ سو حدیثیں یا اس سے زیادہ مروی ہیں، ان میں عمر فاروق، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہم بہت اونچی شخصیتیں ہیں۔

غرض! محدثینِ کرام نے ہر صحابی کی روایتوں کی تعداد اور ان کے شاگردوں کے نام اور پھر شاگردوں کے شاگردوں کے مکمل تذکرے مہیا کردیے ہیں۔

اجلہ تابعین، کبار صحابہ کے دور میں:

صحابۂ کرام کے مختصر تذکرے سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ ان بزرگوں نے اشاعتِ دین میں کوئی غفلت نہیں برتی، بالخصوص حدیثوں کی روایت کے سلسلے میں، ایک طرف انھوں نے فریضۂ تبلیغ ادا کیا، تو دوسری طرف اجتماعی روایتِ حدیث کا طریقہ اختیار کر کے سہو ونسیان سے تحفظ کا انتظام کیا۔

صحابۂ کرام دورِ نبوت کے بعد طویل مدت تک دنیا میں زندہ رہے، اخلاف (بعد میں آنے والوں) کو حضور کی حدیثیں سنا کر سیرتِ نبوی کا پیرو بناتے رہے۔ اس طویل صد سالہ

دور میں جو ہزاروں ہزار تابعین پیدا ہوئے اور انھوں نے تحصیلِ حدیث وتبلیغِ دین اپنا مقصدِ حیات بنالیا، ان میں بھی مختلف طبقات ہیں، اگر تابعین کی زندگیوں کو صحابۂ کرام کے خیالات کے ساتھ ملا کر راویانِ حدیث پر غور کریں، تو کسی طرح بھی یہ شبہ نہیں پیدا ہوگا کہ حدیثیں صحابہ نے نہیں بیان کیں یا ہم تک صحیح حدیثیں نہیں پہنچی ہیں۔

ذیل میں تابعین کے طبقات اور ہر طبقہ کے چند راویانِ حدیث کی تاریخِ وفات درج کی جاتی ہے تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو کہ دورِ صحابہ کے بعد کے راویانِ حدیث کیسے ہیں اور ان تابعین کو دورِ صحابہ سے کتنا حصہ ملا اور یہ کتنی مدت اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں گزار سکے۔

تابعین کے پہلے طبقہ میں وہ لوگ ہیں، جو عشرۂ مبشرہ کی زیارت وصحبت سے فیض یاب ہوئے۔ مثلاً سعید بن مسیب، ابورجا عطاروی، ابوعثمان مہدی، قیس بن عباد وغیرہم جنھوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو نہیں دیکھا، مگر ابوبکر یا دوسرے راشد خلفاء اور عشرۂ مبشرہ کے شرفِ زیارت سے فیض یاب ہوئے۔ دوسرے طبقہ کے مشہور تابعین یہ ہیں، اسود بن یزید، علقمہ بن قیس، مسروق وغیرہم۔ تیسرے طبقہ کے مشاہیر تابعی عامر بن شراحبیل، عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ، شریح بن حارث وغیرہم۔

غرض! تابعین بھی پندرہ طبقات میں منقسم ہیں۔ آخری تابعی وہ ہے، جس نے بصری صحابہ میں حضرت انس کو اور اصحاب کوفہ میں عبداللہ بن ابی اوفیٰ اور مدنی صحابہ میں سائب بن یزید اور مصریوں میں عبداللہ بن حارث اور شامیوں میں حضرت ابواُمامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زیارت کی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طویل دور یعنی اسّی نوے سال تک ان اساطینِ اسلام کا زندہ رہنا اور مختلف دیارِ اسلامی میں اجتماعی مرکز بنا کر حدیثیں روایت کرتے رہنا، ایسی باتیں نہیں ہیں کہ ہم ان کو سنیں اور کسی غور وفکر کے بغیر ان سے گزر جائیں۔ **اگر حدیثیں کوئی دینی حجت نہ تھیں، تو پھر کئی ہزار صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی**

روایت و بیان کا بقدرِ طاقتِ بشری کیوں اہتمام کیا، خود بھی اپنی زندگیاں بے فائدے اور عبث کاموں میں گزاریں اور دوسری نئی مسلمان نسلوں کو ایک فضول کام کی طرف راغب کر کے، ان کی قیمتی زندگیوں کو برباد کیا، معاذ اللہ۔ صحابہ کی معرفت رکھنے والے اور قرآن مجید کو حق سمجھنے والے نہ ایسا کبھی سوچ سکتے ہیں اور نہ کہہ سکتے ہیں۔

حدیثیں یقیناً دینی حجت تھیں اور آج تک ہیں۔ حضور کے بعد تقریباً 90 برس تک صحابہ کے متعدد گروہ مختلف مراکز میں جمع ہو کر حضور کی طرف نسبت کر کے جو کچھ روایتیں بیان کرتے رہے، وہ بلاشبہ اس کثرت سے شائع و مشتہر ہو گئی تھیں کہ ان میں غلط و موضوع کی آمیزش آسان نہیں تھی، صحیح روایتوں میں مابعد والوں نے جو کچھ افتراء و جعل کے ذریعے خلط کیا ہے، تلاش و جستجو سے ان کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اور لگا لیا گیا۔

اگر ہم اپنی بصارت سے چاند کے دھبے کو دیکھ سکتے ہیں، تو بصیرت سے صحیح و روشن حدیثوں میں ملی ہوئی تاریک و غلط روایتوں میں بھی تمیز کر سکتے ہیں۔ اہلِ ایمان جانتے ہیں کہ بصیرت، بصارت سے زیادہ با اثر اور قوی ہے، نورِ ایمان کو نورِ چشم پر بدرجہا فوقیت ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

بابِ ہشتم:
''جمع اور تدوینِ حدیث کے مختلف ادوار''

(حکومتِ اسلامی کا تعاون۔ ایک شبہہ کا ازالہ۔
عمر بن عبدالعزیز اور تدوینِ حدیث۔
پہلی صدی ہجری کے چند مجامعِ حدیث)

حکومت اور تدوینِ حدیث:

دنیا کے سارے مذاہب حکومت کی سرپرستی سے پھلے، اقتدار کے سایہ میں پروان چڑھے اور تیغ و تفنگ (بندوق) کی مدد سے کامیاب ہوئے ہیں۔ جب تک کسی سیاسی اقتدار نے ان کے سروں پر ہاتھ نہیں رکھا، وہ مذاہب گمنامی اور تباہی میں گرفتار رہے، یا ترقی کے بعد بھی کسی وقت حکومت کا سہارا جاتا رہا، تو پھر وہ سارے مذاہب بھی بلندی سے پستی میں آ گئے۔

مگر دینِ اسلام اس تاریخی کلیہ سے مستثنیٰ ہے، مذاہبِ عالم کے برخلاف، اسلام نے حکومتوں کی سرپرستیاں کیں، اقتدار کو سہارے دیے اور سیاست کو پروان چڑھایا۔ اسلام نہ حکومت و دولت کی گود میں پلا اور نہ اہلِ حکومت کی امداد سے اس نے ترقی کی، عرب کے باشندے اپنی قبائلی نخوت اور نسلی غرور میں چور تھے، ان کی طبیعت خراج یعنی لاقانونیت کی خوگر تھی اور کسی کی برتری کا اقرار، عربی مزاج کے سراسر خلاف تھا۔ جس ملک میں خودستائی کا دور دورہ ہو اور نسلی عظمت کا گیت گایا جائے، وہاں کوئی تنظیم نہ پیدا ہو سکتی ہے اور نہ کبھی کسی منظم حکومت کے لیے کوششیں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ عرب جیسے

ملک میں ظاہر ہو کر اس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا، بچھڑے ہوؤں کو آپس میں ملا کر ایک کر دیا اور انسانیت کے منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کی۔ اسلام کی سرپرستی میں ایک حکومت قائم ہوگئی، جس نے بہت جلد پھیل کر سرزمینِ عرب سے باہر دور دور اپنی سرحدیں قائم کیں۔

اسلام کی دعوت مادی وسائل سے بے نیاز تھی اور شروع شروع اس کے حلقۂ اثر میں آنے والے انسانی تاریخ میں سب سے کمزور اور مظلوم افراد تھے، لیکن حق کس طرح باطل کے مقابلے میں کامیاب ہوتا ہے، اس کی صحیح مثال صرف اسلام میں نظر آتی ہے کہ اس بے سہارا مذہب کے بے بس پیرو، جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے تھے، نہایت ہی مختصر مدت میں ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک بن گئے؛ اس لیے جو دین اپنی فطرت کے اعتبار سے حیات بخش قوتوں کا سرچشمہ اور اقتدارِ سیاسی کا مرکز ہو، وہ اپنی تعلیمات کی اشاعت کے لیے کسی حکومت کا محتاج نہیں ہوسکتا۔

اہلِ بصیرت فلاحِ دارین کے لیے ایسے دین کی مخلصانہ خدمت کرتے ہیں اور اہلِ ہوس خودکامی و دنیا طلبی کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات دو اجزا سے مرکب ہیں: ایک قرآن مجید اور دوسرا جزء حدیث وسنت ہے۔ قرآن مجید کی اشاعت کب اور کس طرح ہوئی، یہ اس وقت موضوعِ بحث نہیں، لیکن حدیثوں کی اشاعت اور ان کی جمع وتدوین اس مقالے کا سرِ عنوان ہے۔

اوراقِ گذشتہ میں بیان ہو چکا ہے کہ حدیثیں کتابت کے ذریعہ سے کم اور زبانی روایتوں کی وساطت سے زیادہ شائع ہوتی رہیں۔ عہدِ نبوی ﷺ میں کتابتِ حدیث چند صحابیوں تک محدود تھی، لیکن عہدِ صحابہ میں شاگردانِ اصحابِ کرام نے اس کو فروغ دیا۔ تابعین میں ایک بڑی جماعت کا پتہ ملتا ہے، جو زبانی روایتوں کے ساتھ حدیثوں کی کتابت میں بھی منہمک تھے اور ابھی زمین زائرینِ رسول ﷺ کی قدم بوسی سے محروم نہ ہوئی تھی کہ احادیثِ نبوی ﷺ کے مختلف صحیفے مختلف راویانِ حدیث نے مرتب کر لیے۔

اس وقت تدوینِ حدیث کسی خاص فنی وفقہی نقطۂ نظر سے نہ تھی، بلکہ راویانِ حدیث اپنی یادداشت کے طور پر جو کچھ سنتے، لکھ لیا کرتے۔ گویا اس دور میں روایتوں کے صحیفے کشکول کی حیثیت رکھتے تھے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

خلافتِ راشدہ میں صحابۂ کرام مصروفِ قتال رہے، اسلامی سرحدوں کے چاروں طرف فتنہ وفساد کی آگ بھڑک چکی تھی اور یہ حضرات بڑی بڑی جماعتیں بنا کر اسلامی مملکت کے دفاع وتحفظ اور کافروں کی سرکوبی میں حد درجہ مشغول تھے۔ اس دور میں اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ممکن نہ تھا کہ یہ بیک وقت شمشیر بکف اور قلم بدست ہو کر دینِ متین کی دوگونہ خدمت کر سکیں، بلکہ ان کے لیے حلقۂ درس ترتیب دے کر احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی روایت کا بھی موقع نہ تھا۔ حالات جوں جوں قابو میں آتے گئے اور تعلیم وتدریس کی راہیں آسان ہوتی گئیں، صحابۂ کرام بلا تاخیر اس فریضۂ دین کی طرف متوجہ ہو گئے۔

حدیثوں کی زبانی روایت اور تحریری بیان میں انھوں نے عام طور پر اپنے لیے پہلی صورت بہتر قرار دی، کیونکہ اس طریقِ تعلیم سے حدیثوں کی اشاعت بھی زیادہ وسیع پیمانے پر ممکن ہوئی اور جابجا علمی مدارس قائم ہو گئے؛ **اس لیے کتابتِ حدیث کے سلسلے میں نہ تو صحابۂ کرام پر غفلت کا الزام ہے اور نہ حدیثوں کی اہمیت میں کوئی فرق آتا ہے، جنگ وقتال کے زمانے میں دینی تقاضے اور ہوتے ہیں، صلح وامن کے دنوں میں اور، خلافتِ راشدہ کے ابتدائی ایام میں اصل فوج اور کمک (مزید مدد کے لئے درکار فوج) دونوں میں صحابۂ کرام کو شریک ہونا پڑتا تھا۔**

عمر بن عبدالعزیز اور تدوینِ حدیث:

یہ سعادت آلِ خَطّاب کے لیے مقدر ہو چکی تھی کہ ہر آڑے وقت میں یہ کام آئیں، اور جب کبھی باطل حق میں ملنا چاہے، کوئی فرزندگاہِ فاروقی لے کر ظاہر ہو اور نیش (زہر) کو نوش (شہد) سے الگ کر دے۔ عہدِ رسالت میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایمان، اسلام کی

قوت بنا، دورِ صدیقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تحفظِ قرآن کی ساری کوششیں ابن خطاب کی دور اندیشی کا نتیجہ تھیں۔

قرآن اگر چہ عہدِ رسالت ﷺ میں محفوظ اور شائع ہو چکا، لیکن کتابت کے لحاظ سے اس سرکاری نسخے کے سوا جو حرمِ نبوی ﷺ میں رکھا رہتا تھا، اس کی کوئی اور نقل باضابطہ اور مستند نہ تھی۔ صحابۂ کرام نے بھی بطورِ خود قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کو اپنے پاس لکھ رکھا تھا، مگر وہ عموماً مصاحف کی گویا مقدس بیاض تھی، جس میں رعایتِ تنزیل، شانِ نزول، حدیثیں سب کچھ درج تھیں۔ یمامہ میں حُفاظِ قرآن کی خاصی تعداد شہید ہوگئی، جو قرآنِ مجید اور اس کی نبوی ترتیب کے امین تھے۔ وقت کا تقاضا اور دین کا مطالبہ ہوا کہ قرآن مجید اس طرح جمع کیا جائے، جس میں غیرِ قرآنی آیتوں کی آمیزش نہ ہو، تاکہ آئندہ دوسرے صحابہ کی مقدس بیاضوں کو دیکھ کر اُمتِ محمد یہ حیران نہ ہو۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس خطرہ کا اندازہ کر لیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ قرآن مجید چند صحابہ کی نگرانی میں ایک خاص مجموعے میں مرتب کر دیا گیا اور اب قیامت تک ہر خطرے سے محفوظ ہے۔

بالکل یہی کیفیت جمع و تدوینِ حدیث کی ہے۔ حدیثیں کچھ صحابۂ کرام نے بھی اپنے پاس لکھ رکھی تھیں، ان حضرات سے سُن کر تابعین نے بھی حدیثیں لکھ لیں۔ پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے صحابہ و تابعین کی لکھی ہوئی حدیثوں کے مجموعے بہت ہو گئے، مگر یہ تمام صحیفے راوی کی اپنی ملکیت تھے اور اسلامی مملکت میں بکھرے ہوئے اور منتشر تھے۔

اب تک حدیثوں کی روایت و کتابت کا کام صحابہ اور تابعین اپنے علمی ذوق اور دینی شغف کی بنا پر کرتے رہے، حکومت آئینی طور پر غیر جانبدار رہی کسی امیر یا خلیفہ کو حدیثوں کی جمع و تدوین کی طرف توجہ نہیں ہوئی، ممکن ہے کہ اس کی خاص وجہ یہ ہو کہ ابھی صحابۂ کرام سے دنیا خالی نہیں ہوئی تھی اور روایتوں کا سارا کام ان کی نگرانی اور صحبت میں انجام پا رہا تھا۔ لوگ مختلف حلقہ ہائے درس میں شریک ہو کر صحابۂ کرام سے روایتیں سنتے اور حضرت عمر

فاروق خلیفہ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گذشتہ فرمان: قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ[1] (ہر علم کو ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو) کے مطابق لکھ لیا کرتے تھے۔ کیوں نہ ہو! قلم کی تخلیق اور اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اپنی عظمت و کبریائی پر تعلیم بالقلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں بطورِ دلیل بیان فرمایا ہے۔ اس لیے صحابہ وتابعین جیسے اہلِ بصیرت وصاحبِ عرفاں گروہ سے بہت بعید تھا کہ قلم کی اہمیت سے غافل رہتے اور حدیثِ نبوی ﷺ جو قرآن کے بعد تمام علومِ آسمانی وارضی میں سب سے اشرف و بزرگ علم ہے، اس کو ضبطِ تحریر میں نہیں لاتے۔ لہٰذا جیسا کہ واقعات بھی تائید کرتے ہیں، حدیثوں کے متعدد نسخے پہلی صدی کے اختتام سے پیشتر ہی صحابہ اور تابعین نے مدون کر لیے تھے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اُموی دورِ ملوکیت میں آفتابِ عدل بن کر چمکے اور انھوں نے مروانی خاندان کے سر پر خدمتِ اسلام کا تاج رکھا، انھوں نے 99ھ میں خلافت کی ذمہ داریاں قبول کیں اور 100ھ میں منعمِ حقیقی کی سرکار سے انعام لینے کے لیے روانہ ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ سریرِ خلافت پر صرف اس لیے لائے گئے تھے کہ اپنے جدِ بزرگوار عمرِ اوّل کی طرح (کہ) جنھوں نے آئندہ کے لیے قرآن مجید کو محفوظ کیا، عمرِ ثانی تعلیماتِ مصطفوی کے دوسرے حصے یعنی حدیثوں کو محفوظ کر دیں۔

اس ڈھائی برس کی مدت میں جو خلافتِ صدیقی کی ہم وزن تھی، ابن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے بڑا کام یہی کیا کہ حدیثوں کے تمام منتشر مجموعوں کو سرکاری دفتر میں اکٹھا کر لیا اور اپنے ایک فرمان کے ذریعہ مملکتِ اسلامی کے سارے عالموں، والیوں اور عہدہ داروں کو حکم بھیجا کہ صحابہ وتابعین کے تمام مجامیع دار الخلافہ میں بھیج دیے جائیں۔

عمر بن عبد العزیز خود بھی تابعی تھے، دین دار تھے، خلیفۂ راشد تھے، تابعین کا بڑا گروہ ابھی زندہ تھا، صحابہ کو رخصت ہوئے بھی اتنے دن نہیں گزرے تھے کہ ان کی روایتیں فراموش کر دی جائیں، یا ان کے مجموعوں میں موضوع روایات کی آمیزش ہو سکے۔

1- مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الحدیث بالکراریس، من رخص فی کتاب العلم، رقم الحدیث: 26427

اپنے اس طریق کار اور بروقت خبر گیری سے عمر ثانی نے قرآن کی طرح قیامت تک کے لیے حدیثوں کی حفاظت کا انتظام کر دیا، **اب حدیثیں محض زبانی روایت سے مضبوط حافظے ہی کے سہارے محفوظ نہیں تھیں، بلکہ صحابہ کی اولاد تابعین و تبع تابعین کے اساتذہ کے موروثی نسخوں کے علاوہ تمام محفوظ حدیثیں مرکز میں منتقل ہو کر سرکاری ریکارڈ بن گئی تھیں۔ اس لیے واضعینِ حدیث نے بعد میں جب اپنے جعلی سکے چلائے، تو جلد ہی پکڑ لیے گئے اور محدثین نے موضوعات وضعفاء کے زیرِ عنوان ایسے رُواۃ اور ان کے جعلی سکوں کی قلعی کھول دی۔ اگر عمر بن عبدالعزیز کی پیش بینی نہ ہوتی اور حدیثوں کے مجموعے سرکاری ریکارڈ نہ بن گئے ہوتے، تو پھر ہمیشہ کے لیے ناممکن تھا کہ صحیح وموضوع روایتوں میں تمیز کی جاسکتی اور عادل وکذاب راویوں کی شناخت ہوتی۔** محدثین بہر حال غیر معصوم انسان تھے، اللہ کی طرف سے ان کے پاس کوئی وحی نہیں آتی تھی، جس سے نقد وانتخابِ حدیث ممکن ہوتا۔ یہ عمر ثانی کی روشن دینی خدمت کا نتیجہ ہے کہ آج تک اس کی شعاعوں میں حدیثیں پرکھی جاتی ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے چند مجامیع حدیث:

گذشتہ صفحات میں صحابۂ کرام کے تمام مرتبہ نسخہ ہائے حدیث کا ذکر تو نہیں ہوا ہے اور نہ ان نسخوں کے متعلق تفصیل بیانِ مقصود ہے۔ بطورِ اظہارِ مدعا یا کتابتِ حدیث کے سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت سے چند صحابیوں کے مجموعے کا نام لے لیا گیا تھا۔ اس لیے یہاں ان کا اعادہ چنداں ضروری نہیں۔ لیکن صحابہ کے سامنے ان کے شاگردوں یعنی تابعین نے جو مختلف مجموعے مرتب کیے اور پہلی ہی صدی ہجری میں احادیثِ نبوی ﷺ کے جو مستند ذخیرے فراہم ہو گئے، ان کا یہاں ذکر بہت اہم ہے کیونکہ سلسلۂ کتابت کی دوسری کڑی تابعین کے مجموعے ہیں۔

اس مختصر فہرست کو دیکھ کر آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ضبطِ حدیث کا کام کس قدر معتبر اور مستند ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیثیں کتابی صورت میں امام بخاری اور امام مسلم کی یاد

گار ہیں اور یہ تیسری صدی ہجری کے کارنامے ہیں، حقیقت سے کتنے ناواقف اور واقع سے کتنے نابلد ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عہدِ رسالت ﷺ سے آج تک کوئی دور ایسا نہیں گزرا، جس میں حدیثیں کتابی صورت میں موجود نہ تھیں۔

ہُمام بن منبہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرویات جمع کی تھیں اور وہ نسخہ ''برلن'' لائبریری میں محفوظ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مرویات حضرت عروہ نے مرتب کر لی تھیں۔ حضرت عروہ آپ کے حقیقی بھانجے اور زبیر بن عوام عشری صحابی کے صاحب زادے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تمام روایتیں ان کے متعدد شاگردوں نے اُنھی کے سامنے مرتب کر لی تھیں۔ مذکورہ چند ناموں کے علاوہ متعدد صحابہ کے کئی شاگردوں نے اپنے استاد کی روایتیں کتابی صورت میں جمع کر لی تھیں اور جب عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان جاری ہوا، تو وہ تمام نسخے نقل ہو کر مرکزِ خلافت میں پہنچ گئے۔

یہ پہلا موقع تھا جب اسلامی حکومت نے اس اہم دینی مسئلے کی طرف توجہ کی۔ حکومت کا یہ اقدام محض مجموعوں کو ایک جگہ جمع کر لینے کے لیے تھا۔ رہی ان مجموعوں کی فنی ترتیب وتبویب، تو اس کے لیے حکومت نے نہ کوئی ہدایت جاری کی اور نہ اس وقت ان کی طرف کسی کا خیال جا سکتا تھا۔ زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے، انسان علم وفن کی آراستگی وتہذیب نئے حالات کے مطابق کیا کرتا ہے۔ خلافتِ صدیقی میں صرف قرآن مجید کی تحریری حفاظت کی طرف خیال کیا گیا، تاکہ سرکاری مصحف میں قرآن مجید کی تمام آیات اور سورتیں محفوظ ہو جائیں اور دیگر اصحابِ رسول ﷺ کی بیاضوں اور کشکولوں کی وجہ سے کتاب اللہ کی کوئی آیت مشتبہ اور مشکوک نہ ہو، لیکن خلافتِ عثمانی میں تلاوت وقراءت کو سامنے رکھ کر جمع وحفاظتِ قرآن کا انتظام کیا گیا۔ مابعد دونوں میں اعجام واعراب کا اضافہ ہوا۔ پھر آیتوں کی تعداد ہر سورۃ کی لوح پر درج کرنے لگے اور اب تو تعداد حروف وحرکات کی طرف اہلِ خیر متوجہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح جمعِ حدیث کا کام بھی بتدریج قرآنی نہج پر ہوا، پہلے منتشرہ حدیثیں مرکزِ خلافت میں پہنچیں، پھر بلحاظِ رُواۃ ان کی ترتیب ہوئی اور مسانید عالمِ وجود میں آئیں، یعنی ہر صحابی کی تمام مرویات ایک جگہ اکٹھی کر دی گئیں، پھر فقہی ترتیب کا دور آیا پھر باعتبارِ سند حالات رُواۃ، صحیح وضعیف کی نشاندہی کی گئی، تخریج واستدراک ومشکلات کے حل کے لیے جب اہلِ دین کوشش کریں گے، تو حدیثوں کی خدمت کے لیے اور نئی راہیں پیدا ہو جانے کا کام ہوا، اور ان ادوار کے بعد توفیق وتطبیق اور ترجیح میں آج تک علمائے اعلام مشغول ہیں۔

اور اب تو دنیا کے سامنے نئے نئے معاشی ومعاشرتی مسائل ووسائل پیدا ہو گئے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ ان نئے حالات ومشکلات کے حل کے لئے جب اہلِ دین کوشش کریں گے، تو حدیثوں کی خدمت کے لئے اور نئی راہیں پیدا ہو جائیں گی۔

حاصلِ کلام:

گذشتہ تفصیل کے بعد اس کی ضرورت نہیں تھی کہ حدیثوں کی کتابت کے متعلق مزید لکھا جائے، کیونکہ اس مقالہ کا موضوع تدوینِ حدیث کی تاریخ اور عہد بعہد کی تبدیلیاں نہیں ہیں، **بلکہ اصل غرض یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے حدیثوں کی اہمیت نہیں جانتے اور ان کے شرعی حجت ہونے کا انکار کرتے ہیں، ان کو اور ان جیسے دوسروں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حدیثوں کے مجموعے علمائے اسلام کے خودساختہ نہیں ہیں اور نہ ان کی ترتیب وتدوین محض علمی حوصلہ مندی کی وجہ سے ہوئی ہے**، یعنی جس طرح تاریخ وجغرافیہ، حکمت وریاضی کی طرف مسلمان اہلِ فکر واہلِ قلم متوجہ ہوئے، اسی طرح ان روایتوں کے میدان میں بھی ان کے توسنِ فکر و اشہبِ قلم (سوچ اور قلم کے گھوڑوں) نے جوہر (کمال) دکھائے، حقیقت یہ ہے کہ جب صغار صحابہ کچھ بڑے ہوئے اور نئی قومیں اسلام میں داخل ہو ئیں، تو فطری طور پر ان کے دلوں میں حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت پاک جاننے کا شوق پیدا ہوا، دوسری طرف صغار صحابہ نے انھیں قرآن مجید کی تعلیم دی اور ہر حکم کی تشریح کے لیے حضورِ اکرم ﷺ کے اقوال وافعال سنائے، آپ کے ہر قول وفعل سے متعلق محل ومقام کا

ذکر کیا اور یہ حضرات حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت وسنت کا مشاہدہ عینی شاہد بن کر فرماتے کہ فلاں مقام پر مجھے، یا فلاں رفیقِ صحبت کو یہ بات پیش آئی اور حضور ﷺ نے اس طرح ہماری ہدایت فرمائی۔ صغار صحابہ اور تابعین اپنے بزرگوں سے جو سنتے اُن کو قیدِ تحریر میں لاتے، کیونکہ آنکھوں دیکھا حال انسانوں کے ذہن میں مدتوں نقش رہتا ہے، مگر سُنی سنائی باتوں کا قیام محض قوتِ حافظہ پر موقوف ہے، اس لیے سلسلۂ حدیث کے راویٔ ثانی یعنی صغار صحابہ وتابعین حدیثوں کی کتابت میں زیادہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔

سنتِ نبوی ﷺ سے متعلق ہر گوشہ چونکہ اسلامی ہدایت کا ایک اہم رکن تھا، خیر القرون کا ہر فرد اس کی تعمیل وتحفظ میں مشغول ہو گیا۔ جس کسی نے اسلام کا اقرار کیا، اس نے ساتھ ہی ساتھ ان ہدایتوں پر عمل کرنا بھی اپنا فرض سمجھا، جو حضور ﷺ کے نام سے صحابۂ کرام نئی نسلوں کو دے رہے تھے۔ اس دوسرے طبقے نے ان روایتوں کو طیبِ خاطر (خوش دلی) اور انشراحِ قلب (کھلے دل) کے ساتھ قبول کیا۔ بعضوں کا قبول صرف اپنی ذات تک محدود رہا اور بعضوں نے ان روایتوں کو اپنے لیے بھی قبول کیا اور اپنے بعد والوں کے لیے بھی قبول کیا، یعنی انھوں نے اپنی زندگیاں طلب وروایتِ حدیث، پھر ان کے جمع وکتابت میں صَرف کر دیں۔

تابعین احادیثِ نبوی ﷺ کے علاوہ، صحابۂ رسول ﷺ کے اقوال وفتاویٰ بھی جمع کرنے لگے؛ کیونکہ صحابۂ کرام کے اقوال وفتاوی کی مدد سے قرآن وسنت نبوی ﷺ کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ صحابۂ کرام کی تشریحات بطورِ خود دینی حجت نہ سہی، مگر دین کی تعمیر میں ان کو بڑا دخل تھا۔

مشکوٰۃِ نبوت سے جو تجلیات حاصل ہوئی تھیں، صحابۂ کرام کے اقوال وفتاویٰ میں ان کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔ صحابۂ کرام خود صاحبِ الہام نہیں تھے، مگر دین کی روایت میں ان کی زندگی الہامِ نبوی ﷺ کے سراسر تابع تھی۔ صحابۂ کرام اپنی مرویات اور اپنے فتاویٰ کی اہمیت اچھی طرح جانتے تھے، اس لیے ان بزرگوں میں سے جنہوں نے خود کوئی

کتابی ذخیرہ مرتب نہیں کیا، وہ اپنے تلامذہ سے یہ کام لینے لگے۔ چنانچہ ان کے شاگرد اپنے اساتذہ کے راوی بھی تھے اور کاتب و منشی بھی۔ گذشتہ اوراق میں ضمناً چند صحابۂ کرام اور ان کے تلامذہ کے صحفِ روایات کے تذکرے کے بعد ایک غیر جانب دار و طالبِ حق، بآسانی حدیثوں کی محفوظیت کا اقرار کر لے گا۔

عمر ثانی کے ساتھ تعاون:

جب عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرکاری فرمان جاری کیا اور وہ مُستقرِ خلافت میں حدیثوں کے مجموعے فراہم کرنے لگے، تو ہمارے پاس اس بات کی بھی قابلِ وثوق شہادتیں موجود ہیں کہ قوم نے اس اہم دینی اقدام میں ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ عمر ثانی کو اپنے مقصد برآری میں کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں ہوا۔ بلکہ اجلہ تابعین نے جن میں ابو بکر بن محمد متوفی 120ھ اور محمد بن مسلم نے سن 50ھ تا 124ھ میں بڑی ہمت دکھائی۔

اساطینِ اسلام واحیائے حدیث:

حدیثوں کی حفاظت اور ان کو زندہ رکھنے کا خیال عمر ثانی کا اختراع نہیں ہے، انھوں نے حفاظتِ حدیث کی ایک نئی راہ نکالی، ورنہ جہاں تک اصل مسئلہ یعنی حفاظتِ حدیث کا تعلق ہے، اس کے لیے صریح حکم حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت پہلے دے چکے تھے:

قال تَزَاوِرُوْا وَأَكْثِرُوْا مُذَاكَرَةَ الْحَدِيث، فَإِنَّكُمْ إِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا يَنْدَرِسُ الْحَدِيْثُ (1)

یعنی ''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ: ایک دوسرے سے ملاقات کیا کرو اور زیادہ سے زیادہ حدیثوں کا تذکرہ کرو، اگر تم لوگوں نے ایسا نہ کیا، تو حدیثیں گم ہو جائیں گی''۔

1- تاریخ دمشق لابن عساکر، ج ۵ ص 344

ذرا غور فرمائیے کہ اگر حدیثوں کی دینی اہمیت نہ تھی، تو خلیفۂ برحق علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے زندہ رکھنے اور یاد کرنے کا حکم کیوں دیا تھا؟

اسی طرح امام مالک، ابن شہاب کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

قال ابن شهاب إِنَّ هَذَا الْعِلْمَ أَدَبُ اللهِ الَّذِى أَدَّبَ بِهِ نَبِيَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَدَّبَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ أُمَّتَهُ، وَهُوَ أَمَانَةُ اللهِ إِلَى رَسُولِهِ لِيُؤَدِّيَهُ عَلَى مَا أُدِّيَ إِلَيْهِ (1)

یعنی ''ابن شہاب نے کہا کہ یہ علم (حدیث) اللہ کا ادب ہے، جو اس نے اپنے نبی کو سکھایا اور آنحضرت ﷺ نے اس سے اپنی اُمت کو آراستہ کیا۔ سنتِ نبوی اللہ کی امانت ہے، اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو اس لیے عطا کیا کہ وہ دوسروں تک اس امانت کو پہنچا دیں''۔

❖❖❖❖❖

1- الجامع لاخلاق الراوی واداب السامع للخطیب، ج:1،ص:78

باب نہم:
''صحاح ستہ سے قبل کی کتبُ روایت''
(بخاری ومُسلم سے پیشتر کے مجامیعِ حدیث)

راویانِ حدیث صحابۂ کرام کا شمار پانچ ہزار سے بھی زیادہ ہے اور خود خانوادۂ نبوت ﷺ سے تعلق رکھنے والے یعنی اہلِ بیت اور ان کی مفتخر اولاد میں تقریباً دوسوافراد سے حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دیگر صحابۂ کرام کی اولاد اور نو مسلم تابعین ان کے تلامذہ اور ان کی اولاد کا کیا شمار ہوگا اور جس علم کی طرف اتنی بڑی جماعتیں متوجہ ہوں اس علم کی حفاظت واشاعت میں کیا شک وشبہ کی گنجائش رہ سکتی ہے۔

عمر ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان:

كَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ رَحِمَهُ اللهُ عَلَى رَأْسِ المِائَةِ إِلَى أَبِي بَكْرِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَامِلِهِ وَقَاضِيْهِ عَلَى المَدِينَةِ أُنْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاكْتُبْهُ لِيْ، فَإِنِّيْ قَدْ خِفْتُ دُرُوسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءِ وَأَوْصَاهُ أَنْ يَكْتُبَ لَهُ مَا عِنْدَ عُمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الأَنْصَارِيَّةِ وَالْقَاسِمِ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِيْ بَكْرٍ وَكَذٰلِكَ كَتَبَ إِلَى عُمَّالٍ فِيْ أُمَّهَاتِ المُدُنِ الْإِسْلَامِيَّةِ بِجَمْعِ الحَدِيثِ وَمِمَّنْ كَتَبَ إِلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ مُسْلِمٍ الزُّهْرِي المَدَنِيْ (1)

یعنی ''سن 100 ھ کے شروع میں عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن عمرو بن حزم کو خط لکھا، جو ان دنوں مدینہ کے عامل اور قاضی تھے، کہ دیکھو حضورِ اکرم ﷺ کی جو حدیثیں

1- الطبقات الکبری، ج:2، ص:295

ہیں، ان کو لکھ لو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ علماء کے ساتھ علم بھی رخصت ہو جائے گا اور انھوں نے تاکید کی کہ حضرت عمرہ بنت عبدالرحمن انصاریہ (98ھ) کا مجموعہ نقل کر کے مرکزِ خلافت میں بھیج دیں اور حدیثوں کے وہ تمام ذخیرے جو قاسم بن محمد بن ابی بکر (م 108ھ) کے پاس ہیں ان کو بھی نقل کر لیا جائے''۔ عمر بن عبد العزیز نے جس طرح عاملِ مدینہ کو لکھا مملکتِ اسلامی کے تمام بڑے شہروں کے عاملوں کو بھی اسی طرح حدیثیں جمع کرنے کی ہدایتیں بھیجیں۔

حکومت کی اس دلچسپی کے بعد حدیثوں کی جمع وتالیف کا کام زیادہ محفوظ بنیاد پر ہونے لگا۔ اب تک حدیثوں کے جو کچھ کتابی ذخیرے صحابہ وتابعین کے گھروں میں رکھے ہوئے تھے، نقل ہو کر مستقر خلافت میں پہنچ گئے اور عمر ثانی کی تنبیہ کے بعد دوسرے راویانِ حدیث نے بھی حدیثیں لکھنا شروع کر دیں۔

ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابن جریج 85 تا 150ھ، ربیع بن صبیح 160ھ، سعید بن عروبہ 156ھ، حماد بن سلمہ 167ھ، اوزاعی 85 تا 157ھ، معمر 153 اور محمد بن عبدالرحمن 72 تا 148ھ۔

اس دور میں اور اس کے بعد بخاری ومسلم سے پہلے جو کتابیں مرتب ہوئیں، ان میں سے چند کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

ان مؤلفین اور ان کی تألیفات کی واقفیت بہر حال مفید ہے:

1۔ سفیان ثوری: کتاب جامع کبیر، کتاب جامع صغیر، کتاب الفرائض۔
2۔ ابو عبدالرحمن محمد بن عبدالرحمن 74 تا 148ھ: کتابُ السنن۔
3۔ عبدالرحمن بن زید: کتاب الناسخ والمنسوخ، کتاب التفسیر۔
4۔ عبدالرحمن بن ابی الزناد 100 تا 174ھ: کتاب الفرائض، کتاب رأی الفقہاء۔
5- عبدالملک بن محمد متوفی 176ھ: ''کتاب المغازی''۔
6۔ عبدالملک بن جریج: کتاب السنن۔

7۔ زائد بن قدامہ متوفیٰ 61ھ: کتاب السنن۔

8۔ محمد بن فضل متوفیٰ 159ھ: کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب المناسک، کتاب السنن۔

9۔ یحییٰ بن زکریا متوفیٰ 183ھ: کتاب السنن۔

10۔ وکیع بن جراح متوفیٰ 197ھ: کتاب السنن۔

11۔ ابونعیم فضل بن دُکین 217ھ: کتاب المناسک، کتاب المسائل۔

12۔ عبداللہ بن مبارک: کتاب السنن۔

13۔ ابوعبداللہ فیریابی کبیر: ان کا مجموعہ روایت تمام فقہی ابواب پر حاوی ہے۔

14۔ عبداللہ بن محمد متوفیٰ 235ھ: کتاب السنن، کتاب المسند۔

15۔ عثمان بن ابی شیبہ متوفیٰ 235ھ: کتاب السنن، کتاب المسند۔

16۔ محمد بن عثمان متوفیٰ 197ھ: کتاب السنن۔

17۔ احمد بن محمد بن ہانی: کتاب السنن، کتاب الناسخ والمنسوخ في الحدیث۔

18۔ احمد بن محمد المروزی: کتاب السنن بشواہد الحدیث۔

19۔ اسحٰق بن راہویہ: کتاب السنن۔

20۔ علی بن مدینی 186 تا 250ھ: کتاب المسند، کتاب المدلسین، کتاب الضعفاء، کتاب العلل۔

21۔ سریج ابن یونس: کتاب السنن۔

22۔ ابوعمرو حفص: کتاب السنن۔

23۔ ابراہیم بن اسحٰق متوفیٰ 258ھ: کتاب غریب الحدیث، مسند ابی بکر، مسند عمر، مسند عثمان، مسند علی، مسند زبیر، مسند طلحہ، مسند سعد بن ابی وقاص، مسند عبدالرحمٰن بن عوف، مسند عباس، مسند شیبہ بن عثمان، مسند عبداللہ بن جعفر، مسند مسور بن مخرمہ زہری، مسند مطلب بن ربیعہ، مسند سائب مخزومی، مسند خالد بن ولید، مسند ابی عبیدہ

بن جراح، مسند معاویہ، مسند عمرو بن عاص، مسند عبداللہ بن عباس، مسند عبداللہ بن عمر، مسند الموالیٰ۔

24۔ مطبین بن ایوب متوفیٰ 298ھ: کتاب السنن، کتاب المسند، کتاب تفسیر المسند۔

25۔ فیریابی صغیر متوفیٰ 300ھ: کتاب السنن، جو پچاس ابواب پر مشتمل ہے۔

26۔ ابو مسلم الکجی: کتاب المسند، کتاب السنن۔

27۔ یحییٰ بن آدم متوفیٰ 203ھ: کتاب الخراج، کتاب الفرائض۔

28۔ سعید بن ابی عروبہ متوفیٰ 156ھ: کتاب السنن۔

29۔ حماد بن سلمہ متوفی 165ھ: کتاب السنن۔

30۔ اسماعیل بن عُلَیہ 116 تا 193ھ: کتاب التفسیر، کتاب الصلاۃ، کتاب الطہارت، کتاب المناسک۔

31۔ ابراہیم بن اسماعیل 152 تا 218ھ۔

32۔ بروح بن عبادہ متوفیٰ 207ھ: کتاب السنن۔

33۔ مکحول شامی متوفیٰ 113ھ: کتاب السنن، کتاب المسائل۔

34۔ اوزاعی 85 تا 157ھ: کتاب السنن، کتاب المسائل۔

35۔ ولید بن مسلم متوفی 194ھ: کتاب السنن، کتاب المغازی۔

36۔ عبدالرزاق بن ہمام متوفیٰ 211ھ: کتاب السنن، کتاب المغازی۔

37۔ ہشیم بن بشیر متوفیٰ 183ھ: کتاب التفسیر، کتاب السنن، کتاب القراءت۔

38۔ یزید بن ہارون متوفی 206ھ: کتاب الفرائض۔

39۔ اسحاق الازرق متوفیٰ 195ھ: کتاب المناسک، کتاب الصلوٰۃ۔

40۔ عبدالوہاب بن عطاء متوفی 200ھ: کتاب السنن۔

41۔ ابراہیم بن طہمان: کتاب السنن۔

42۔ سفیان بن عیینہ 107 تا 198ھ وغیرہم۔

اسمائے مذکورہ بالا میں چاروں امام اور ان کے مشہور تلامذہ کے مجموعے درج نہیں کیے گئے، کیونکہ ان کی تصانیف اور اس سلسلے کے مصنفین سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ائمہ اربعہ پہلی صدی ہجری کے آخر سے تیسری صدی ہجری کے اوائل تک اپنی روایتی وفقہی خدمات کی وجہ سے مرکزِ دین بنے رہے اور ان کے بعد ان کے تلامذہ مسلسل آج تک حدیث وفقہ کی خدمت میں مشغول ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی ولادت 80ھ میں ہوئی، امام مالک 93ھ میں پیدا ہوئے۔ امام شافعی 150ھ میں خاکدانِ ارضی کے رونق بخش بنے اور امام احمد بن حنبل 164ھ مطلع وجود پر نمودار ہوئے۔

یہ ایک نہایت مختصر فہرست ہے۔ امام بخاری ومسلم سے پیشتر جو حدیثوں کے مجموعے مرتب ہوئے، ان کی تفصیلی تذکرے کی یہاں گنجائش نہیں ہے اور آج بھی اس مبارک عہد کی اکثر تالیفات موجود ہیں۔

روایتِ حدیث، راویوں کی عمر کے لحاظ سے:

سطورِ بالا میں نمونے کے طور پر جمع وتدوین کا ذکر تھا، اگر ان تالیفی خدمات کے ساتھ راویوں کی عمروں کا سلسلہ بھی پیشِ نظر رہے، تو ہمیں یقین ہے کہ امتِ مسلمہ نہ صرف حدیثوں کی اہمیت کا اقرار کرے گی، بلکہ اپنے اسلاف کے دینی کارناموں پر فخر کرے گی اور یہ جان سکے گی کہ اسلام کو دنیا کے دوسرے مذاہب پر برتری وتفوق کس طرح حاصل ہے۔ اسلام سے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات کیونکر محفوظ رہی؟ اور حضورِ اکرم ﷺ کی سنت کو حرزِ جان بنایا گیا۔ دنیا کی دوسری قومیں اپنی بنیادی کتابوں کی حفاظت سے غافل رہیں، یہاں تک کہ ان کے دین کے سارے مکتوب ذخیرے مشتبہ ومشکوک ہو کر رہ گئے۔

جب وہ لوگ کتابوں کی صحیح حفاظت میں ناکام رہے، تو اس کی توقع عبث ہے کہ ان کے بانیانِ مذہب کی سوانح حیات محفوظ رہ سکتی ہیں۔ مگر یہ سعادت صرف مسلمانوں کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی کہ الہامی کتاب کے ساتھ اس کی زبانی اور عملی تفسیریں بھی محفوظ رہیں، چنانچہ دینِ مبین کے مخلص پیروؤں نے اپنے ہادیٔ برحق کی مکمل سوانحِ حیات کی

حفاظت کی اور عہد بعہد زبانی اور کتابی دونوں طریقے سے ان کو منتقل کر کے ہم تک پہنچا دیا۔ فَجَزَاهُمُ اللهُ تَعَالَىٰ خیر الجزاء۔

تسلسلِ روایت:

ذیل میں عہدِ سیدنا عثمان سے لے کر 300ھ تک چند راویانِ حدیث کے سنینِ وفات درج کیے جاتے ہیں، تاکہ روایتوں کے تسلسل کا ایک اندازہ ہو اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر سن (سال) میں نئی شخصیتیں وجود میں آئیں اور ہر سال راویوں کی ایک جماعت ہم سے رخصت ہوتی گئی، جن کے نام، حالات، مدتِ زندگی، علمی خدمات، دین کے ساتھ وابستگی کے تذکرے کتابوں میں محفوظ ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کئی لاکھ راویوں کے مفصل حالات یہاں لکھے جائیں، چند ناموں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

عہدِ عثمانی میں وفات پانے والے چند صحابۂ کرام:

1۔ سراقہ بن مالک، 2۔ جبار بن صخر، 3۔ حاطب بن ابی بلتعہ، 4۔ عیاض بن زہیر، 5۔ ابورشید ساعدی، 6۔ اوس بن صامت، 7۔ حرث بن نوفل، 8۔ عبداللہ بن حذافہ، 9۔ زید بن خارجہ، 10۔ لبید بن ربیعہ، 11۔ مسیب، 12۔ معاذ بن عمرو، 13۔ ابولبابہ، 14۔ نعیم بن مسعود وغیرہم۔

عہدِ حیدری میں وفات پانے والے چند صحابۂ کرام:

1۔ حذیفہ بن یمان، 2۔ زبیر بن عوام، 3۔ طلحہ، 4۔ سلمان فارسی، 5۔ ابومیسرہ بدری، 6۔ صفوان بن عسال، 7۔ تمیم داری وغیرہم (کئی ہزار صحابہ و تابعین نے انتقال کیا)۔ اسی طرح پہلی صدی ہجری کے آخری دنوں تک سال بہ سال صحابۂ کرام رخصت ہوتے رہے، ذیل میں 61ھ یعنی شہادت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سال سے مابعد دوسو چالیس برس کی وفیات درج کی جاتی ہیں:

علقمہ 61ھ، مسروق 62ھ، عبیدہ 73ھ، عمرو بن میمون 74ھ، اسود بن یزید 75ھ، سوید بن غفلہ 80ھ، محمد ابن حنفیہ 80ھ، شریح بن حارث 78ھ بعمر 108 سال، عبدالرحمن

بن ابی لیلیٰ 83ھ، عمرو بن حریث 85ھ، علی بن حسین (امام زین العابدین) 92ھ، انس بن مالک صحابی 93ھ، سعید بن جبیر 95ھ، ابراہیم بن زید 96ھ، سالم بن ابی جند 97ھ، ابو خالد والبی 100ھ، عمر بن عبدالعزیز 101ھ، مجاہد 102ھ، شعبی 104ھ، ضحاک ابن مزاحم 105ھ، طاؤس وسالم بن عبداللہ 106ھ، محمد بن کعب قرضی 108ھ، حسن بن یسار بصری 110ھ، محمد بن سیرین 110ھ، طلحہ بن مصرف 112ھ، قتادہ ونافع 117ھ، محمد بن علی (امام باقر) 114ھ، عطاء بن ابی رباح 115ھ، عمرو بن مرہ 115ھ، ابوصخرہ جامع بن شداد 118ھ، قیس بن مسلم 120ھ، حماد بن ابی سلیمان استاذِ ابوحنیفہ 120ھ، سلمہ بن کہیل 121ھ، زبید بن حارث 122ھ، ابواسحٰق سبعی 128ھ، یحیٰ بن ابی کثیر 139ھ، ابن شبرمہ 144ھ، ہشام بن عروہ وعبدالملک بن ابی سلیمان 145ھ، اسماعیل بن ابی خالد 146ھ، اعمش، محمد بن عبدالرحمن، امام جعفر صادق، زکریا بن ابی زائدہ 148ھ، ابوحنیفہ وابو جناب کلبی 150ھ، علی بن صالح 154ھ، مسعر بن کدام 155ھ، عمر بن زر 156ھ، اسرائیل بن یونس 160ھ، قیس بن ربیع وحسن بن صالح 167ھ، شریک بن عبداللہ 161ھ، شریک بن عبداللہ 177ھ، زہری 124ھ، جعفر بن ایاس 123ھ، سعید بن عبد العزیز 164ھ، داؤد طائی 165ھ، حماد بن سلمہ 165ھ، یحیٰ بن سلمہ 168ھ، حبان بن علی 171ھ، محمد بن ابان 171ھ، سلام بن ابی مطیع 173ھ، بکر بن مضر 175ھ، ابوعوامہ 176ھ، ابراہیم بن حمید، مفضل بن یونس، عبدالوارث بن سعید 178ھ، مالک بن انس، خالد بن عبداللہ، حماد بن زید 179ھ، عباد بن عباد، سعید بن خثیم، سلمۃ الاخمر، علی بن ہاشم 180ھ، یزید بن زریع 181ھ، عبدالاعلی وابن علیہ 189ھ، سفیان بن عیینہ، یحیٰ، عبد الرحمن 198ھ، عمر بن یونس، وہب بن جریر 206ھ، ابوعاصم 213ھ، محمد بن عبداللہ انصاری 215ھ بعمر 97 سال یعنی: 118ھ میں ولادت ہوئی تھی، اسماعیل بن ابی اویس، احمد بن عبداللہ بن یونس، ابوالولید طیالسی 217ھ، بشر حافی 227ھ، ابونصر تمار 228ھ، علی بن جعد، مومل بن فضل، ہارون بن معروف، عاصم بن علی، محمد بن زیاد اعرابی 230ھ، احمد

بن نصر خزاعی 231ھ، حکم بن موسیٰ 232ھ، ابراہیم بن محمد بن عرعرہ، محرز بن عون 232ھ، عمرو، ناقد، عبداللہ بن عون 232ھ، یحییٰ بن معین 232ھ، قواریری، منصور بن ابی مزاحم 235ھ، اسحٰق بن اسماعیل طالقانی 230ھ، یحییٰ بن ایوب مقابری 234ھ، محمد بن اسحٰق مسیبی 236ھ، یحییٰ بن یحییٰ 234ھ، عبدالملک بن حبیب 238ھ، عبدالسلام بن سعید 240ھ، ابوثور 246ھ، حسن بن محمد زعفرانی 261ھ، ربیع بن سلیمان مرادی 270ھ، یونس بن عبدالاعلیٰ 261ھ، امام احمد بن حنبل 241ھ، عبدالرحمٰن بن محمد بصری 271ھ، حنبل بن اسحاق 273ھ، ابراہیم بن ولید، احمد بن عبدالجبار عطاروی، محمد بن عبیداللہ منادی 272ھ، حسن بن مکرم، علی بن عبدالحمید 274ھ، عبدالکریم دیر عاقولی 278ھ، غلام الخلیل 275ھ، عبداللہ بن ابی الدنیا 282ھ، حارث بن ابی اسامہ 282ھ، جعفر طیالسی 282ھ، اسحٰق حربی 284ھ، ابراہیم حربی 285ھ، محمد بن یونس کدیمی 286ھ، بشر بن موسیٰ 288ھ، معاذ بن المثنیٰ 288ھ، عبداللہ بن احمد بن حنبل 290ھ، احمد بن یحییٰ حلوانی 292ھ، موسیٰ بن اسحٰق 297ھ، صالح بن محمد 293ھ، نصر بن احمد 293ھ، سہیل بن شاذویہ 299ھ، عبداللہ بن دارہ 295ھ، عبداللہ بن جعفر بن خاقان 296ھ، احمد بن عمر ذہلی 295ھ، ابوعبدالرحمٰن دہکانی 297ھ، ابوصالح حافظ الحدیث 299ھ، ابوالعباس احمد بن سعید بن مسعود 297ھ، محمد بن سری، احمد بن حسین، ابوعلی خرقی 299ھ، ابوعمر قتات ابن دلّان، علی بن طیفور، فضل بن صالح ہاشمی، حسین بن عمر اور احمد بن یعقوب 300ھ۔

مذکورہ رُواۃِ حدیث اور ان کی وفیات درج کرنے کے بعد اب اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ مابعد صدیوں میں پیدا ہونے والے اور حدیثوں کی خدمت کرنے والے علمائے اعلام کی فہرست پیش کی جائے، کیونکہ اب دورِ صحاحِ ستہ کا شروع ہو چکا تھا اور اس کے بعد حدیثوں کی ساری خدمات براہِ راست یا بالواسطہ انھیں صحاح سے متعلق رہیں اور آج تک جاری ہیں۔ کتبِ حدیث اس قدر شائع ہو چکی ہیں کہ اب ابتدائی تین صدیوں کی طرح راویوں کی چھان بین کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب دوسرے طریقوں سے سنتِ نبوی

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت ہوتی جاتی ہے۔

چنانچہ حضرت الاستاذ مولانا ظفر الدین صاحب، پرنسپل مدرسہ بحر العلوم، بہار کی ''جامع الرضوی'' کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور کچھ زیرِ طبع ہیں اور بعض حصے ہنوز زیرِ ترتیب ہیں، اسی طرح حضرت الاستاذ مولانا اصغر حسین صاحب سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کی تالیف بنام "منزل الثوی" ان کے سامنے طبع ہو چکی تھی، مگر دوسری تالیفاتِ حدیث ہنوز قلمی صورت میں تھیں کہ ان بزرگوار محدث کا انتقال ہو گیا۔

گذشتہ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ دینِ مبین میں حدیثوں کی اہمیت کیا ہے اور یہ شرعی حجت کس طرح ہیں۔ صحابۂ کرام کے مبارک عہد سے آج تک حدیثوں کی حفاظت میں زبان وقلم کتنے منہمک رہے، جمع وتالیفِ حدیث میں ایمان کے تقاضے کیوں کر پورے ہوئے، خلفاء، وُلاۃ اور علمائے اسلام نے اپنے فرمان، سعی اور تعلیم کے ذریعے حدیثوں کی روایت واشاعت کے لیے عہد بعہد کیا کیا طریقے اختیار کیے کہ آج اسلامی علوم وفنون میں کتبِ سنت اور ان کے متعلقات علوم کے ذخیرے دنیا کے دوسرے مضامین کے مقابلے میں بہت زیادہ اور ضخیم ہیں۔

حدیثوں کی حفاظت کی دُھن میں مسلمانوں نے نہ صرف متونِ حدیث کو ضائع ہونے سے بچالیا، بلکہ اس سے دین کے خدمت گزاروں کو بھی حیاتِ جاوید حاصل ہوگئی کہ عہدِ صحابہ سے آج تک کے راویانِ حدیث کے حالاتِ زندگی، سوانحِ حیات بسط وتفصیل کے ساتھ کتابوں میں درج اور زبانوں پر جاری ہیں۔

سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آبِ حیات کا چشمہ ہے، جس سے سیراب ہونے والا کبھی نہیں مرتا، اس کے قبول واتباع نے کُل عرب کے مُردہ دلوں میں روح پھونکی تھی اور آج بھی ان کا فیض عام ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

باب دہم:
''حدیثوں سے استفادے کا طریقہ''
(نقد و انتخابِ روایت کے اصول و اسناد۔ حدیثوں کی تحقیق کے قواعد۔ اسناد کے متعلق جرح اور تعدیل کے شعبے۔ متنِ حدیث کی روایتیں۔ حدیث کے الفاظ و معنی سے استفادہ کی شرطیں)

جہاں تک حدیثوں کی جمع و تدوین کا کام تھا، چوتھی صدی ہجری تک باقاعدہ جاری رہا اور تمام مرویات کتابوں میں جاری ہو گئیں۔ راویوں کے حالات کا تتبع اور ان پر جرح و تعدیل کا کام بھی کتبِ حدیث کی تدوین کے ساتھ ہوتا رہا اور قرآن و حدیث کے باہمی رشتہ کا اظہار اور فقہی مسائل کے استنباط کی کوشش بھی انھیں دنوں شروع ہو چکی تھیں اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ان کی طرف نئے نئے انداز سے توجہ کی گئی۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ حدیثوں سے متعلق خدمتِ دین کا کوئی شعبہ مطروح و متروک رہا اور سلف صالحین نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ رُواۃ کی چھان بین حدیثوں کا نقد و انتقاد، روایتوں کی تخریج، مسائل کا استنباط، حالات کے تقاضے اور انسانی ضروریات کے مطابق کسی روک ٹوک کے بغیر جاری ہے۔ آج بھی جب کہ تمدن کی ترقی، معاش و معاشرت کی رنگارنگی سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں، قرآن و سنت کی مدد سے تمام مشکلات کا حل دریافت کیا جائے گا اور وہ لوگ جن کے دلوں میں صحیح شمعِ ایمان روشن ہے اور ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی نصرت حاصل ہے، دنیا کے سامنے پسندیدہ راہِ حیات پیش کریں گے۔

طاغوت کا اور شیطان کا تسلط جو آج چاروں طرف محیط ہے اور ادھر صدیوں سے اہلِ حق کی آواز سنی نہیں جاتی، علمائے اسلام کے خلاف معاشی پہرے بٹھائے گئے ہیں اور

زندگی کے تمام راستے ان پر بند ہیں، یہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتے، اسلام کو فنا کرنے کی ساری کوششیں آج تک ناکام ہوتی رہیں اور ہدایتِ الٰہی کا یہ چراغ، مخالفت کی شدید آندھیوں میں بھی جھلملائے بغیر ایک طرح جل رہا ہے۔ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ پر نگاہ ڈالیے، اس طویل دور میں نہ جانے کتنے اہلِ قلم، اہلِ زبان اور اہلِ تیغ پیدا ہوئے، زمانے کے انقلاب نے کتنوں کو اقتدار کی کرسیوں پر بٹھایا اور خدا معلوم کتنی ہستیاں سریرِ عظمت (تختِ بادشاہ) سے اٹھا کر نیچے پھینک دی گئیں کہ آج ان کے نام اور کارنامے بھی لوگوں کو یاد نہیں، مگر اس طویل مدت میں دین کے خدمت گزاروں پر نظر کیجئے، تو کوئی عصر اور کوئی عہد ایسا نہیں ہوگا، جس میں خدا پرستوں کا ایک گروہ آفتابِ ہدایت بن کر نہ چمک رہا ہو۔ علمائے اعلام، محدثینِ کرام، صوفیائے عظام کے اسمائے گرامی زمانے کی لوحِ پیشانی پر بخطِ نور لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، جنھیں دنیا نہ کل بھلا سکی اور نہ آئندہ فراموش کرنے پر قادر ہے۔

موجودہ دور میں حدیثوں کی زبانی روایت کی ضرورت نہیں، جرح وتعدیل کی طرف سے بھی اطمینان ہے؛ کیونکہ اسلاف ان شعبوں کو مکمل کر چکے، اب ہمیں ان کے مساعی کا شکر گزار ہونا چاہیے، جرح وتعدیل میں مزید انہماک محض تضییع اوقات ہوگا، بلکہ ان کے کارناموں پر اعتماد کر کے اپنی عہدی ضروریات پوری کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ وہ لوگ جو شکوک میں مبتلا ہیں، یا کسی رکیک جذبے کے ماتحت حدیثوں کے متعلق لوگوں کے اعتقاد کو متزلزل کرنا چاہتے ہیں، اُن پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ حدیثوں کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے بھی بڑے وسیع علم کی ضرورت ہے۔ جو بدنیتی سے حدیثوں پر جرح اور حجت کرے، اُس کو حسب ذیل شعبوں کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔

اسناد سے متعلق جرح وتعدیل کے شعبے:

جب تک مندرجہ ذیل باون (52) باتیں اچھی طرح پیشِ نظر نہ ہوں، کسی کے لیے آسان نہیں ہے کہ حدیثوں کی سند پر باقاعدہ بحث کر سکے اور جرح وتعدیل کی روشنی میں صحیح

وضعیف روایتوں میں امتیاز کر لے:

1۔ عالی اسناد کی واقفیت، 2۔ نازل اسناد کا علم، 3۔ راوی کی صداقت، ثقاہت، مقررہ اصول کی صحت وخوبی حفظ واتقان، دینداری واحتیاط وغیرہ، 4۔ مسانید کا علم، 5۔ موقوف روایتوں کی واقفیت، 6۔ مرسل روایتیں، 7۔ صحابۂ کرام اور ان کے طبقات ومراتب کی پہچان، 8۔ صحابۂ کرام کی مرویات جو حضورِ اکرم ﷺ سے روایت ہیں، مگر آنحضرت ﷺ کا نام پاک مذکور نہیں ہے، 9۔ منقطع اسناد کی واقفیت، 10۔ مسلسل الاسناد روایتوں کی واقفیت، 11۔ معنعن روایتیں، 12۔ معضل روایتیں، 13۔ مدرج کی پہچان، یعنی حضور ﷺ کے کلام میں صحابی کا قول کہاں کہاں ملتا ہے، 14۔ تابعین کو ان کے طبقات ومراتب کے اعتبار سے جاننا، 15۔ اتباع تابعین کی واقفیت، 16۔ بڑے اور چھوٹے راویوں کی پہچان، 17۔ رسول اللہ ﷺ کی اولاد اور صحابۂ کرام کی اولاد کا تفصیلی علم، 18۔ جرح وتعدیل پر عبور، یعنی: فن تعدیل کی پانچوں قسمیں اور فن جرح کی دسوں انواع کی واقفیت، 19۔ صحیح وسقیم روایتوں کی معرفت اور یہ فن جرح وتعدیل کے فن سے علیحدہ ہے، 20۔ فقہ حدیث کی واقفیت، 21۔ حدیثوں میں ناسخ ومنسوخ کا علم، 22۔ متنِ حدیث میں جو غریب الفاظ آئے ہیں، ان پر کامل عبور ہو، 23۔ مشہور حدیثوں کی واقفیت اور پہچان، 24۔ غریب حدیثوں کی واقفیت، 25۔ مفرد حدیثوں کی پہچان، 26۔ تابعین واتباع تابعین سے آج تک جو مدلّسین رُواہ ہیں، ان کی واقفیت، 27۔ عللِ حدیث کی واقفیت، یہ فن صحیح وسقیم روایتوں اور جرح وتعدیل سے الگ ہے، 28۔ روایات حدیث میں شاذ روایتوں کی پہچان، 29۔ متعارض ہم پلہ سنن کی واقفیت، 30۔ ان روایتوں کی واقفیت جو بہ لفظ اخبار آئی ہیں اور ان کی معارض کوئی دوسری حدیث نہیں ہے، 31۔ اس کی پہچان کہ کسی راوی نے روایت میں تفسیری وفقہی الفاظ بڑھا دیے ہیں، 32۔ راویوں اور محدثین کے مذہب وعقیدہ کا علم، 33۔ حدیثوں کا مذاکرہ اور بحث وتمحیص سے کھرے کھوٹے کی شناخت، 34۔ متنِ حدیث میں راویوں کی لغزشوں کی واقفیت اس سلسلہ میں کاتبوں کی

اصلاح آج بھی شہرت رکھتی ہے، 35۔ ان لغزشوں کی واقفیت جو محدثین سے سند کے بیان کرنے میں ہوئی ہیں، 36۔ صحابہ سے لے کر آج تک راویانِ حدیث کے بھائیوں اور بہنوں کا علم اور ان سب کے حالات و مراتب کی واقفیت، 37۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں ان لوگوں کی واقفیت، جن سے روایت ان کے ایک ہی شاگرد کے ذریعہ ملی ہے، خصوصاً صحابۂ کرام کی ایک جماعت ایسی ہے، جن سے صرف ان کی اولاد ہی نے حدیثیں روایت کی ہیں، 38۔ صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین کے قبائل کی واقفیت اور راویوں کے نسب کا علم، 39۔ حدیثوں کے قدیم صحیفوں اور نسخوں کا علم، جو مؤلف کے شاگردوں میں گردش کرتے رہے اور وہ لوگ ان مجموعوں سے روایت کرتے رہے، 40۔ محدثین کے ناموں کی واقفیت، کیونکہ سند میں کبھی تو راوی کا نام بیان کیا جاتا ہے اور کبھی ابنیت بتائی جاتی ہے اور کبھی ابوت و امومت کی نسبت پر اکتفا ہوتا ہے، 41۔ صحابہ، تابعین و تبع تابعین کی کنیتوں کی واقفیت، 42۔ راویانِ حدیث کے وطن و شہر کا علم اور ان کے اسفار و اقامت گاہوں کی واقفیت، 43۔ راویانِ حدیث میں جو لوگ موالی ہیں، یا موالی کی اولاد ہیں، ان کی صحیح واقفیت، 45-44۔ محدثین کے القاب کی واقفیت، کیونکہ بعض رُواۃ نام کنیت کے بجائے اپنے پسندیدہ یا ناپسندیدہ لقب سے مشہور ہیں، 46۔ تابعین، اتباع تابعین اور دیگر علمائے اسلام اور راویانِ حدیث کے اقران، 47۔ معاصرین کی واقفیت اور ان کی ایک دوسرے سے روایتِ حدیث، راویوں کے ناموں، کنیتوں، شہروں، خاندانی بستیوں، اور پیشوں میں جو اشتباہ و مماثلت ہے، ان میں امتیاز حاصل ہو اور یہ تشابہ تجنیس خطی اور تجنیس صوتی دونوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اعراب و نقاط کے تغیر سے بہت فرق پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً بصری، نصری، نفری یا بجلی، بخلی اور نجلی وغیرہ، اس تشابہ کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں، سند کو پرکھنے کے لیے ان سب پر کامل عبور ضروری ہے، 48۔ حضورِ اکرم ﷺ کے مغازی، سرایا اور بعوث کی واقفیت، ان میں شریک ہونے والوں کا علم، ثابت قدم و غیر ثابت قدم افراد کی پہچان اور جو مصائب و شدائد پیش آئے اور وقتی حالات کے لحاظ سے جو احکام دیے

گئے ان کی معرفت، 49۔تابعین وتبع تابعین میں مشہور ثقہ راویوں کی واقفیت اور ان کی خدماتِ حدیث کا علم، 50۔محدثین نے اپنے مجموعوں کو جتنے ابواب میں تقسیم کیا ہے، ان کا علم اور ان کے اسباب ووجوہ کا علم اور جو ابواب ان کے صحیفوں میں اندراج سے رہ گئے ہیں، ان کے وجوہ واسباب کی واقفیت، 51۔ان تابعی رواۃ کا علم، جن کی روایتیں صحاح میں درج نہیں ہیں اور ان راویوں کے خلاف بھی کوئی تنقید نہیں ہے، اور 52۔محدثین کی راویوں کی واقفیت کہ سماع، کتابت اور عرض کردہ روایتوں میں ردوقبول کی کیا صورتیں ہیں۔

یہ باون (52) امور حدیثوں کے نقد وتعدیل کے لیے اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی مختلف ذیلی شاخیں ہیں، ہمارے اسلاف صالحین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم نے ان تمام اصولوں اور ان کی ضمنی شاخوں پر علیحدہ علیحدہ ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور یہ تمام علمی سرمائے دینِ مبین کے ساتھ امتِ مسلمہ کو وراثتاً ملے ہیں۔

خیال فرمائیے کہ عہدِ رسالت ﷺ کی چوتھی صدی ہجری تک اکابرِ ملت وحاملینِ دین کی یہ ساری کوششیں فضول تو نہ تھیں۔ تاریخ وسیرت ہی پر اگر لکھنا تھا، تو ہر دور میں بڑے وسیع میدان ہیں، جہاں انسان اپنا جوہر دکھا سکتا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ علماء ومحدثین حدیثوں کے جمع وتدوین اور راویوں کی جرح وتعدیل میں مشغول رہے اور تمام ملت ان بزرگوں کی اس سعیِ جمیل کو سراہتی رہی اور اپنے دین ودنیا کی بہتری کے لیے قبول کرتی رہی۔ اگر حدیثوں کی دینی اہمیت نہ ہوتی، تو عوام وخواص ان کے درپے نہ ہوتے۔

غریب راویوں کی سوانح وسیرت سے زیادہ بہتر تھا کہ اہلِ اقتدار کی سوانح لکھتے، ملک کی تمدنی وثقافتی تاریخ لکھی جاتی تو ان حضرات کو زیادہ سے زیادہ دنیاوی فوائد حاصل ہوتے، مگر ان بزرگوں نے حکومت واہلِ حکومت کی تاریخ، مملکت ونظامِ مملکت کے حالات قلم بند کرنے کے بجائے راویوں کی چھان بین میں اپنی عمریں گزار دیں اور ان کے ہم عصر عوام نے بھی ان کی مشقت وسعی کو سراہا، یہ ایسی باتیں تو نہیں ہیں کہ بہ آسانی ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ لوگ حدیثوں پر تنقید نہ کریں اور راوی و روایت پر جرح و تعدیل سے باز رہیں۔ اگر کسی کو اللہ نے صلاحیت اور وقت عطا کیا ہے، تو ضرور اس کام میں دلچسپی لیں، مگر جو قدم بھی اس راہ میں اٹھائیں، محض سطحی علم نہ دنیا میں کارآمد ہے نہ دین میں، جب تک مذکورہ باون اصول اور ان کی ذیلی شاخوں پر عبور نہ ہو اور وہ تمام تصانیف، جو ان اصول سے متعلق اسلاف نے مرتب کی تھیں، اچھی طرح حافظے میں موجود نہ ہوں، اس وقت تک اس راہ میں کوئی پیش قدمی مفید نہیں ہوگی۔

اسی لیے ہماری گزارش ہے کہ نہ اب وہ پہلا ماحول ہے، جبکہ مدارس میں مواعظ تھے، مساجد میں اور منبروں پر راوی و روایت کا ذکر تھا۔ جرح و تعدیل کے چرچے تھے اور نہ اب ان تمام مذکورہ اصول و ذیول سے متعلق ساری تالیفات پر کسی کو عبور رہی ہے، علاوہ ازیں اگر جرح و تعدیل اور معرفتِ حدیث سے متعلق تصنیفات ہی کی مدد سے کام کرنا ہے، تو اسلاف اس اہم فرض کو پورے طور پر انجام دے چکے ہیں۔ ثقہ و غیر ثقہ راوی، صحیح و ضعیف روایت پر تفصیلی بحث کر کے ان کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے، ہمیں چاہیے کہ ان سے استفادہ کریں۔

صحابہ، تابعین اور علمائے محققین کو جرح و تعدیلِ حدیث کے لیے جو سہولتیں حاصل تھیں، اب بدلے ہوئے حالات میں ممکن نہیں، اُنھیں کے قول سے یہ بات معلوم کر کے کہ فلاں راویِ حدیث کا حافظہ ضعیف تھا، اس حدیث پر اعتراض کرنا لغو ہے۔

کوئی شخص جو آپ کے نزدیک غیر محتاط یا کمزور حافظے والا ہے، ایک خبر بیان کرتا ہے اور یہی خبر بجنسہٖ دوسروں کی زبانی بھی آپ سنتے ہیں اور بالآخر سچ سمجھ کر آپ قبول کر لیتے ہیں اور واقعے کے لحاظ سے وہ خبر سچی بھی ثابت ہوتی ہے، مگر اس واقعے کے اندراج کے ساتھ اگر آپ خبر رساں کے حالات بھی قلمبند کریں گے، تو آپ اس کی کمزوریوں کا تذکرہ ضرور کریں گے، حالانکہ اس کمزور حافظے والے غیر محتاج راوی کی خبر آپ قبول کر چکے ہیں۔

اس قبول کی وجہ ہم عصری تھی، کیونکہ جس واقعے سے متعلق خبر دی گئی، وہ آپ کے

زمانے میں ظاہر ہوا اور ذریعۂ علم اس راویٔ اول کے علاوہ دوسرے بھی تھے، جو صرف آپ کو میسّر آئے بعد میں آنے والوں کو یہ سہولتیں حاصل نہیں ہوں گی۔

اسی لیے بعد میں آنے والے کسی حدیث کو ضعیف راوی سے سن کر فوراً رد کر دیں، تو یہ ان کی غلطی ہے، بلکہ ان کو چاہیے کہ وہ وجوہ و اسباب معلوم کریں کہ اس ضعیف راوی کے بیان کو کسی مستند محدث نے کیوں قبول کیا؟ اس حدیث کی تائید میں اور دوسرے شواہد وثبوت کیا تھے؟ جب تک تمام کتبِ حدیث اور ان کے تمام راویوں پر کامل دسترس نہ ہو، آج ہزار سال پیشتر کے قبول و رد کے متعلق آخری فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دوسری صدی ہجری کی روایتوں میں صحابی تک سند دو ایک راویوں کے ذریعے پہنچ جاتی تھی، لیکن سو دو سو برس بعد پانچ سات کڑیوں کا اضافہ ہو گیا، جس کا اثر سند کے ضعف وقوت پر پڑتا ہے، مثلاً: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حدیثیں عموماً تابعین سے ملیں، یعنی: صحابی اور امام کے درمیان صرف ایک واسطہ تھا اور اس ایک راویٔ وسط کے حافظے اور دینداری کا صحیح علم تھا، امام نے روایت قبول کر لی، لیکن یہی روایت اسی سند سے پانچ مزید واسطوں کے بعد چوتھی صدی ہجری کا ایک محدث بیان کرتا ہے، ممکن ہے کہ ان نئے پانچ درمیانی راویوں میں کوئی شخص ضعیف حافظے والا آ گیا ہو اور وہ روایت جو امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو صحیح پہنچی تھی، اس محدث تک پہنچے میں ضعیف ہو گئی، اس محدث نے راوی کے ضعف کا اقرار کر کے حدیث کو صحیح قرار دیا؛ کیونکہ عملی تواتر اور دوسری روایتوں سے اس کی تصدیق حاصل ہو گئی۔ اس لیے اصل روایت تو صحیح تھی، اگرچہ درمیان میں نیچے کا ایک راوی کمزور تھا۔ اس تصدیق و تردید میں ماحول و زمانہ کی جو مدد اگلوں کو حاصل تھی، اب ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اگلوں پر اعتماد کریں اور اگر حدیثوں کو پرکھنا چاہیں، تو فنِ حدیث کے تمام اصول و فروع پر عبور حاصل کریں اور کسی وقت کوئی پہلو نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

آج جو دو ایک برگشتہ (مخالف) افراد اسماء الرجال سے دو ایک تنقید نقل کرتے رہتے ہیں یا کتاب الموضوعات کی دو ایک روایت بیان کر کے تمام حدیثوں کے متعلق معاندانہ فیصلہ کرتے ہیں، ان کی مثال اندھوں کے اس گروہ کی ہے، جس نے ہاتھی کے کسی ایک عضو کو ٹٹول کر پورے ہاتھی کی الگ الگ تعریف کی۔

اس سے قطع نظر صحیح حدیثوں کے انتخاب اور موضوع روایتوں کی پہچان کے لیے عقل وتجربے کے نزدیک دوسری شرط اور بھی ہے، وہ یہ ہے کہ قلبِ سلیم، نگاہِ مستقیم، اخلاص اور دیانت موجود ہو، حق کی طلب ہو، صداقت ہو، شعور ہو، پھر آپ کے لیے آسان ہوگا کہ صحیح روایتوں کو اختیار کر لیں اور مشتبہ کو چھوڑ دیں۔ کسی کی مجال نہیں ہے، یہ دعوی کر سکے کہ سارے ذخائرِ حدیث میں تمام روایتیں موضوع اور جھوٹ ہیں، یا اس معنی میں سب ہی صحیح ہیں کہ راویان اور محدثین نے پہلے ہی صحیح اور غلط کو الگ الگ کر دیا ہے، جو صحیح ہیں، وہ صحیح ہیں، جو غلط ہیں، وہ غلط ہیں۔

اگر حدیثوں کا مطالعہ مخالفت وعناد کے جذبے سے کیا گیا، تو ان حدیثوں سے ہدایت پہنچنا تو کجا، اس جذبے سے قرآن مجید کا مطالعہ بھی نقصان دہ ہے۔

دشمنانِ قرآن کو اللہ کی یہ روشن کتاب بھی منزل تک نہیں پہنچا سکتی بلکہ يُضِلُّ بِهِ كَثِيراً [1] (یعنی قرآن سے بہت سے گمراہ ہوجاتے ہیں)، حدیثوں کا مطالعہ بھی معاندانہ ہوگا، تو اس سے بھی گمراہی حاصل ہوگی۔

متنِ حدیث سے استفادے کے طریقے:

گذشتہ صفحات میں حدیث کی سند اور اصولِ جرح وتعدیل کی طرف اشارے کئے گئے تھے اور وہ علوم وفنون بتائے گئے تھے، جو سند کے اعتبار سے حدیثوں کی صحت وسقم جاننے کے لیے ضروری ہیں۔ جب کوئی شخص تمام لوازم وشرائط کو ملحوظ رکھ کر صحیح حدیث کا انتخاب کرنے میں کامیاب ہوگیا، تو پھر متنِ حدیث سے استفادہ وانتفاع کی منزل آتی

1- سورۃ البقرہ:26

ہے۔ یہاں پہنچ کر صحیح ہدایت حاصل کرنے کے لیے بھی چند شرطوں کی پابندی ضروری ہے، اگر یہ شرطیں اچھی طرح ذہن میں محفوظ نہیں رہیں گی، تو کوئی طالبِ حق حدیثوں سے صحیح فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

متنِ حدیث کی اقسام:

حدیثیں تین قسم کی ہیں:

اول: قولی یعنی وہ روایتیں جن میں: ''قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ'' کہہ کر امر و نہی سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال بیان کیے جاتے ہیں۔

دوم: وہ حدیثیں، جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی عمل و فعل کا تذکرہ کیا ہے۔

سوم: وہ روایتیں، جن میں مذکور ہو کہ کسی صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یا آپ کی واقفیت میں کوئی کام کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشاہدہ و علم کے باوجود ان کو منع نہیں فرمایا۔

شروعِ اسلام سے آج تک تمام مسلمان ان تینوں قسموں کی روایتوں کو قبول کرتے رہے اور ان کے مطابق بھلے برے کاموں میں فرق کرتے رہے، پہلی دونوں قسموں کی حجت تو ظاہر ہے، ہاں! تیسری قسم کے رد و قبول میں ممکن ہے بعضوں کو لاعلمی کی وجہ سے شبہ نظر آئے، لیکن جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب سے آگاہ ہیں اور نبوت و رسالت کی ذمہ داریوں کو جانتے ہیں، ان کے نزدیک تیسری قسم کی روایتیں جنھیں ''تقریری روایت'' کہتے ہیں، بلا فرق حجت و دلیل ہیں، کیونکہ تبلیغِ دین، فریضۂ رسالت ہے اور کوئی مؤمن اگر اپنی لاعلمی سے ناپسندیدہ افعال کا مرتکب ہو، تو یہ ذمہ داری رسول کی ہوتی ہے کہ وہ بروقت اصلاح کر دیں، اپنے پیرو کے کسی عمل پر نبی کا خاموش رہنا، اس فعل کے صحیح اور جائز ہونے کی دلیل ہے۔ انبیاء کبھی باطل پر سکوت اختیار نہیں کر سکتے، نہ اپنے ماننے والوں اور جان نثاروں کے حق میں اور نہ غیروں کے حق میں۔

متنِ حدیث کی روایتیں:

جس طرح حدیثیں تین طرح کی ہیں، اسی طرح ان کی روایتوں میں بھی بہت فرق اور امتیاز ہے۔ قولی روایتیں جن کو حضورِ اکرم ﷺ کا قول کہہ کر بیان کرتے ہیں، وہ اپنی اہمیت اور اثر کے لحاظ سے بقیہ دونوں اقسامِ حدیث سے زیادہ ممتاز ہیں، ان کی حیثیت فرمانِ عام اور دینی قانون کی ہے، جس سے سرتابی (انحراف) اور عدول، بغاوت اور قانون شکنی ہوگی۔

حضور ﷺ سے متعلق تمام چھوٹی بڑی باتیں تو بہر حال روایت کر دی گئیں ہیں، لیکن قولی روایتوں کو عملی وتقریری حدیثوں کے مقابلے میں جو اہمیت حاصل تھی، راویانِ حدیث نے روایتوں میں بھی ان کا پورا پورا لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ عملی وتقریری حدیثیں تو بالمعنی روایت ہوتی ہیں، لیکن قولی حدیثیں جن کا آغاز ''قَالَ رَسُولُ اللہ علیہ السلام'' سے ہوتا ہے، انتہائی کوشش کی گئی ہے کہ لفظ ومعنی دونوں اعتبار سے بجنسہٖ بیان ہوں، کیونکہ قانون کے الفاظ کی اہمیت معنی سے کم نہیں ہیں، اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ صحابہ سے آج تک قولی مرویات میں علمائے اعلام وفقہائے عظام معنوی استناد کے ساتھ الفاظ کو بھی دلیل بتاتے آئے ہیں۔

عملی وتقریری حدیثوں میں چونکہ آنحضرت ﷺ کے الفاظ شامل نہ تھے، وہ بامعنی روایت ہوتی رہیں، ممکن ہے کہ کسی راوی یا فقیہ نے اپنے فتوے یا کسی مسئلے کی تائید میں کسی قولی حدیث کا محض مضمون بیان کر دیا ہو، جیسا کہ آج بھی واعظین، خطباء اور فقہاء کا طریقہ ہے، یا عام لوگ حضور ﷺ کی حدیث کہہ کر اردو زبان میں صرف اس حدیث کا مضمون بیان کر دیتے ہیں، مگر جب با قاعدہ روایتِ حدیث کہہ کر کوئی شخص حضور ﷺ کا قول بیان کرتا ہے، تو اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بجنسہٖ حدیث کے الفاظ ہی ادا کرے۔ چنانچہ قولی احادیث کئی جداگانہ راویوں سے ایک ہی انداز والفاظ میں مذکور ہوں، تو ہمیں ایسی روایتوں کو بالمعنی وباللفظ دونوں حیثیت سے قبول کرنا چاہیے۔ متقدمین اسلاف کا طریقہ تھا

کہ بالمعنیٰ روایت کی صراحت فرما دیتے تھے، تاکہ تابعین کو "قَالَ رَسُولُ اللّٰہ علیہ السلام" سُن کر روایت باللفظ کا دھوکہ نہ ہو۔ پچھلے صفحات میں ہم بتا چکے ہیں، صحابۂ کرام جماعتیں بنا کر حدیثیں بیان کرتے تھے، اس طریقہ کار میں بسا اوقات الفاظِ حدیث کے تحفظ کا خیال بہت اہم تھا۔ صحابۂ کرام و تابعین اولیٰ کے جمع کردہ صحفِ حدیث میں تو بہرحال الفاظ ومعانی دونوں آنحضرت ﷺ ہی کے ہوتے تھے۔ لہٰذا سلف صالحین معنی کے ساتھ الفاظِ حدیث کو بھی اسی تعین واعتماد کی وجہ سے اپنے لیے دین کی دلیل سمجھتے تھے اور فقہی مسائل کے استنباط میں ان الفاظ سے بھی مدد لیتے تھے۔

حدیثوں کے الفاظ ومعانی سے استفادہ کی شرطیں:

جب کوئی حدیث آپ کے سامنے آئے تو آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ قرآن مجید سے اس کا مقابلہ کریں۔ یاد رکھیے کہ ہر وہ روایت جو قرآن مجید کی ضد اور مخالف ہے، حضور ﷺ کا قول وفعل نہیں کہلا سکتی، کیونکہ خدا اور رسول نہ تو دو مخالف سمتوں میں ہمیں چلنے کا حکم دیتے ہیں اور نہ دو کشتیوں پر سوار کرا کے تباہ کرتے ہیں۔ حدیثیں قرآن مجید کے اجمالی احکام کی شرح ہیں، یا ان کے لیے تتمہ وبیان ہیں اور ان حدیثوں پر قرآن کے ساتھ عمل ممکن ہے، لہٰذا متنِ حدیث سے استفادہ کے لیے مندرجہ اُمور ضروری ہیں:

اوّل: قرآن مجید کی ضد ومخالف نہ ہوں۔

دوم: مسلماتِ اہلِ اسلام کے خلاف نہ ہوں، یہ دوسری شرط جس طرح حدیثوں کے معنوی اعتبار کے لیے اہم ہے، اسی طرح قرآن مجید کے فہمِ معنی کے لیے بھی ضروری ہے۔ مثلاً: کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ قرآن مجید کا مفہوم دینی مسلمات کے خلاف اپنی رائے سے اختیار کرے اور یہ کہے کہ: كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ [1] (یعنی تم بے جان تھے اللہ نے تمھیں حیات بخشی، پھر تم کو موت دے گا، اس کے بعد پھر تم کو زندگی عطا کرے گا) سے آواگون اور پھر تناسخ ثابت ہوتا ہے، یا اسی طرح

1- سورۃ البقرہ:28

یوم القیامۃ کے معنی حشر کا دن نہیں، بلکہ اٹھ کھڑے ہونے کا روز مراد ہے۔ یہ معانی چونکہ مسلماتِ اسلام کے خلاف ہیں، اس لیے ناقابلِ قبول اور مردود ہونگے۔ قرآن کے معانی اسلامی اصطلاح اور مسلماتِ دین کے مطابق ہی لیے جائیں گے اور یہ مسلماتِ دین احادیث ہی سے ثابت ہیں۔

ایک گمراہی کی اصلاح:

آج کل کچھ لوگ دین سے نکل کر اندھا دھند حصارِ شریعت پر گولہ باری کر رہے ہیں اور وہ تمام حدود و قیود جو اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم کی ہیں، آج دشمنانِ ملت کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ احکامِ اسلامی میں نماز کا مرتبہ کتنا بلند اور روشن ہے۔ نفاذ کے لحاظ سے بھی یہ پہلا فرض ہے اور قیامت میں سوال کے اعتبار سے پہلی پُرسش نماز کے متعلق ہوگی۔ ہر ملت کے لیے ایک جماعتی نشان اور قومی علامت ہوتی ہے، اسلام میں نماز کو وہی مقام حاصل ہے۔ جس شخص کا اسلام سے جتنا تعلق ہوگا، اس روحانی و دینی علامت میں بھی اسی تناسب سے اس کا حصہ ہوگا۔ مسلمان کی یہ دینی و مذہبی پہچان زنار وصلیب جیسی نہیں ہے اور نہ برس چھ مہینے میں اس علامتِ دین کا اظہار ہوا کرتا ہے، بلکہ روزانہ پکار پکار کر پیروانِ اسلام کو ایک جگہ اکٹھا کر کے صبح وشام پانچ بار اس علامت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور یہ طریقہ نیا نہیں، بلکہ اسلام کے ابتدائی دور سے رائج ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے حکم سے اذان دی جاتی تھی، لوگ روزانہ مسجد میں جمع ہوتے تھے اور با جماعت نماز ادا کرتے تھے۔ ایک ایسی عبادت جس کی پابندی آج، (ساڑھے) چودہ سو سال سے ہوتی چلی آرہی ہے، کیا اس میں کسی کو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ اپنی طرف سے کوئی اپج (ابھار) پیدا کرے!

دن رات میں پانچ فرض نمازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت سے آج تک قائم اور نافذ ہیں، مکہ کا مینارہ اور مدینہ کی اذان گاہ شاہد ہیں کہ اس طویل مدت میں غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دن رات میں پانچ بار جمع ہوکر پانچ فرض نمازیں روزانہ ادا کرتے آئے ہیں۔ اس لیے

پانچ نمازیں مسلماتِ دین میں سے ہیں اور اس وقت سے آج تک مسلمانوں کے تمام فرقے اور گروہ اس کا اقرار کرتے ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص قرآن مجید کے معنی اس کے خلاف بیان کرے گا، تو لاریب مردود ہوگا؛ کیونکہ قرآن مجید کی کسی آیت کا کوئی مفہوم مسلماتِ دین کے خلاف نہیں لیا جا سکتا۔ یہی حال حدیثوں کے مفہوم کا بھی ہے کہ ان کے معنی کبھی مسلماتِ دین کے خلاف معتبر نہیں ہوں گے۔ نماز کے فروع اور تفصیلات کو پیش کر کے اگر کوئی شخص گمراہ کرنا چاہے، تو یہ اس کی بڑی نادانی ہوگی۔ نماز کی تفصیلات میں دو طرح کے اعمال ہیں، ایک قسم وہ ہے، جن کی حیثیت مسلماتِ دین کی ہے۔ تمام مسلمانوں اور ان کی مختلف جماعتوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، مثلاً قیام، قعود، رکوع، سجود یہ چاروں امور ارکانِ نماز ہیں اور مسلماتِ اسلام ہیں، ان میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ ان کے علاوہ کچھ تفصیلی فروع ایسے ہیں، جن میں باہم فرق وامتیاز ہے، تو اگرچہ وہ سب حضور ﷺ سے ثابت ہیں، مگر ان کی حیثیت مسلماتِ دین کی نہیں ہے، شارع ﷺ نے ان جداگانہ طریقوں کو اختیار کر کے ہمیں بتادیا کہ نماز کے اندر کون سے اعمال کو مسلماتِ دین کا مقام حاصل ہے اور کون سے اعمال فروعی ہیں، جن میں انسان کسی ایک کو اختیار کر کے صحیح نماز ادا کرسکتا ہے، تاکہ ہماری غلامی اور آزادی کا مظاہرہ ساتھ ساتھ ہو۔ حضورِ اکرم ﷺ سے ثابت شدہ ہر طریقہ اپنے اندر ایک نور رکھتا ہے اور اس میں ایک خاص ہدایت ہے۔ اپنے دینی مزاج کے مطابق ان مختلف روحانی نسخوں میں سے کسی کو اختیار کر کے کمالاتِ روحانی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

متنِ حدیث کی تیسری شرط:

حدیثوں سے صحیح استفادہ کے لیے ضروری ہے کہ ہم جان سکیں کہ راوی اگر کوئی خاص عقیدہ وخیال رکھتا ہے اور اپنی اس روایت میں اس عقیدہ کی تائید پیش کر رہا ہے، تو جب تک اس روایت کی تائید کسی اور ذریعے سے نہ ہو، تو محض اس تنہا بیان کی بنا پر جماعتی رائے اور فیصلے کو مشکوک نہیں کر سکتے، مثلاً: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخالفت اور ان کو بُرا کہنا

خارجی عقیدے کا جزو ہے، اگر کسی خارجی کی روایت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف سامنے آئے، تو ہمیں ان روایتوں کے قبول کرنے سے پہلے ان بیانات کے تائیدی شواہد کی جستجو کرنی چاہیے، کیونکہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بُرا کہنا جماعتِ مسلمین سے الگ راہ روی ہے۔ ایسے متونِ حدیث اگر صحیح ثابت ہوں تو ان کے معنی وہی مراد لیے جائیں گے، جو دوسری روایتوں کے موافق اور جماعتِ مسلمین کی رائے کے مطابق ہوں۔

متنِ حدیث کی چوتھی شرط:

اکثر محدثین بعض اوقات کسی طویل حدیث کا وہ حصہ بیان کرتے ہیں، جو خاص موقع ومحل کے مناسب ہوتا ہے، یا بطور اشارہ حدیث کے دو ایک جملے روایت کر دیتے ہیں، تاکہ پوری حدیث کی طرف رجوع کیا جائے، لہٰذا متنِ حدیث سے استفادے کے لیے ضروری ہے کہ پوری حدیث سامنے رکھی جائے ورنہ بعض اوقات سخت غلطی کا امکان ہے۔

متنِ حدیث کی پانچویں شرط:

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید کلامِ خدا ہے اور حدیثیں بشرِ کامل کا کلام ہیں، اور دونوں عربی زبان میں ہیں، جب سادہ اور سلیس کلامِ الٰہی کو سمجھنے کے لیے عربی لغت، اسلامی اصطلاح اور حدیثوں کی استعانت ضروری ہے، جیسا کہ پہلے ہم بتا چکے ہیں، تو پھر حدیثوں کو سمجھنے کے لیے بھی عربی زبان دانی، اسلامی اصطلاح، دوسری حدیثوں، قرآن مجید کی آیتوں اور صحابۂ کرام کے آثار کی زیادہ ضرورت ہے۔ روایت باللفظ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلمات ہوتے ہیں، مگر روایت بالمعنی میں صحابۂ کرام کے الفاظ ہیں اور یہ تمام حضرات بہر حال طرزِ ادا اور قوتِ بیان میں ایک دوسرے کے مقابلے میں کم وبیش ضرور ہیں۔ اس لیے متنِ حدیث سے استفادہ اور ان کے رد وقبول کے لیے عربی زبان، قرونِ اولیٰ کے دینی ماحول کی واقفیت زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔

متنِ حدیث سے کامل استفادہ کی چھٹی شرط:

مسائل کے استنباط کا ملکہ ہو اور فقاہت کے تمام اصول وضوابط از بر ہوں، تاکہ جب

کوئی متنِ حدیث سامنے آئے تو انسان اس کی روشنی میں اپنی دینی ودنیاوی مشکلات کا حل معلوم کر سکے اور اس حدیث سے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی طرف سے ذہن غافل نہ ہو۔

اگر مضمون کی طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا، تو مسائل کے استنباط کے لیے پہلی صدی ہجری سے چوتھی صدی ہجری تک یا مابعد زمانوں میں علمائے اعلام اور مجتہدین نے جو قواعد وضوابط بیان کیے ہیں، ان کو یہاں دُہرا دیا جاتا۔ لیکن سلف صالحین کی یہ ساری کوششیں اللہ کے یہاں مقبول اور امتِ مسلمہ کے نزدیک پسندیدہ و مستحسن ہیں اور بحمد اللہ اس سلسلے میں ان بزرگوں کے کتابی ذخیرے، امصار و دیار میں علماء کے پاس موجود ہیں۔ جو صاحب چاہیں، دین کے ان خادموں اور اسلاف کے باقیات الصالحات کی طرف رجوع کریں اور تفصیلی معلومات حاصل کر لیں۔ اصولِ فقہ بطورِ خود علوم اسلامیہ کا ایک مستقل شعبہ ہے اور اس فن میں بڑی ضخیم کتابیں ہزاروں کی تعداد میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ان تمام کتابوں کی واحد غرض صرف یہ ہے کہ دین کی حجت اور دلیل، قرآن وحدیث ہیں۔ یہی دو بنیادیں حضور ﷺ نے صحابۂ کرام کو عطا کیں اور صحابہ نے امت کو تعلیم دی اس لیے ان دونوں کی مدد سے ہم کس طرح اپنے دینی ودنیاوی فلاح ونجات کے راستے اختیار کر سکتے ہیں۔ مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ (1)، یعنی جب اللہ کسی کی بہتری کا ارادہ کرتا ہے، تو اسے دین کی فقاہت عطا کرتا ہے۔

❖❖❖❖❖

1- صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من یرد اللہ بہ خیرا، رقم: 71

باب یازدہم:
''احادیث سے استفادہ کے متعلق دیگر اہم امور''

(مقامِ رسالت ۔توحید ورسالت کی اسلامی فہم ۔قرآن اور حدیث کا باہم ربط ۔قرآن کی تفسیر کے طریقے ۔حدیث کی اصلاح اور قرآن)

مقامِ رسالت:

دین میں حدیثوں کا مقام اور سنت کا مرتبہ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم رسالت کے منصب ومقام کو سمجھ لیں اوراللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی جو حیثیت بتائی ہے، اس کو تسلیم کریں ۔جب تک منصب رسالت کی اہمیت واضح نہ ہوجائے ،حدیثوں کا صحیح مقام سمجھ میں نہیں آئے گا۔

رسول کی حیثیت کیا ہے اور ہمارے جیسے ایک بشر کو یہ بزرگی کیوں حاصل ہوگئی کہ ہر غیرِ نبی ان کے تمام قول وفعل اور امر ونہی کے قبول واتباع کا پابند ہے ۔یہی وہ مسئلہ ہے جس کی صحیح واقفیت کا نام ''اسلام '' ہے، ورنہ رسول کی صرف بشری حیثیت پر نظر سے گمراہی پیدا ہوتی ہے اور بالآخر اپنے جیسے انسان کی عظمت کا انکار کرکے، انسان کافرو بے دین ہوجاتا ہے۔

لہٰذا رسول کا مقام ومنصب معلوم کرنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ اس تھوڑی بہت عقل کی مدد سے جو اللہ نے ہر انسان کو عطا کی ہے، خود اللہ کو پہچانیں اور اس کی عظمت وکبریائی کا اقرار کریں کیونکہ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ(ﷺ) میں الوہیت ورسالت کا اقرار اس طرح باہم پیوستہ ومتلازم ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔

اللہ کا اقرار:

ہمارا خطاب مسلمانوں سے ہے، جو اللہ تعالیٰ، اس کی تمام صفات اور حقوق پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں۔ قرآن مجید کو کلام الٰہی تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو عقلی دلائل اور سائنس کے شواہد کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف اس قدر یاد دلا دینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کا خالق ہے، رب ہے، موت و حیات اس کے قبضے میں ہیں، نفع و نقصان کا اختیار اسی کو ہے اور وہی ہمارا مالک ہے، بادشاہ ہے اور حقیقی حاکم ہے، ہم سب اللہ کی مملکت میں بستے ہیں، اس لیے اس کی اطاعت ہم پر فرض ہے، نہ کسی اور کو حاکم بنا سکتے ہیں اور نہ اُس کے حکموں کی بجا آوری میں پس و پیش کر سکتے ہیں؛ کیونکہ ایسی ہر حرکت، بغاوت و سرکشی کہلائے گی۔ اور جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی ساری مملکت کے لیے احکام و قواعد مقرر کر دیے اور ان کے نفاذ کا اعلان کر دیا، تو اب کسی کو ان قوانین کے خلاف لب کشائی کی گنجائش نہیں رہی، قرآن مجید مملکتِ الٰہی کا دستور ہے، آئین ہے، قانون ہے اور ضابطہ ہے، ان قوانین کو لانے والے پڑھ کر سنانے والے تمام دفعات کو سمجھانے والے اور نافذ کرنے والے اللہ کے رسول ہیں۔

> يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (1)
>
> یعنی ''اللہ کے رسول ﷺ اس کے احکام لوگوں کو پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو نافذ کر کے لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں اور اس دستوری کتاب کی تمام دفعات لوگوں کو سمجھاتے ہیں''۔

اللہ کی اس دستوری کتاب میں رسول کا مقام و منصب جو کچھ درج ہوگا، مملکتِ الٰہی کے ہر باشندے پر فرض ہے کہ اس کے مطابق رسول کا مرتبہ تسلیم کرے، قرآن کے بتائے ہوئے آئین کی مخالفت اور رسول ﷺ کے دستوری حق کا انکار، دراصل اللہ تعالیٰ سے بغاوت ہے۔

1- سورہ آل عمران:164

رسول ﷺ کا مقام قرآن میں:

حاکمِ حقیقی تو اللہ ہے، لیکن یہی حق اگر اس نے رسول کی طرف منتقل کر دیا اور اپنے دستور میں رسول کو حاکم بنا دیا ہے، تو اب رسول کے ہر حکم کی بجا آوری ہمارا فرض ہے اور یہ ذمہ داری رسول کی ہوگی کہ وہ خدا کے حکموں کے مطابق ہم پر حکومت کریں، کوئی بات اپنی خواہش سے نہ کہیں اور اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ رسول کا کوئی فرمان معاذ اللہ اگر خود ساختہ ہے، تو یہ معاملہ اللہ اور اس کے مقرر کردہ حاکم کا درمیانی مسئلہ ہے، افسرِ مجاز جب تک اپنے منصب سے معزول نہ ہو، عوام پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ رہی یہ بات کہ آیا! رسول ﷺ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ہم پر حکومت کرتے ہیں، یا اپنے عہدے کو معاذ اللہ من مانی برتری کا ذریعہ بناتے ہیں اور جو کچھ اپنے دل میں آتا ہے لوگوں کو حکم دیتے ہیں، تو اللہ جلّ وعلا نے اس کی طرف سے ہمیں مطمئن کر دیا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (1)

(ترجمہ:) رسول ﷺ اپنے دل سے کچھ نہیں فرماتے، ان کے تمام فرامین میں وحی والہام ہیں۔

رسول ﷺ حاکم علی الخلق کی حیثیت سے:

آنحضرت ﷺ کی حیثیت صرف ایلچی اور پیغام رساں کی نہیں ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے ہم پر حاکم بنا کر بھیجے گئے ہیں اور جس طرح ہر محکوم کا فرض ہے کہ، حاکم کا ہر حکم بجا لائے اور اس کے کسی حکم کی مخالفت نہ کرے، (اسی طرح) اللہ کا فرمانبردار بندہ بننے کے لیے ہم پر ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام احکام کو قبول کریں، ان کو بجا لائیں، سرِ مُو (بال کی نوک کے برابر بھی) گردن کشی (نافرمانی) نہ کریں۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ

1- سورۃ النجم:3،4

عَذَابٌ اَلِيْمٌ (1)

یعنی ''جو لوگ رسول کے حکموں کو نہیں مانتے ان کو ڈرنا چاہیے کہ اس مخالفت کی سزا میں عذاب الیم یا کسی اور مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں''۔

عذاب دینے کا اختیار اللہ کو ہے، مگر امر و نہی اور حلال وحرام کے نفاذ کا حق رسول ﷺ کو بھی حاصل ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (2)

یعنی ''رسول ﷺ نیک کام کا حکم دیتے ہیں، بُرے کاموں سے منع کرتے ہیں، پاکیزہ چیزیں حلال کرتے ہیں اور گندی چیزیں حرام کرتے ہیں''۔

رسول کے ان اختیارات کی واقفیت کے بعد کسی مسلمان کو جرأت ہوگی کہ رسول ﷺ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھے اور یہ کہے کہ حرام چیزوں کی یہ فہرست قرآن مجید میں نہیں ہے، بلکہ حدیثوں میں ہے، اس لیے ہم نہیں مانتے اور کتا، بلی، چوہا، گیدڑ اور سانپ وغیرہ کو اپنے دستر خوان کی زینت بنائے، بلکہ اللہ کے فرمان کے مطابق ایک مؤمن کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ:

وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (3)

یعنی ''رسول جو دیں، لے لو اور جس سے منع کریں، رک جاؤ''۔

ہم کون ہیں پوچھنے والے کہ رسول کا یہ حکم اپنے دل سے ہے، یا خدا کی وحی کے مطابق ہے! ہم تو رسول کی فرماں برداری کے پابند ہیں، کیونکہ ان کی اطاعت اللہ کے قانون کی اطاعت ہے:

1- سورۃ النور:63

2- سورۃ الاعراف:157

3- سورۃ الحشر:7

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ (1)

یعنی ''جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے، وہ اصل میں اللہ کا فرمانبردار ہے۔''

اور جب تک رسول کی حاکمیت بے چون و چرا تسلیم نہیں کی جائے گی، ایمان کا دعوی سراسر منافقت اور فریب ہے:

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡكَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَ یُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (2)

یعنی ''ہرگز نہیں رب اعلیٰ کی قسم! ہرگز وہ لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے، جب تک اپنے معاملات میں آپکو اے رسول! اپنا حاکم نہ سمجھیں تمھارے فیصلوں کو بہ دل وجان تسلیم نہ کریں اور ان فیصلوں سے ان کے دلوں کو کوئی تنگی پیدا نہ ہو''۔

گویا رسول اللہ ﷺ کو کمالِ حکومت حاصل ہے اور آپ کا ہر فیصلہ حرفِ آخر ہے، جس کی کوئی اپیل نہیں۔ کیا اس آیت قرآنی کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ حدیثیں ڈیڑھ ہزار برس پہلے عربی تمدن کی یادگار ہیں اور دورِ حاضر میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کی پابندی ہم پر نہیں! ہمارے تمام مسائلِ زندگی میں فیصلے کا حق صرف اللہ کو اور اس کے رسول کو ہے۔ جو لوگ ایمان کا اقرار کرنے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کی حاکمیت سے منہ موڑتے ہیں، وہ مومن نہیں ہیں:

وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ (3)

یعنی ''جب لوگوں کو بلایا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی طرف آؤ تا کہ

1- سورۃ النساء:80

2- سورۃ النساء:65

3- سورۃ النور:48

ان کے معاملات کے فیصلے اللہ کے حکموں اور رسول کے حکموں (کتاب وسنت) کے مطابق ہوں، تو یہ منافقین منہ پھیر لیتے ہیں''۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت:

اللہ کی فرماں برداری فرض ہے، کیونکہ ہم مخلوق ہیں اور اس کی رعایا ہیں، اللہ کے حکموں کے مجموعے کا نام قرآن ہے اور ہم پر رسول ﷺ کی اطاعت بھی لازم ہے، کیونکہ حاکم حقیقی اللہ جلّ وعلیٰ کا یہی حکم ہے اور رسول کے احکام کے مجموعے کا نام حدیث ہے:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (1)

یعنی'' آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو (قرآن کی) اور رسول کی اطاعت کرو (حدیث کی) پھر بھی اگر وہ لوگ پیٹھ پھیریں، تو بے شک اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا''۔

قرآن وحدیث کا باہم تعلق:

قرآن کلام خدا ہے، اس میں وہ تمام بنیادی قوانین درج ہیں، جو مالکِ حقیقی نے اپنی رعایا کو دیے ہیں۔ لیکن کتابِ آئین اور مجموعۂ دستور کا جو مطلب ہم سمجھیں گے، وہ معتبر ہے یا اس کا مفہوم متعین کرنا رسول کا حق ہے؟ جہاں تک قرآن مجید کا اپنا اسلوبِ بیان ہے، وہ تو وہی ہے، جو عام عربی زبان کا طرز تھا۔ لیکن قوانین کے دفعات کی تشریح ہمیشہ قانون ساز کے ذمہ ہوتی ہے، ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ قانونی موشگافی (نکتہ چینی) کرنے والے الفاظ کا مفہوم کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید اگرچہ عربی زبان میں ہے، مگر اس کی تشریح کے لیے رسول ﷺ کی زبان مبارک کی قید لگا دی ہے، قرآن آسان ہے، مگر رسول کی زبان کی مدد سے آسان ہے، کتاب اللہ کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بہت سہل، مگر یہ سہولت رسول اللہ کی حدیثوں اور ان کے عملوں سے ظاہر ہوتی ہے:

1- سورہ آل عمران:32

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (1)

یعنی ہم نے قرآن کو آپ کی زبان سے آسان کیا ہے، تا کہ لوگ نصیحت وہدایت حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کو آسان بنانے کا اعلان، تلاوت وقراءت کے لحاظ سے نہیں ہے اور نہ عربی الفاظ کے لغوی معنی کے لحاظ سے، یہ دونوں باتیں تو ہر عرب اور عربی خواں کے لیے آسان ہیں۔ اس میں حضور ﷺ کی زبان کو کیا خصوصیت ہے، بلکہ قرآن کی یہ سہولت فہمِ قرآن اور معانی ومطالب کے اعتبار سے ہے اور اس حیثیت سے جو آنحضرت ﷺ کو اہمیت حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں اللہ کا ارشاد ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (2)

یعنی ’’ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) اتارا تا کہ آپ وضاحت سے بیان کردیں لوگوں کے سامنے وہ تمام باتیں جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں۔‘‘

چونکہ قرآن مجید قانون ودستور کی کتاب ہے اور اس کے بیان ووضاحت کے لیے کسی معتبر شارح کی ضرورت تھی۔ اللہ جلّ شانہ نے تلاوت وتعلیمِ قرآن کے ساتھ ساتھ اس کے بیان ووضاحت کے لیے لسانِ پیغمبر کو مخصوص کردیا؛ لہٰذا حضور ﷺ بطورِ خود بھی قرآن مجید کی شرح فرماتے تھے اور جہاں مفہوم کے تعیین میں اختلاف کا اندیشہ ہوتا، تو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں زیادہ ہوجاتیں۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (3)

یعنی ’’ہم نے آپ پر کتاب اس لیے نازل فرمائی تا کہ آپ وہ باتیں لوگوں پر واضح کردیں، جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں‘‘۔

1- سورۃ الدخان:58

2- سورۃ النحل:44

3- سورۃ النحل:64

آپ کے بیانات اور وضاحتیں قرآن کے علاوہ ہوں گی اور ان ہی کو "حدیث" کہتے ہیں۔

قرآن کی وضاحت کے طریقے:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کی وضاحت کا کیا طریقہ اختیار کیا؟ جن احکامی آیتوں کو سمجھنے میں کوئی دشواری ہوسکتی تھی، آپ نے ان آیتوں کو دوبارہ بلند آواز سے پڑھ کر سنا دیا اور اپنی طرف سے کوئی مطالب بیان نہیں کیے، جیسا کہ بعض معلمین بچوں کو فارسی اشعار پڑھایا کرتے ہیں، اگر منکرینِ حدیث توضیحِ آیات وتبیینِ کتاب سے یہی مراد لیتے ہیں، تو بخدا! رسول ﷺ کو انھوں نے نہیں پہچانا اور اللہ کے مقرر کردہ حاکم کی قدر نہ کی۔ آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کے مطالب دو طرح ہمیں بتائے، ایک تو اپنے مبارک الفاظ سے اور دوسرے اپنے پسندیدہ اعمال سے تشریح کی۔ پہلی قسم کو "قولی حدیث" کہتے ہیں اور دوسری قسم کی وضاحت کا نام "فعلی حدیث" ہے اور اللہ تعالیٰ نے دو جداگانہ الفاظ میں ان دونوں قسم کی حدیثوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔

قولی حدیثوں کی تعمیل یعنی حضور ﷺ کے زبانی فرامین کے لیے قرآن مجید میں اطاعت کا لفظ آیا ہے اور جس طرح اللہ کے کلام، یعنی قرآن مجید کی اطاعت فرض ہے، اسی طرح رسول ﷺ کے اقوال کو قبول کرنا اور ان کے مطابق عمل پیرا ہونا فرض ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ [1] یعنی اللہ کے حکموں پر چلو اور رسول کے فرمان پر عمل کرو۔

فعلی حدیثوں کے لیے "اتباع" کا لفظ قرآن میں ہے، یعنی رسول کے پیچھے پیچھے چلو اور ان کی پیروی کرو، ان کی حرکت کے مطابق حرکت اور ان کے سکون کے مطابق سکون ہونا چاہیے، فَاتَّبِعُوْہُ وَ اتَّقُوْا [2] یعنی "آنحضرت ﷺ کے نقش قدم پر چلو اور ادھر اُدھر منحرف ہونے میں اللہ سے ڈرو۔"

1- سورۃ النساء:59

2- سورۃ الانعام:155

غرض! رسولِ اکرم ﷺ صرف پیغام رساں اور نامہ بر نہیں ہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے ہم پر حاکم ہیں، ان کا ہر قول حکم ہے اور ان کا ہر فعل "ہدایت" ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ساری زندگی دین کی سند ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے نمونہ ہے، دنیا بدلے، دنیا کا تمدن بدلے، حالات وسیاست بدلیں۔ ماضی، حال، مستقبل ہر زمانے میں بندوں کے لیے یہی پاک نمونہ مینار ہدایت اور ابدی سند رہے گا، ترقی وتمدن کی آڑ لے کر حدیثوں سے منہ پھیرنے والے ذرا دوبارہ پھر غور کر لیں:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ (1)

یعنی "تمہارے لیے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے، اس کے حق میں جو اللہ کی رحمت کا اُمیدوار ہے اور قیامت کا منتظر ہے۔"

گویا اب قیامت تک صحیح اُمید کا ذریعہ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے کسی اور نبی کی بھی امید نہیں۔ رسول ﷺ کی ذات قرآن کا نام تو نہیں ہے، قرآن کے مطابق ہے مگر قرآن سے الگ اور اسی ذات پاک سے متعلق روایتوں کا نام "مجموعۂ حدیث" ہے۔

حدیث کی اصطلاح اور قرآن:

آنحضرت ﷺ کی مرویات کو "حدیث" کہتے ہیں یہ اسلامی اور دینی اصطلاح ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین کا عظیم الشان رکن "قرآن مجید کا تتمہ وبیان" خدا کی وحی کے مطابق قرآن کی نبوی تفسیر کے لیے یہ اصطلاحی نام کس نے تجویز کیا؟ آج کے ملاؤں نے، عجمی تابعین نے، صحابہ نے یا رسول ﷺ نے؟ اگر یہ اصطلاحی نام حدیثوں سے ثابت ہے، تو جب تک حدیثوں کی اہمیت کا اقرار نہ ہو، اس اصطلاح کے قبول پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس کا نام اُسوہ کیوں نہیں رکھا گیا، جو قرآن کا لفظ ہے! اس کو بیان کیوں نہیں کہتے کہ یہ بھی قرآنی اصطلاح ہوتی! آخر مرویاتِ نبوی ﷺ کا نام "حدیث" کس نے

1- سورۃ الاحزاب:21

رکھا اور کیوں رکھا؟ اس لیے ہم اس کا جواب بھی قرآن مجید ہی سے تلاش کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا (1)

یعنی ''جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے راز کی بات کہی۔''

یا ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ (2)

یعنی (اے ایمان والو! نبی کے گھر کے اندر داخل ہوا کرو۔۔۔۔) ''اور ان کی گفتگو سننے کے لیے وہاں اتنی دیر تک نہ بیٹھو کہ نبی کو تکلیف ہونے لگے۔''

خیال فرمایا آپ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال مبارکہ کے لیے اللہ جلّ شانہ نے جو اصطلاح مقرر فرمائی وہ یہی ''حدیث'' کا لفظ ہے اور عہدِ رسالت سے لے کر آج تک تمام مؤمنین اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی اصطلاح پر ایمان و عمل کی بنیاد قائم کیے ہوئے ہیں۔ اب کون ہے، جو اس حدیث کی اصطلاح کا منکر ہو:

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا (3)

یعنی ''کیا ہو گیا ہے اس قوم کو کہ حدیث کو نہیں سمجھتے۔''

اچھا: فَذَرْنِیْ وَ مَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (4)

یعنی ''آپ مجھ کو چھوڑ دیجیے اور جو شخص اس حدیث کو جھٹلاتا ہے، اس کو بھی عنقریب ہم پستی میں لے جائیں گے کہ اس کو خبر نہ ہو گی۔''

1- سورۃ التحریم:3

2- سورۃ الاحزاب:53

3- سورۃ النساء:78

4- سورۃ القلم:44

خیالِ دل:

ابتدا میں یہ خیال بھی نہ تھا کہ زیبِ عنوان موضوع پھیل کر اتنا وسیع ہو جائے گا۔ دوسری مصروفیات کی وجہ سے، وقت کی کمی کے علاوہ، کتابیں بھی میسر نہیں، جو کسی تحقیقی تحریر کے لیے اشد ضروری ہیں، ان نامساعد حالات میں مسلسل مضامین کا تصور مشکل بات تھی، مگر اللہ کا شکر ہے، جس کی توفیق واعانت سے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لایا جا سکا، اگر ماحول سازگار ہوتا، تو ان مسائل کو ہم زیادہ تفصیل سے بیان کرتے، مگر مسموم (زہریلی) وو بائی فضا کو فوراً علاج کی حاجت تھی، اس لیے تفصیلات سے قطع نظر کر کے محض اشاروں پر اکتفا کرنا پڑا۔

گذشتہ صفحات میں چند عنوانات اور ان کے ذیلی شعبوں سے بحث کی گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ایک غیر متعصب و ناطرف دار (غیر جانب دار) آسانی سے منزلِ حق تک پہنچ سکتا ہے۔ ہاں! جن کی آنکھوں پر عناد کی پٹی چڑھی ہوئی ہو اور رسول ﷺ کی معرفت سے محروم ہو کر عقل کی ساری صلاحیتیں کھو بیٹھے ہوں، ان کے لیے یہ حقائق کارآمد نہیں ہو سکتے، وہ تو روزِ روشن میں بھی دیکھنے سے عاری ہیں اور قرآن مجید کو حمائل کرنے کے بعد بھی اس کے اسرار و غوامض، تنویر و تجلی سے نابلد ہی رہیں گے۔

❖❖❖❖❖

باب دوازدہم:
”خلاصۂ مضمون“
(بطورِ تتمہ مباحث کی فہرست۔کتاب وسنت کا باہم ربط۔فہمِ قرآنی کے چند اہم اصول۔فہمِ قرآنی کے لیے حدیث کے انوار اور اُن کی اہمیت)

یہ ایک حقیقت ہے کہ،قرآن مجید حدیثوں کی مدد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا اور حدیثوں کے نقد وانتخاب اور صحیح حدیثوں سے انتفاع واستفادہ کے لیے جن علوم کی ضرورت ہے، وہ لوگوں کو حاصل نہیں۔اس کوتاہی کے مجرم علماء نہیں ہیں، وہ آج بھی اپنی زندگیاں اللہ ورسول کی راہ میں گزارنے کے لیے آمادہ ہیں۔دین کی خدمت جو اگلوں نے کی تھی، اخلاف کے دل بھی ان کی امنگوں سے خالی نہیں۔مگر عوام اور حکومت کی نگاہ میں ادھر کئی قرنوں سے علومِ دینیہ کی اہمیت کم ہو گئی ہے، اغیار کے تسلط اور مادیت کی چکا چوندھ نے ان کی فکر وعمل کا انداز یکسر بدل ڈالا۔

جب تک ہم دوبارہ واپنی گم شدہ راہ کا کھوج نہیں لگائیں گے۔صراطِ مستقیم کی اُمید غلط ہے۔ہم میں بیسیوں منکرِ حدیث، سینکڑوں منکرِ قرآن اور ہزاروں منکرِ خدا پیدا ہوتے رہیں گے۔امامت عالم کی مستحق قوم، کمیونزم اور جمہوریتِ ناقصہ کے لیڈروں کی پیروی کرتے رہے گی۔

قرآن ایک زندہ کتاب ہے اور حدیثیں اس کی تابندہ تفسیر، خدا کے آخری رسول کی آخری تعلیم نہ مٹ سکتی ہے اور نہ بدل سکتی ہے، ہم میں اگر تبدیلی پیدا ہوئی ہے، تو اس سے ہم خسارے میں ہیں اللہ اور اس کے رسول کا نقصان نہیں ہے، قرآن مجید کی اصلیت محتاجِ دلیل نہیں اور حدیثوں کی صداقت چودھویں کے چاند سے زیادہ تابناک ہے، ہاں! جو لوگ

کال کوٹھریوں میں کِواڑ (پٹ) بند کر کے بیٹھے ہوں، انھیں کیا خبر کہ ماہِ کامل نے کھلی فضا میں کیا نور برسائے! بدرِتمام کی تابانی بحث و دلیل سے نہیں ثابت کی جاتی، یہ تو آنکھ والوں کا کام ہے کہ تنگ و تاریک مکان سے نکل کر جلوۂ جہاں تاب کا نظارہ کریں۔

گزشتہ صفحوں میں جن اصول کو سامنے لایا گیا اور ان کی ذیلی شاخوں کی نشان دہی کی گئی، وہ حاشا وکلا حجیتِ حدیث کی دلیلیں نہیں ہیں، رسولِ اکرم ﷺ کی ذات وصفات کی طرح ان کی حدیثیں بھی ہماری زبان وقلم کی تائید سے مستغنی ہیں، بلکہ اس سلسلۂ مضامین کی اصل غرض ان پہلوؤں کو پیش کرنا تھا، جو ہمارے لیے قبولِ حدیث کی راہ میں شمعِ ہدایت ہیں اور ان غلط و جاہلانہ پروپیگنڈے کی تردید تھی، جن سے ناواقف عوام دھوکے کھا رہے ہیں۔

اگر ان گزشتہ صفحات کے مذکورہ مسائل پیشِ نظر ہوں اور جمع و تدوین، کتابت واشاعتِ حدیث کا تاریخی پسِ منظر ذہن نشین رہے، تو کسی ابوجہل کی مجال نہیں ہے کہ اصحابِ بدر کے متبعین پر غلبہ حاصل کر سکے۔

حدیثوں کی تاریخی، لفظی، معنوی اور اسنادی حیثیتیں اتنی مکمل اور عینی ہیں کہ اسلام کا دعویدار ان پر ایمان لانے کا پابند ہے اور جو لوگ قرآن مجید کو ترجمے سے پڑھ کر اس کی من مانی شرح بیان کرتے ہیں، ان کی تجہیل کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ مختلف زبانوں کی نفسیات اور متکلم و مترجم کی نفسیات سے ناواقف ہیں۔

موضوع زیبِ عنوان کے تحت جو مختلف مسائل بیان کیے گئے اور ان سے حدیثوں کی اہمیت واضح کی گئی ہے، اپنی جگہ پر بہت کافی اور اطمینان بخش ہیں اور وہ مباحث حسبِ ذیل ہیں:

مبحثِ اول: زبان کی نفسیات، عربی زبان کی چند خصوصیتیں اور کثرتِ روایت کے اسباب۔

مبحثِ دوم: متکلم و مترجم اور اصل کلام و ترجمہ کا نفسیاتی فرق۔

مبحثِ سوم: جمع قرآن وجمع حدیث کے طریقے میں فرق اوراس کے وجوہ۔

مبحثِ چہارم: حدیثوں کی کتابت واشاعت، عہدِ رسالت میں۔

مبحثِ پنجم: حج بیت اللہ اور روایتِ حدیث۔

مبحثِ ششم: صحابہ کا دور، روایتوں میں تسلسل اور حدیثوں کی اشاعت و کتابت۔

مبحثِ ہفتم: تدوینِ حدیث میں حکومتِ اسلامی کا تعاون۔

مبحثِ ہشتم: صحاح ستہ سے پہلے کی کتبِ روایت۔

مبحثِ نہم: نقد وانتخابِ روایت کے اصول اور اسنادِ حدیث کی تحقیق کے قواعد۔

مبحثِ دہم: متنِ حدیث سے استفادہ کا طریقہ۔

مبحثِ یازدہم: مقامِ رسالت اور حدیث کی اصطلاح۔

کتاب وسنت کا باہم ربط:

مذکورہ بالا مباحث تو حدیث وروایتِ حدیث سے متعلق ہیں، جن کی مدد سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح حدیثیں ہم تک پہنچی ہیں اور جس طرح ماضی کی کوئی بات نقل ہو کر مستقبل میں قابلِ یقین انداز میں پہنچ سکتی ہے، حدیثیں ان سے زیادہ باوثوق طور پر اور محفوظ طریقے پر منتقل ہوتی رہیں، بلکہ قرآن مجید کے ساتھ روایتوں کی وابستگی و پیوستگی نے احادیثِ رسول ﷺ کو قابلِ عمل وحجتِ دین بنائے رکھا۔ رہا یہ سوال کہ محفوظ قرآن ہوتے ہوئے صحیح اور محفوظ حدیثوں کی کوئی ضرورت بھی ہے؟ تو اس سلسلے میں چند اصولی باتیں عرض کی جاتی ہیں، جن کا تعلق دراصل فہمِ قرآن سے ہے اور اس وقت ہمارے اس مقالے کا موضوع نہیں، بلکہ یہ مسائل بطورِ خود مستقل عنوان ہیں جو ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ کبھی اصولِ فہمِ قرآن کے ضمن میں تفصیل سے بیان کیے جائیں گے۔ بہرکیف مثال کے طور پر انہی اصولِ فہمِ قرآن سے متعلق دو ایک ضروری امور پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ قرآن وحدیث کا باہمی ربط آسانی سے سمجھ میں آجائے اور عامی (عام بندہ) وعالم کوئی بھی حدیثوں کی اہمیت اور ان کو دینی حجت تسلیم کرنے میں پس وپیش نہ کر سکے۔

فہمِ قرآن کے چند اصول:

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید اپنی تفصیلی ہدایتوں میں بھی صرف اصولی و بنیادی قوانین عطا کرتا ہے، جن کی حیثیت دستوری اصطلاح میں ''ہدایتی اصول'' کی ہے۔ وہ کسی حکم کے تمام شاخ در شاخ شعبوں کو بیان کر کے موافق ومخالف حکم نہیں دیتا ہے، کتاب اللہ کا دعویٰ کہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَفَصَّلْنٰهُ تَفْصِيلًا یہ ساری کی ساری باتیں ''اصول ومبانی'' سے متعلق ہیں اور بلاشبہ اصولی ہدایات کے لحاظ سے قرآن مجید واضح ترین اور بہت تفصیلی کتاب ہے۔ لیکن جہاں تک اصولی احکام کی تعمیل کا تعلق ہے، ہمارے لیے حدیثوں کی رہنمائی سے مفر نہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کی مقدس زندگی قرآن مجید کی ان معنوی تفصیلات کی جامع ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ پہلے قرآن مجید کے اندازِ بیان اور طرزِ ہدایت سے واقف ہوں اور اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کو پیش نظر رکھیں:

اول: کلام اللہ کا ایک طرزِ رہنمائی یہ ہے کہ وہ احکام جو نفاذ و تعمیل کے لحاظ سے رواجی نوعیت کے ہیں، ان کی تفصیل نہیں بتاتا، بلکہ رسولِ اکرم ﷺ کی ترویج و تعامل پر چھوڑ دیتا ہے، مثلاً: نماز کا بار بار حکم قرآن مجید میں مذکور ہے، اس کی تعمیل کے فائدے اور ترک کے نقصانات بتا دیے گئے، یہاں تک کہ نمازوں میں کسل مندی (سُستی) سے بھی روکا گیا، مگر نماز کی تفصیل قرآن مجید میں واضح نہیں ہے، غور فرمائیے کہ اتنا اہم مسئلہ جس کی تکرار واعادہ سے قرآن بھرا پڑا ہے اور نفع ونقصان کے تمام پہلوؤں کی وضاحت ہے، لیکن خود نماز کے طریقۂ ادا اور طرزِ تعمیل کے بارے میں قرآن خاموش ہے، وجہ یہ ہے کہ نماز اپنی ساری اہمیتوں کے باوجود تعمیل ونفاذ کے اعتبار سے رواجی مسئلہ تھا اور حضور ﷺ کی تعلیم اور صحابہ کے تعامل سے ہیأتِ نماز کی ساری تفصیلات مہیا کر دی تھیں۔ اگر یہ تفصیلات قرآن میں موجود ہوتیں، تو بلاضرورت صرف ضخامت (زیادہ اوراق) کتاب کا سبب بنتیں۔

لہٰذا نماز کی فرضیت، تعمیل کے فوائد اور ترک کے نقصانات تو قرآن مجید سے معلوم کرنا چاہئیں، مگر نماز کی ترکیب وہیئات کے لیے حدیثوں کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔

دوم: قرآن مجید کا اندازِ رہنمائی کبھی یہ ہوتا ہے کہ پہلے جو باتیں عربوں میں رائج تھیں ان میں ناجائز پہلوؤں کو رد کر کے اچھی باتیں برقرار رکھتا ہے اور اگر کوئی نئی بات کا اضافہ مقصود ہو، تو ان ایک دو امور کو بیان کر دیتا ہے، مثلاً: عرب جاہلیہ کے نکاح کے طریقوں میں سے مسئلۂ ولایت اور تراضیٔ طرفین کو برقرار رکھا اور دَینِ مہر کے وجوب کا اضافہ کر دیا، اگر یہ تفصیلات عرب جاہلی کے رواج میں ہم تلاش کریں، تو یقیناً یہ دینی حجت نہیں ہوں گے، لہٰذا ان کو فرامین نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈھونڈھنا چاہیے۔

سوم: حج بھی ایک اسلامی فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا، مگر اس فرض کی ادائیگی چونکہ جماعتی اور رواجی انداز میں ہوتی ہے، اس لیے حج کی تفصیلات کا بیان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چھوڑ دیا، جاہلی عرب کی ناپسندیدہ رسوم کی تردید کر دی۔ احرام سے متعلق چند ممانعتوں کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے، مگر میقات، احرام، طریقۂ احرام اور مناسکِ حج کی تفصیل کے لیے نبوی تعلیم وتعامل یعنی حدیثوں کی امداد کے بغیر کوئی سبیل نہیں۔

چہارم: اسی طرح زکوٰۃ کا مسئلہ ہے جو تکرارِ حکم اور بار بار کی یاد دہانی کے لحاظ سے نماز کے ہم پلہ ہے، مگر زکوٰۃ کی پوری تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں، چونکہ یہ حکم بھی رواجی اہمیت کا تھا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کی تعمیل پر قادر تھی، اس لیے مزید تفصیل کے لیے نبوی تعامل وتعلیم کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔

پنجم: بعض اعمال ایسے ہیں، جن کی صحیح تعریف ہی میں تفصیلات شامل تھیں۔ قرآن ان کی تعریف کر دیتا ہے اور لوگوں کے دلوں سے وسوسہ وخطرات کو دور کرنے کے لیے منفی پہلو کی وضاحت کر دیتا ہے، مثلاً: روزہ، اس حکم کے لیے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ تھی، صرف اس عبادت کی تعریف کر دی گئی اور حدود وقیود بیان کر دیے گئے، روزے کی تفصیلات مہیا ہو گئیں اور اس کٹھن عبادت کی وجہ بیان کر کے روزے کی اہمیت ذہن نشین کر دی گئی۔

ششم: کبھی قرآن مجید بعض احکام میں قدیم شرائع کو برقرار رکھتا ہے اور جو کمی ان کے

اندر تھی، اس کی اصلاح کر دیتا ہے، مثلاً: حرام وحلال جانوروں کی شناخت، (یہ مسئلہ ذرا تفصیل طلب ہے، اس لیے تھوڑی سی وضاحت موقع کے مناسب ہوگی)

یہ ذہن نشین رہے کہ جن مسائل میں قرآن مجید کچھ تفصیلی جزئیات بیان کرتا ہے، ان کی حیثیت چوراہے کے نشان کی ہے، منزلِ مقصود اور اس نشان کے درمیان جو راستے کے اتار چڑھاؤ ہوتے ہیں ان کی واقفیت حدیثوں سے ہوسکتی ہے، گو یا وہ جزئیات بھی نقطے ہیں، جن کو کسی ماہرِ نقاش کی رہنمائی میں صحیح خطوط کے ذریعے ملا کر مکمل کیا جاسکتا ہے، ورنہ ایک نوآموز (جس نے سیکھنا شروع کیا ہو) یا ناآموز اپنی نادانی سے الٹی سیدھی لکیریں، ڈال کر حقیقت کو کچھ سے کچھ بنا دے گا۔ اسی حلال وحرام جانور کے مسئلے کو لے لیجئے، قرآن مجید نے کافی تفصیلات بیان کی ہیں، مگر ان کو صحیح طرح جاننے کے لیے بہر حال حدیثوں کی ضرورت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (1)

یعنی ''اے رسول! کہہ دیجئے کہ جو میرے پاس حرام کھانوں کے متعلق وحی آئی ہے، ان میں صرف مردار یا بہتا خون یا سور کا گوشت یا غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام ہیں''۔

اس آیت سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس یہی چار چیزیں حرام ہیں، لیکن جب ہم قرآن مجید پر غور کرتے ہیں، تو ان ممنوعات کی مزید تفصیل ملتی ہے اور یہاں جو ''میتۃ'' یعنی مردار کے لفظ سے صرف ایک قسم کا جانور حرام تھا اور ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ مُردار وہ جانور ہے جو طبعی موت مرے، دوسری جگہ پانچ قسم کے اور جانوروں کو مردار کے حکم میں داخل کر دیا گیا، ارشاد ہے:

1- سورۃ الانعام:145

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ (1)

یعنی پہلی مذکورہ چار چیزوں کے علاوہ یہ جانور بھی مُردار ہی کے حکم میں ہیں:

1۔ وہ جانور جن کا دم گھٹ کر نکلا ہو۔

2۔ ضربِ شدید، مثلاً: ڈنڈے کی مار سے مرنے والے جانور۔

3۔ نیچے گر کر مرنے والے جانور۔

4۔ سینگ کی مار سے مرنے والے جانور۔

5۔ درندے نے جن کو پھاڑ ڈالا ہو، غرض یہ پانچ چیزیں بھی ''میتۃ'' یعنی مردار میں شمار ہوں گی۔

پہلی آیت کی رو سے حرام جانوروں میں مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهٖ تھا، یعنی جو جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہو لیکن دوسری آیت میں تفصیل بیان کرتے ہوئے قرآن نے بتایا کہ وہ جانور جو بتوں کے استھانوں (بتوں کی تعظیم کی جگہ) پر ذبح ہوں وہ بھی مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهٖ میں داخل ہیں، غرض! یہ فہرست حرام کھانوں کی تھی۔ کیا ان کے علاوہ تمام جانور حلال ہیں؟ تو قرآن مجید ہدایت کرتا ہے کہ:

لَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ (2)

یعنی ''جس جانور کے ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے اسے نہ کھاؤ۔''

پہلی آیت میں غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام تھا اور دوسری آیت میں ان ذبائح کو بھی حرام کر دیا گیا، جن کے ذبح کے وقت اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ حرام جانوروں کی تفصیل کے علاوہ حلال جانوروں کے متعلق بھی قرآن مجید نے اجمالی ہدایت دے دی اور فرمایا:

1- سورۃ المائدہ:3

2- سورۃ الانعام:121

طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ [1]

یعنی ''اہلِ کتاب کے حلال کھانے تمہارے لیے بھی حلال ہیں۔''

اہلِ کتاب کے نزدیک کیا چیزیں حلال تھیں، ہمیں نہیں معلوم پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اہلِ کتاب کے لیے مذکورہ حرام جانوروں کے سوا تمام چوپائے اور پرندے حلال تھے یا موسوی وعیسوی شریعت میں ان کی کوئی فہرست بھی درج ہے اور اس مسئلہ میں مقررہ اصول وقواعد بھی ہیں؟ مسلمانوں کے لیے اہلِ کتاب کے اس خاص مسئلے کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے حق میں انھیں جانوروں کو حلال ٹھہرایا، جو اہلِ کتاب کے لیے حلال تھے۔

اس بارے میں قرآن مجید کی دوسری آیت اشارہ کرتی ہے کہ تمام چرند پرند اہلِ کتاب کے لیے حلال نہیں تھے، بلکہ ان کی ایک معین فہرست ہے، ہمیں بھی اس خاص فہرست کے مطابق عمل کرنا چاہیے، ارشاد ہے:

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ [2]

یعنی ''مخصوص قسم کے تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے بجز ان چیزوں کے جو اسرائیل یعنی: یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نزولِ توریت سے پیشتر بطورِ خود اپنے پر حرام کر رکھا تھا''۔

یہاں دو باتیں یاد رکھیے کہ قرآن مجید میں طعام کا لفظ آیا ہے، لیکن مراد حلال وحرام جانور ہیں، کیونکہ حلال وحرام کا فرق جاندار غذاؤں میں ہے، پھلوں اور غلوں میں حلال وحرام کا تعلق براہِ راست نہیں ہے۔ دوسری اہم بات اس آیت میں یہ ہے کہ طعام پر ''الف لام'' داخل ہے، عربی اصول کے مطابق کھانوں کی ایک خاص قسم اور خاص فہرست مراد ہوگی۔

1- سورۃ المائدہ:5

2- سورہ آل عمران:93

قرآن مجید کے اس عام حکم کے بعد سارے مسلمان، اہلِ کتاب کے کہنے کے مطابق ان سے حلال جانوروں کی فہرست لے کر اور اسی کی رہنمائی میں حلال وحرام میں تمیز کر لیتے۔ مگر اس فہرست میں بعض چیزیں ایسی داخل تھیں، جو اللہ کی طرف سے حرام نہ تھیں، مثلاً: اونٹ کا گوشت اور بعض چیزیں تادیبی لحاظ سے بنی اسرائیل کے حق میں حرام تھیں، اگرچہ اپنی فطرت کے اعتبار سے خبائث میں داخل نہیں ہیں اور مسلمانوں کے حق میں ان کو حلال رہنا چاہیے، تیسری قسم کی وہ چیزیں تھیں، جو اپنی فطرت کے لحاظ سے خبائث میں شمار ہوتی تھیں اور شریعت ماقبل میں حلال نہیں تھیں، لیکن نصاریٰ نے اپنی خود رائے سے حلال بنالیا تھا۔ اس لیے اہلِ کتاب کے حلال جانوروں کی فہرست کی طرف ہمیں متوجہ کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سہ گانہ جزئیات کی تفصیل بیان کی اور تمام ناپاکیوں اور خرابیوں کی اصلاح کر دی۔ چنانچہ حلال جانوروں کی فہرست سے یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے لیے بطور نذر اُونٹ کو علیحدہ کر دیا تھا۔ حلال جانوروں کی چربی شریعت موسوی میں تادیباً حرام تھی، اللہ تعالیٰ نے تصریح کر کے حلال فرما دیا، ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ[1]

یعنی ’’گائے بکری کی چربی ان یہودیوں پر ہم نے حرام کر رکھی تھی‘‘۔

اب یہ حکم اپنی اصلی حالت پر آ گیا ہے اور وقتی حرمت دور کر دی گئی۔ نصاریٰ نے اپنی طرف سے حلال جانوروں کی فہرست میں خنزیر کو داخل کر دیا، مگر چونکہ قرآنی فہرست میں یہ خبائث میں داخل ہے، اس لیے حرام رہے گا۔

ان مستثنیات اور جزئی اصلاحات کے ساتھ اس پوری فہرست کو اپنے لیے اختیار کر لو، جو اہلِ کتاب کو حلال جانوروں کے سلسلہ میں دی گئی تھی۔ اب ہمارے لیے دو ہی صورتیں ہیں یا تو توریت کو اُٹھائیں اور حلال وحرام جانوروں کے سلسلے میں جو ضابطے اور فہرست

1- سورۃ الانعام:146

وہاں درج ہیں، قبول کرلیں۔لیکن توریت محرّف ہے: يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ [1]
اہلِ ایقان مسلمانوں کو محرّف وغیر معتمد توریت سے کیونکر طمانیت حاصل ہوسکتی ہے۔
دوسری صورت یہ ہے کہ ہم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرکے''الطعام'' کی قابلِ وثوق فہرست طلب کریں اور حدیثوں میں جو حلال وحرام جانوروں کا فرق بتایا گیا ہے، بہ دل وجان تسلیم کریں۔توریت محرّف ہوچکی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''الطعام'' کی فہرست بغیر کسی قدیم سند کے پیش فرما رہے تھے، اس لیے اللہ جلّ شانہ نے صراحت کردی:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ [2]

یعنی ''حضور مؤمنین کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال فرماتے ہیں اور خبیث اور گندی چیزیں حرام فرماتے ہیں۔''

یہ آیت صرف اس لیے نازل ہوئی تاکہ کوئی منکرِ حدیث کبھی بھی حلال وحرام سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دی ہوئی طویل فہرست قبول کرنے میں چون وچرا، نہ کرے۔اگر یہ آیت نہ بھی نازل ہوتی، پھر بھی محرف توریت کے مقابلے میں صحیح حدیثوں کی تفصیل تو بہر حال زیادہ معتبر ہے۔

حلال وحرام جانوروں کی تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ قرآن مجید نے اگرچہ اس خاص مسئلے کی چند جزئیات بیان کی ہیں، مگر ان کی حیثیت بھی صرف ضمنی اصلاحات اور اصولوں ولفظوں کی ہے، ورنہ ہمیں اس بارے میں یا تو اہلِ کتاب کی فہرست''الطعام'' کو سامنے رکھنا چاہیے یا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثوں پر عمل کرنا چاہیے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گذشتہ شریعت کا کوئی کلیہ جو اسلام میں بھی معتبر اور واجب التعمیل ہے، مگر احبارِ یہود نے تحریف کرکے اس کلیے کو بدل دیا ہے۔قرآن مجید اس کلیہ کا اعادہ کردیتا ہے تاکہ امتِ مسلمہ کو صحیح ہدایت حاصل رہے، مثلاً: اسی طعام اہلِ کتاب کو لیجیے،

1- سورۃ النساء:46

2- سورۃ الاعراف:157

تمام چرندو پرند جانوروں میں پنجے والے پرند، درندے اور حیوان شریعتِ موسوی میں حرام تھے، لیکن موجودہ توریت میں یہ کلیہ پرندوں کے حق میں تو موجود ہے، مگر چوپایوں کے حق میں صورت بدلی ہوئی ہے، جس کے نتیجے میں اونٹ حرام جانوروں میں داخل ہوجاتا ہے کہ اللہ جلّ شانہ نے اس غلطی کی اصلاح کردی ارشاد ہوتا ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ (1)

یعنی ''ہم نے یہود پر چنگل والے جانوروں کو حرام کردیا تھا''۔

لہٰذا ''الطعام'' کی فہرست سے پنجوں والے جانور چرندو پرند نکل گئے اور یہی حضور ﷺ کی حدیثوں میں بھی موجود ہے۔

کبھی قرآن مجید کسی مسئلے کے صرف زیریں پہلو کو بیان کرکے ایجابی یا سلبی حکم دیتا ہے اور اس مسئلے کے بالائی مراتب، منطقی طور پر اس حکم میں داخل ہوجاتے ہیں۔

احادیثِ نبوی ﷺ اس حکم کے مختلف مدارج کی تفصیل بیان کرتی ہیں، مثلاً: والدین کے احترام کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

لَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا۔ (2)

یعنی ''ماں باپ کو نہ جھڑکو اور نہ ان کے سلوک پر اُف کہو۔''

احترامِ والدین کا یہ سب سے ادنیٰ پہلو تھا، ان کے ساتھ بدسلوکی، سختی، مار پیٹ، ان سے خدمت لینا وغیرہ یہ تمام باتیں از خود ''اُف اُف'' اور ''نہر'' کے اندر داخل ہوگئیں، احادیثِ نبوی ﷺ ان نازک مسائل میں ہماری تفصیلی رہنمائی کرتی ہیں۔

غرض! قرآن مجید اصولی ہدایات دیتا ہے اور اس کی تفصیلات بھی محض ضمنی اور استثنائی حیثیت رکھتی ہیں ورنہ کسی حکمِ قرآنی کے تمام پہلوؤں کو جاننے کے لیے حدیثوں کے بغیر چارہ، بلکہ اگر حدیثوں سے مدد نہ لی جائے، تو اعتقادی امور کے سوا تمام عملی احکام معطل ہو

1- سورۃ الانعام:146

2- سورۃ الاسراء:23

جائیں گے اور قرآن مجید کی کسی ہدایت پر عمل نہیں ہو سکے گا۔ اس طرح جو مذہب اپنے دعوے اور حقیقت کے لحاظ سے انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور دین و دنیا اس ہدایت کے حدود کے اندر ہیں، نا قابلِ عمل ہو کر محض بحث و مباحثہ کا مذہب رہ جائے گا۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے حدیثوں سے ہم مستغنی نہیں ہو سکتے۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وعَلَى آلِهِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

ختم شد

❖❖❖❖❖